تیس روزہ
مارچ 2012ء
راجہ پرویز اشرف
نوید قمر
ارے،، لمبی لمبی چھوڑنے میں تو یہ ہمیں بھی مات دے گئے
خورشید حسن شاہ
عوام
لولی پوپ
2014ء میں پاکستان روشنیوں کا ملک بن جائے گا۔ بجلی پانچ روپے یونٹ ملے گی۔
قیمت: 50 روپے

بانی وحشی مارہروی

مہینہ بھر کے قہقہوں اور مسکراہٹوں کا راشن

تیس روزہ چاند

رجسٹرڈ نمبر CPL-192

مارچ 2012ء

مغز مار خصوصی

ناکتخدائے اعظم، صدر الہام کنوارا کلب، انجمن ریش درازانِ پاکستان، دشمن عقل و عریانی، تاریک العورات، رقیب زن مریدگان و مجروح فیشن زدہ دوشیزگان

ابوالمزاح ہستی خوامخواہ

پیر جنگلی علیہ ماعلیہ (افریقہ پلٹ)

مدیر اعلیٰ خالد بن حامد

مدیران صباحت زیاد خالد

برائے رابطہ: 0312/0333-4284875

کاغذی گھوڑے دوڑانے کا پتہ

قیمت: 50 روپے

"چاند" شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور

یہ وہاں ہے

کارٹون	ادارہ	5
ہنس بیتیاں	مستقل عنوان	10
...ار ٹیکس	فاروق قیصر	12
ساتویں ملکہ	نعیم نیازی	13
سرکاری رشتے	سمیع اللہ نیازی	14
...و انتخاب	محمد سعید خان	16
کچھ ادھر کی، کچھ ادھر کی	شاہد اطہر	19
عشق کمینہ	منظور احمد اعوان	29
بٹ صاحب، فلم اور ہم	سید ابرار بخاری	41
ازدواجی ناقصابی	خادم حسین مجاہد	53
ہو کے بدنام	عرفان اللہ قریشی	61
ہمارے شیخ چلی	سلمہ یاسمین نجمی	69
روحانی ڈیڈی	امجد یوسف	77
اصلاح دفاتر	ڈاکٹر مشتاق احمد سحر	83
بلاعنوان	کے۔ ایم مجاہد	89
ٹکریں	ٹکریات	97

چاند نگر

پائے	ناہید صدیقی	99
کنواروں کی دنیا	محمد سعید خان	99
پاکستانی ڈریسنگ روم	محمد کامران شہزاد	101
قرض، مرض اور پٹائی	سیدہ عابدہ ادریس	102
نیکی کی، جوتے کھا	ہارون حسرت جالندھری	103
سجاد باجی	وقار چاند	107
زنانہ اقسام	محمد محبوب ملک	109
اخلاقی صاحب	محمد عباس	109
کاش، میں دلہن ہوتا	سید بدر سعید	111
ہوم، سویٹ ہوم	حکیم عنائت اللہ	102
☆ ☆		
سندیسے	رقعہ باز	113

"چاند" کی حاتم کی گور پر "لات مار" پیشکش

600000000

ساٹھ کروڑ کے نقد انعامات

کوئی دھوکہ نہیں ---- حل نہ ہمارے پاس ہے، نہ بینک میں اور نہ کسی کمیٹی کے دماغ میں

پہلا انعام: **تیس کروڑ** اُس شخص کو دیا جائے گا جو پورے رسالہ "چاند" کو ایک سانس میں پڑھ دے

دوسرا انعام: **بیس کروڑ** اُس شخص کو دیا جائے گا جو کوئی ایسی بولی بولے گا جسے اِنسان نہ بول سکے

تیسرا انعام: **دس کروڑ** اُس شخص کو دیا جائے گا جو مر جائے اور بولتا رہے

آج کل کروڑوں کی بات کر کے ہی کسی کو متوجہ کیا جا سکتا ہے --- اب آپ بھی کروڑوں کے چکر میں متوجہ ہو ہی گئے ہیں تو جان لیجئے کہ یہ حاتم کی گور پر لات تو ہم نے اس لئے ماری ہے کہ آپ کو چاند کا سالانہ خریدار بننے کی تاکید کی جا سکے۔ "چاند" پاکستان کا واحد تیس روزہ ہے جو گزشتہ 64 برس سے لوگوں کو ہنسنے اور مسکرانے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔ اگر آپ بھی ہنسنا مسکرانا چاہتے ہیں تو پھر چاند کی خریداری حاصل کر لیجئے سالانہ خریداری حاصل کرنے کی صورت میں پرچا آپ کو بذریعہ رجسٹری گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔ ہم یہاں پاکستان اور دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ درج کر رہے ہیں، اس میں رجسٹری اور ہوائی ڈاک خرچ بھی شامل ہے۔

پاکستان	600 روپے
مسقط، عمان، ابوظہبی، افغانستان، بنگلہ دیش، یمن، بحرین، دوبئی، بھارت، ایران، عراق، کویت، لبنان، نیپال، قطر، دوحہ، سعودی عرب، سری لنکا، ترکی، اُردن، الجیریا، آسٹریا، بلجیم، چین، ڈنمارک، مصر، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، انگلینڈ، یونان، ہانگ کانگ، ہنگری، انڈونیشیا، آئرلینڈ، اٹلی، جاپان، کینیا، کوریا، ملائیشیا، ناروے، فلپائن، رومانیہ، روس، سنگاپور، سپین، سوڈان، سویڈن، تائیوان، سوئٹزرلینڈ، تھائی لینڈ اور یوگنڈا	3000 روپے
آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، امریکہ، ارجنٹائن اور برازیل	3500 روپے

- ڈرافٹ۔ KHALID BIN HAMID کے نام کسی ایسے بینک سے بنوائیں جس کی شاخ لاہور، پاکستان میں ہو۔
- آپ چاہیں تو پاکستان میں موجود اپنے کسی عزیز یا دوست کے ذریعے بھی زرِ سالانہ جمع کرا سکتے ہیں۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع ہر ماہ کی 15 تاریخ سے قبل ملنی چاہیے، اپنے خط پر خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

ڈرافٹ یا منی آرڈر اس پتہ پر ارسال فرمائیے

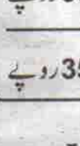

ماہنامہ تیس روزہ "چاند" 31-F شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور (پاکستان)

پبلشر: خالد بن حامد   پرنٹر: ملک عبید محمد پرنٹرز موہنی روڈ لاہور   مقامِ اشاعت: شمع پلازہ فیروز پور روڈ لاہور

بھولا حیران ہے، یہ ایم کیو ایم کی پتنگ کے پاس اتنی لمبی ڈور کہاں سے آئی جو لندن سے اُڑائی جاتی ہے 😊 شاہد اطہر

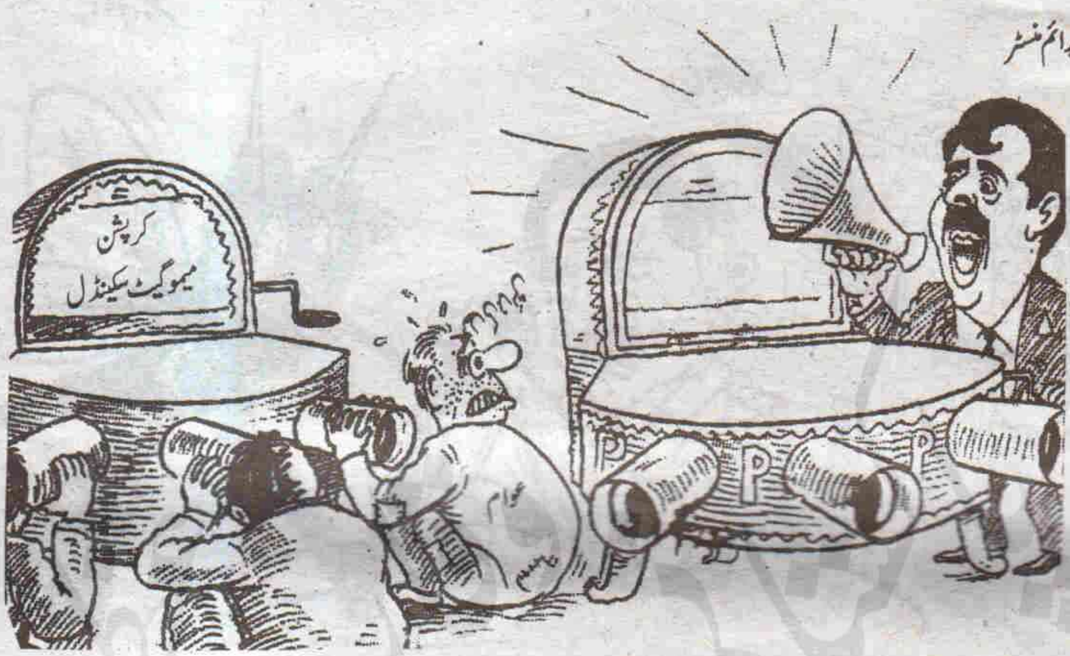

''ادھر آؤ، بھائی! ادھر آؤ---یہ دیکھو بیسویں آگئی، اکیسویں بھی آنے والی ہے---ترمیم!''

''بھلا حکومت وقت کیا غلط کہتی ہے---عوام کو دن میں کئی مرتبہ وہ خوشی سے ناچنے پر مجبور کر دیتی ہے، نا---!''

خاوند پر اپنی ماں کو مسلط کرنے والی، ساس کو اس کے بیٹے کے گھر میں رہنے نہیں دیتی ☺ مسز ڈ بکلاں

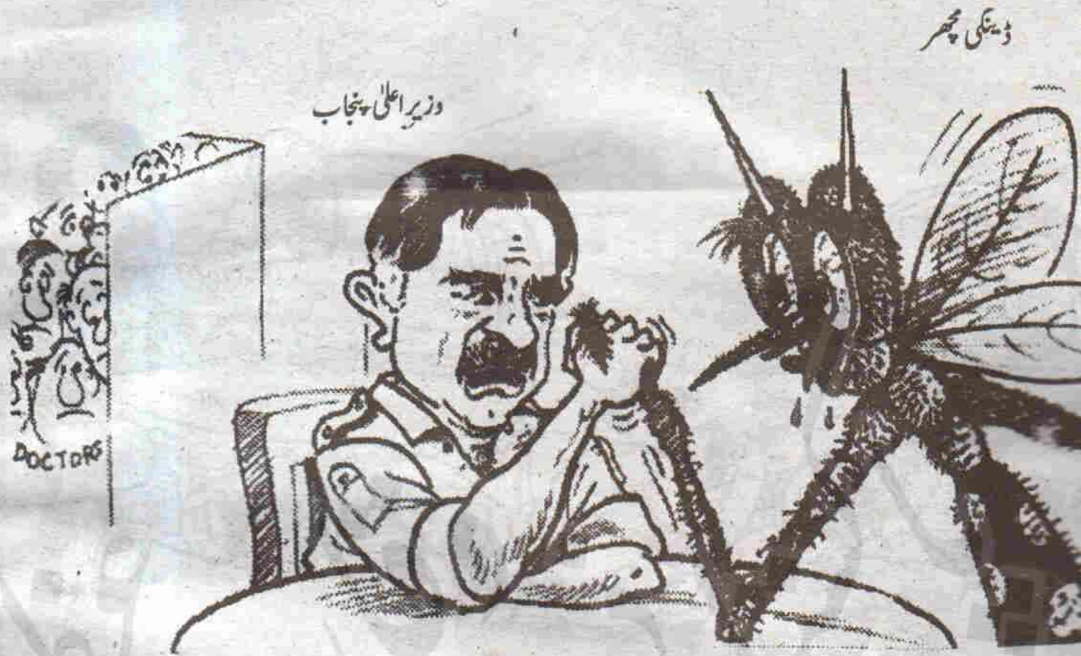

''لو جی، سردیاں ختم ہو گئیں، ایک بار پھر ڈینگی زوروں پر ہو گا---وزیر اعلیٰ شاید اسی مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں---''

مجسمہ ساز نے بڑی زبردست ترجمانی کی ہے آج کے انسان کی---دل تو اب کسی کے پاس رہا ہی نہیں۔ ہے، نا؟''

''لفٹ میں سوار ہونے سے پہلے میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ اگر لائٹ چلی گئی یا لفٹ کہیں درمیان میں پھنس گئی تو آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ میں آپ کی چھیڑ چھاڑ کا برا مناؤں گی---''

ہر سیاست دان قوم کو "خوشحال" بنانے ہی کی بات کرتا ہے اور غریب عوام کو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ قوم سے مراد اُس کا خاندان ہے ☺ شاہد اطہر

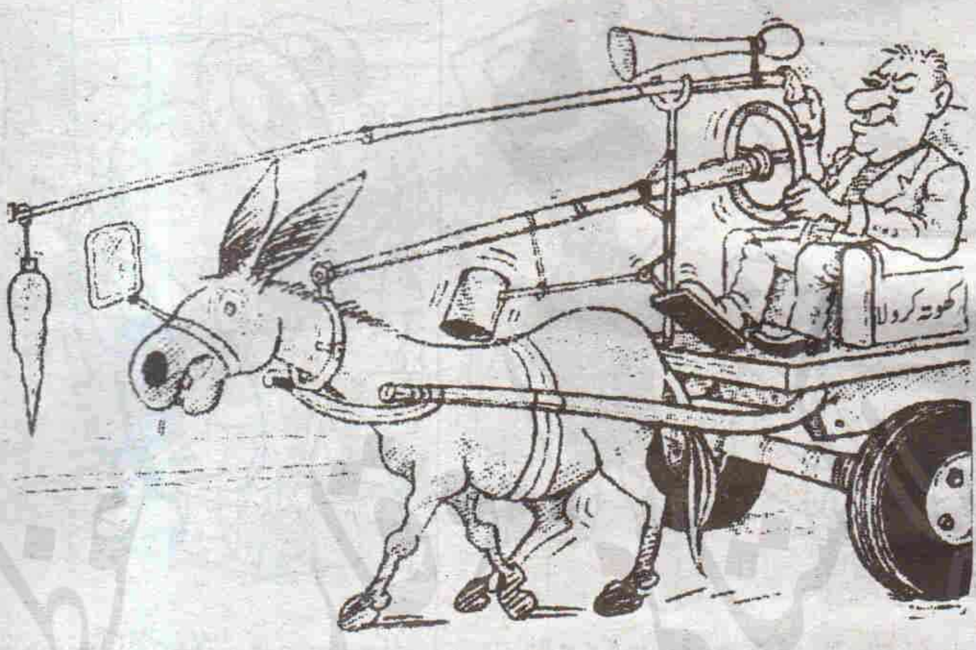

"اگر پٹرول یونہی مہنگا ہوتا رہا، سی این جی کامیاب ہوتی گئی تو پھر شاید---"

"سر! میرا خیال ہے کہ وفاقی حکومت کو ہفتہ میں دو دن کی بجائے پانچ دن چھٹی کرنی چاہیے---"

ہیں، پچیس سال بعد ہمارے کپڑے وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے---واہ رے، فیشن! ☺ مسٹر طوطی فرام نقار خانہ

"میں نے اس مجسمے سے ملتی جلتی شخصیت کو کہیں دیکھا ہے---کہاں دیکھا ہے؟ یہ یاد نہیں آ رہا---"

"دراصل میں کسی بھی ماڈل کی تصویر اس وقت تک بنانا شروع نہیں کرتا جب تک مطلوبہ تعداد میں رنگین پنسلیں گھڑ نہ لوں---"

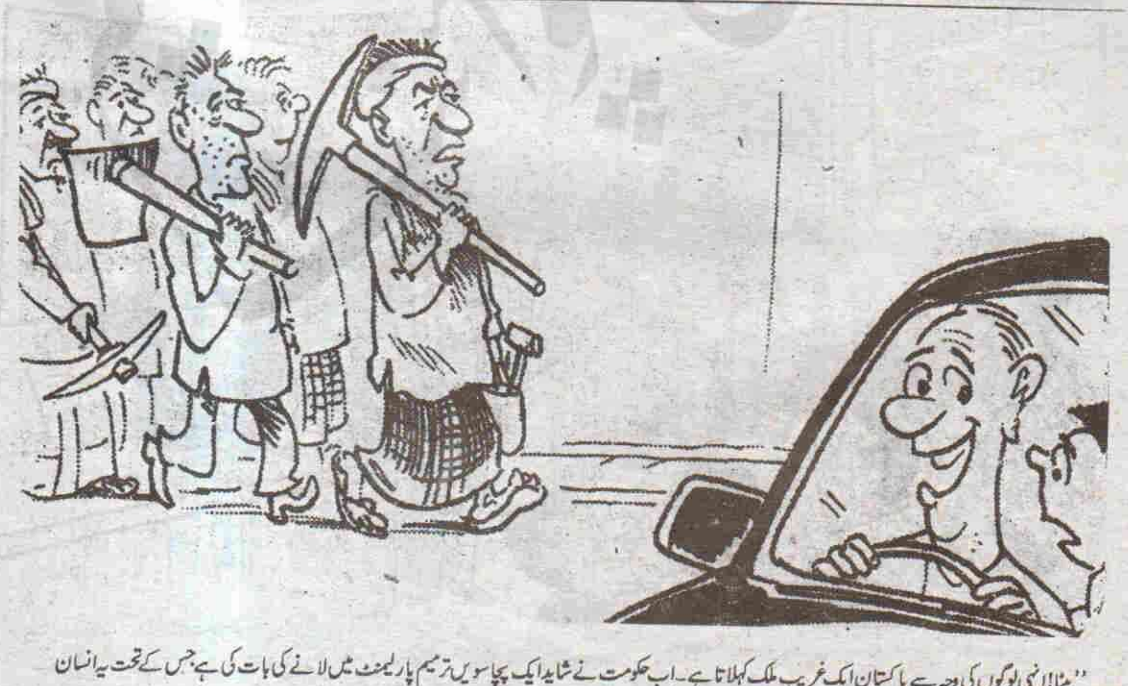

"بیٹا! انہی لوگوں کی وجہ سے پاکستان ایک غریب ملک کہلاتا ہے۔ اب حکومت نے شاید ایک پچاسویں ترمیم پارلیمنٹ میں لانے کی بات کی ہے جس کے تحت یہ انسان کہلانے کے حقدار نہیں رہیں گے، پھر پاکستان از ل امیر ملک کہلانے کا حقدار ہو جائے گا---"

واضح اشارے مل رہے ہیں کہ ایم کیو ایم کی کٹی پتنگ کو اس مرتبہ پیپلز پارٹی لوٹے گی ☺ شاہد اطہر

''ارے، یہ تو برابر کے گھر میں رہنے والی آنٹی زرینہ ڈیڈی کے ساتھ کمرے میں بند ہیں--- سمجھو، آج ڈیڈی کو بلیک میل کر کے میکڈونلڈ میں ڈنر پکا!''

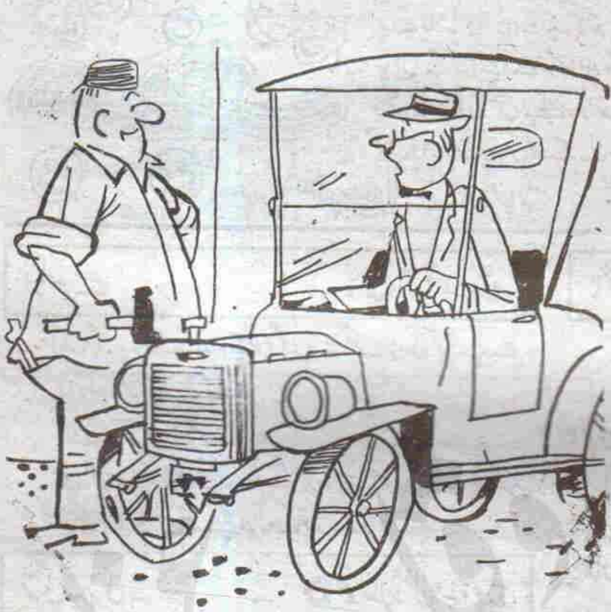

''پرے کر یہ ہتھوڑا، کہیں اس بیچاری کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے---''

''یہ آپ کے شوہر کی پرسکون نیند کے لئے گولیاں ہیں۔ یہ آپ کھا لیجئے گا، وہ پرسکون نیند سو سکیں گے۔''

''میں نے اپنے میاں کو خوب بے وقوف بنایا--- انہیں میں نے بتایا کہ پیٹ میں درد ہے حالانکہ میرا السر پھٹ گیا تھا---''

ہنس بیتیاں

کبھی کوئی مکالمہ' کسی کی معصومیت یا بدحواسی پر بے ساختہ قہقہے وارد ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی واقعہ پر بے تحاشہ ہنسی آئی ہو تو ایک کاغذ پر ہمیں لکھ بھیجئے۔ ہم اِن صفحات پر اسے آپ کے نام سے جگہ دیں گے اور چاہیں گے کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اس واقعہ سے لُطف اُٹھا سکیں' ہنس سکیں۔ کسی لطیفے کو توڑ مروڑ کر واقعہ بنانے کی کوشش نہ کیجئے۔ واقعہ کاپی سائز کے دو صفحات سے زیادہ نہ ہو' اخلاق سوز نہ ہو۔ سب سے زیادہ قہقہہ آور واقعہ پر سال بھر کے لئے چاند مفت بطور انعام دیا جائے گا۔ واقعہ اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ''ہنس بیتیاں'' تیس روزہ ''چاند'' شمع پلازہ' فیروز پور روڈ' لاہور 54600

ایکسرے
احمد حبیب قیصر

ایک جگہ پر کچھ لڑکے راہ چلتے لوگوں سے جگت بازی کر رہے تھے۔ مَیں گزرا تو ایک لڑکے نے کہا۔

''اوئے' بابے دا ایکسرے کرو۔''

مَیں ہنسی دبا کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیبل کی برکات ہیں کہ بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔

ترکی بہ ترکی
محمد صابر مغل عبدو پوری

مَیں اور محمد عادل گلزار گفتگو کر رہے تھے۔ عادل گلزار کہنے لگا کہ مَیں بڑا شریف بندہ ہوں۔

''تو میری کونسی تھانے میں تصویر لگی ہوئی ہے؟'' مَیں نے جواب دیا۔

''لگوا دیتے ہیں۔'' عادل گلزار نے شوخی سے کہا۔

''نہیں' یار! تمہاری ہی کافی ہے۔'' مَیں نے جواب دیا اور محمد عادل گلزار کی شوخی رفو چکر ہو گئی۔

اِسلام
زاہد نیازی' میانوالی

وار پلاننگ کے دوران ہمارے کچھ دوستوں کی ڈپلومنٹ چکلالہ ایئر بیس پر ہو گئی۔ کچھ دِن گزارنے کے بعد ہمارے ایک دوست جن کا نام اسلام ہے' وہاں سے واپس آ گئے اور اپنے بیس کو جوائن کر لیا۔ ہمارے ایک دوسرے دوست ممتاز نے جب اُسے دیکھا تو ظفر (ہمارے کولیگ) سے پوچھا۔

''یار! یہ ''اِسلام'' چکلالہ سے آیا ہے' نا؟''

ظفر نے برجستہ جواب دیا۔ ''نہیں! ''اسلام'' تو عربوں سے آیا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ قریب بیٹھے ہوئے ہم سب لوگوں کے ہنسی کے پھوارے پھوٹ پڑے۔

ٹائم پیس
زاہد حسین زاہد

یہ واقعہ میرے ایک دوست نے سنایا' اُسی کی زبانی سنئے۔

الیکشن کے دِن تھے' ہمارے حلقے میں ایک اُمیدوار کا انتخابی نشان ٹائم پیس تھا اور اِس کے پوسٹر پر ٹائم پیس بھی چھپا ہوا تھا اور ٹائم پیس کے اُوپر اِنقلاب لکھا ہوا تھا۔ یہ پوسٹر ہمارے گاؤں کے سکول کی دیوار پر چسپاں تھا اور سکول کی دیوار کے پاس ہی ہمارے ٹیچر درشن صاحب ہمیں پڑھا رہے تھے۔ درشن صاحب نے ساری کلاس سے سوال پوچھا۔

''اِنقلاب کے کیا معنی ہیں؟''

ہمارے کلاس کے ایک لڑکے عبدالرشید نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے فوراً جواب دیا۔

''ٹائم پیس---!''

عبدالرشید کا جواب سن کر ماسٹر صاحب کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔

کرم
شکیب رانا' کوئٹہ

ہمارے ایک دوست کو سری پائے جیسی مرغن غذائیں بوجہ بلڈ پریشر سخت منع ہیں' اُن کی بیوی بھی اُنہیں ایسی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی لیکن گھر سے باہر کسی طرح داؤ لگا جاتے ہیں۔

ایک دِن کسی دوست کے گھر پہنچے تو اُس کے گھر سری پائے پکے ہوئے تھے۔ جب کھانا سامنے آیا تو اُنہوں نے کھانے کے ساتھ پورا انصاف کیا۔ گھر پہنچ کر بیوی کو بتانے لگے۔

''کھانا سامنے آیا تو اِنکار کرنا مشکل تھا' مَیں صرف شوربے سے روٹی کھا کر آ گیا ورنہ تمہیں شکایت ہوتی۔ اللہ نے بڑا کرم کیا ورنہ آج بُری طرح پھنس گیا تھا۔''

جان دے کر
عرفان شہزاد لکی

KLC کالج میرپور میں ''کریزی فور'' کے نام سے ہمارا گروپ ہر سٹوڈنٹ و ٹیچر میں مشہور تھا اس لیے کند ذہن میں یہ خیال آیا کہ

''چاند'' کی کاکیوں کی مت مارنے کے لیے کریزی فور ہونا چاہیے تو تین بھائی لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر بنا ڈالا۔ خیر پور میرپور میں دوران تعلیم ایک لڑکی کو ہماری یہ گروپ بندی قطعی طور پر پسند نہ آئی اور ہمارے گروپ کو توڑنے کی ٹھان لی اور ہم میں کسی حد تک پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ ہم نے بڑی خوش اسلوبی سے تمام واقعے کی تحقیقات کی اور تہہ تک پہنچ گئے۔ دوسرے دِن جب وہ کالج آئی تو سب کے سامنے اُس کی سازش کو بے نقاب کیا تو اُس پر شرمندگی کے پہاڑ گر پڑے اور اِس حد تک شرمندہ ہوئی کہ کہنے لگی کہ اگر میری جان کے بدلے میں آپ لوگوں کا غصہ اُتر سکتا ہے تو مجھے گولی ماردیں' مَیں نہ نہیں کروں گی---

ہم فوراً بولے۔

''یہ ہمارے گروپ کے اصولوں کے خلاف ہے کہ ہم کسی لڑکی کو گولی ماردیں۔''

وہ آہستہ سے بولی۔ ''تو کیا معاف کر دو گے؟''

ہم بولے۔ ''نہیں' ہم تمہیں زندہ جلائیں گے۔''

یہ سنتے ہی لائبریری میں ایک قہقہہ گونجا اور وہ بے چاری روہانسوی شکل بنا کر نکلی اور ایسی نکلی کہ ترس گئی آنکھیں اُس کے دیدار کو۔

وجہ اضافہ ۞ محمد صابر مغل عبدوپوری

محمد عادل گلزار اور میرے درمیان آبادی میں اضافے کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ عادل گلزار کہنے لگا۔

''اگر آبادی میں اضافے کی یہی رفتار رہی تو آئندہ چند سالوں میں پاکستان آبادی کے لحاظ سے چوتھے نمبر پر آجائے گا۔''

''ڈنکا بجانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم جلد ہی شادی کرنے والے ہو۔' مَیں نے کہا۔

پھر ہم دونوں کے قہقہے گونجنے لگے۔

چوٹ ۞ احمد حبیب قیصر

میرے ہاں ایک نوعمر راج کام کر رہا تھا۔ وہ رات تک کام کرتا' اِس دوران بجلی کی لوڈشیڈنگ شدت اختیار کر گئی اور مَیں کئی مٹی کے دِیے لے آیا۔ وہ بار بار پوچھنے لگا کہ کس لیے لائے ہیں؟ مَیں چپ رہا۔ آخر اصرار پر یہ جواب دیا۔

''خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے''

وہ میری چوٹ سے خوب لطف اندوز ہوا اور کہا کہ مجھے خبر نہ تھی کہ فلسفی مالک سے پالا پڑا ہے۔

اِن شاءاللہ ۞ احمد حبیب قیصر

گرنے سے میرے ہاتھ پر چوٹ آگئی۔ مَیں جراح کے پاس گیا' اُس نے دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ مَیں نے لگانے والی دوا بھی خرید لی اور پیسے پوچھے۔ اُس نے دوا پکڑاتے ہوئے اور پیسے پکڑتے ہوئے کہا۔

''کیا اب آپ نہیں آئیں گے؟''

مَیں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اِن شاءاللہ---!''

اور پھر دبی دبی ہنسی ہر طرف بکھر گئی۔

پوتی ۞ ثمینہ' لاہور

میری بھتیجی معیزہ سحر جس کی عمر تقریباً ڈھائی سال ہے اور اپنے بڑے بھائیوں شہریار اور صبیح الرحمٰن سے چھوٹی ہے۔ اِس عمر میں بچے نئی نئی باتیں سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک دِن مَیں نے معیزہ سحر سے پوچھا۔

''معیزہ! آپ امی (یعنی دادی) کی کیا لگتی ہو۔''

معیزہ یہ سوال سن کر سوچنے لگی لیکن وہ جب کوئی جواب نہ دے سکی تو مَیں نے کہا۔ ''معیزہ! آپ امی کی پوتی ہو۔''

یہ سن کو معیزہ فوراً منہ بنا کر بولی۔

''اوں---گندی پھوپھو! مَیں کوئی امی کی پوٹی ہوں۔''

اُس کی یہ بات سن کر میرا ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔

شرارت ۞ ظفر کوثر' چنیوٹ

ایک دِن ہم اپنے محلے کی ایک دوکان پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اِتنے میں ایک باریش آدمی آیا اور دوکاندار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''اللہ دین! تھوڑا سا سرسوں کا تیل دینا۔ مجھے سر میں لگانا ہے۔'' (واضح ہو کہ یہ ابھی ابھی قریبی مسجد میں نہا کر آیا تھا) اللہ دین کو شرارت سوجھی۔ چنانچہ اُس نے سرسوں کا تیل دینے کی بجائے بنفشہ کا شربت دے دیا۔ اُس نے پہلے تو اسے سر میں لگایا اور جو باقی بچا اسے داڑھی پر لگا لیا اور اپنے گھر کو چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہ ہاتھ میں ڈنڈا اُٹھائے' گالیوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا نازل ہوا۔ واقعی اُس کی صورت قابل دید تھی۔ منہ اور سر پر اس قدر مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں کہ اُس کا چہرہ شہد کی مکھیوں کا چھتا نظر آتا تھا۔

جب سے بجلی کے بل میں اضافے کی خبر سے ''بلبلاہٹ'' میں اضافہ ہوا ہے تب سے پاور کے اصل مطلب کا اندازہ ہوا ہے۔ اکثر سنا کرتے تھے کہ فلاں سیاستدان یا لیڈر بڑا ''پاورفل'' ہے اور ''پاور'' کا استعمال خوب جانتا ہے' ہم اپنی کمزور عقلی سے پاور کا مطلب طاقت ہی سمجھتے رہے جبکہ کچھ عرصہ پہلے ہماری فوج نے جب پاورفل لوگوں کی پاور کاٹنی شروع کی تو ہمیں پتہ چلا کہ پاور کا اصل مطلب بغیر میٹر کے پاور استعمال کرنا ہوتا ہے۔ فوج چونکہ ہمیشہ سے پاور پہ کڑی نظر رکھتی چلی آ رہی ہے لہٰذا اسے پاورفل لوگوں کی اصل پاور معلوم کرنے میں زیادہ پاور نہیں لگی۔ موجودہ حکمت کو بھی پاور پہ قابو پانے کے بعد یہ لگ پتہ گیا کہ اس سے پہلے ملک میں بڑے بڑے پاورفل لوگوں نے نہ صرف پاور پہ ناجائز قبضہ کر رکھا تھا بلکہ وہ پاور کا ناجائز فائدہ بھی اُٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے جیسے اکثر پسماندہ ملکوں میں پاور کا حصول ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہمیشہ پاور سے ہی حل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی سنا تھا کہ پاور (بجلی) کے بغیر آج کل کوئی چیز نہیں چلتی' اب پتہ چلا کہ حکومتیں بھی پاور سے ہی چلتی ہیں۔ جس طرح ہر بڑے مقصد کے حصول کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے' اسی طرح ہر پاور کا بل بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی عامیانہ طبقہ پاور کا ماہانہ بل ادا کرتا ہے جبکہ شاہانہ طبقے کو پاور استعمال کرنے کے لئے ''بل کل'' ادا نہیں کرنا پڑتا۔ بقول سرگم' بل چاہے واپڈا کا ہو یا امریکہ کا' اس پہ عوام کو شکوہ ہی رہتا ہے۔ واپڈا کا بل تسلیم نہ کرو تو بجلی کٹ جاتی ہے' امریکہ کا بل تسلیم نہ کرو تو امداد گھٹ جاتی ہے--- واپڈا اور امریکہ کے بلوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ واپڈا کا غلط بل عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا جبکہ امریکہ کا بل (کلنٹن) غلط ہو تو اسے کسی بھی عدالت میں پیش کر کے اس سے پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے۔ امریکہ میں ''بل'' زیادہ سے زیادہ آٹھ سال عوام پہ بلا مقابلہ حکومت کرتا ہے جبکہ ہمارے واپڈا کا بل ساری عمر عوام پہ بڑھ چڑھ کے حکومت کرتا ہے اور جس کا خمیازہ عوام کو ساری عمر ''بل مقابلہ'' کرنا پڑتا ہے۔ ماسی مصیبتے کا کہنا ہے کہ ہمارے عوام بل ادا کرنے میں اتنے سعادت مند ثابت ہوئے ہیں کہ اگر حکومت ''جتنے بچے اتنے بل'' کا قانون نافذ کر دے تو منصوبہ بندی والوں کا محکمہ فاقہ بندی پہ مجبور ہو جائے گا جبکہ انکل سرگم کو یقین ہے کہ ہماری ثابت قدم قوم ہر بچے پہ لگنے والا بل تو برداشت کر لے گی مگر کم بچے کبھی برداشت نہیں کرے گی بلکہ حکومت کی مخالف سیاسی جماعتیں تو دو سے زیادہ بچوں پہ لگنے والا سرچارج تک ادا کرنے پہ آمادہ ہو جائیں گی تاکہ حکومت کی یہ پالیسی بھی کامیاب نہ ہو۔

واٹر بل' بجلی کا بل' گیس اور ٹیلیفون کے ساتھ ساتھ پراپرٹی اور پٹرول کے بلوں میں اضافے سے اُمید تھی کہ لوگ پانی صرف زندہ رہنے کے لئے استعمال کریں گے' سڑکوں پہ گاڑیوں کی تعداد کم ہو جائے گی' عوام کے چولہے ٹھنڈے پڑ جائیں گے مگر روزمرہ کی زندگی پہ کسی قسم کا ''بل واسطہ'' کچھ اثر نہ پڑنے سے حکومت یہ سوچنے پہ مجبور ہو رہی ہے کہ اب کس چیز پہ ٹیکس لگا کر اس کا بل عوام پہ دے مارے؟ انکل سرگم نے حکومت کو نئے ٹیکس' نئے بل بنانے کے چند منفرد طور طریقے بتائے ہیں جو ابھی حکومت کی نظر سے بچتے پھرتے ہیں۔

پاور ٹیکس

فاروق قیصر
farooq.qaisar@janggroup.com.pk

شادی ٹیکس: ہمارے ہاں ہر غریب باشندہ اس بات پہ بھی کامل یقین رکھتا ہے کہ شادی ہی اس کے لئے واحد عیاشی ہے کہ جسے miss کرنا نہیں بنتا۔ اس کے علاوہ چونکہ شادی سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے چنانچہ وہ جہیز کو ''رزق حلال'' سمجھ کر شادی کرنا اپنا مذہبی فریضہ اور معاشی وسیلہ سمجھتا ہے۔ غریب بندے کی اس ''شادیانہ کمزوری'' سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومت ایک شادی پہ دو ہزار اور ایک سے زائد شادیوں پہ دس ہزار روپے فی شادی ماہانہ ٹیکس' اور فی طلاق پہ ایک لاکھ جرمانہ ٹیکس عائد کر دے تو سرکاری خزانہ عوام کے صبر کی طرح راتوں رات لبریز ہو سکتا ہے۔

اولاد ٹیکس: بقول سرگم' ہمارے ہاں ہر غریب بندہ بچوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اُن کے لئے وہ شادی کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا چنانچہ حکومت اگر اس ''بچگانہ'' موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک ہزار روپیہ فی لڑکا اور پانچ سو روپے فی لڑکی ماہانہ ٹیکس لگا دے تو اس سے حکومت کی آمدنی میں آبادی کی طرح بے حساب اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس زمرے میں تین سے زائد بچوں پہ سرچارج لگنے سے غریب کو بچوں سے اتنی نفرت ہو جائے گی کہ وہ ہر سال جون میں پیدا ہونے والے سرکاری بجٹ کی نفرت کو بھول جائے گا۔

سنجیدہ ٹیکس: ہمارے ہاں آج کل کوئی ہنس رہا ہو تو لوگوں کو شک ہو جاتا ہے کہ ہنسنے والا یا تو کوئی فارنر ہے یا پھر اپنے دیس کا کوئی دیوانہ۔ حکومت نے عوام کی بڑھتی ہوئی اس سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ٹی وی پہ پرائیویٹ ڈرامہ پروڈکشن کمپنیوں کو اپنے پروگراموں کے ذریعے عوام کو ہنسانے کے لئے وقت بھی فروخت کیا مگر ٹی وی پہ چلنے والے مزاحیہ پروگرام دیکھ کر جب لوگ اور زیادہ سنجیدہ ہو گئے تو حکومت نے سینما اور تھیٹر میں فحش کلمات اور ''مجرا مانا'' حرکات کی اجازت دی تاکہ لوگوں کی کم از کم مصنوعی ہنسی ہی لوٹ آئے مگر اس عمل سے جب صرف محدود ردعمل ہوا تو اُس نے گھر گھر ''خوشیاں'' (جسے چند منچلے فحاشیاں بھی کہتے ہیں) پہنچانے کے لئے ''کیبل'' کا سہارا لیا۔ کیبل نے تو اگلے پچھلے سارے ٹیبل ہی اُلٹ دیئے۔ اب جس گھر میں کیبل ہوتی ہے' اس گھر میں سے ہنسی کی بجائے ثقافت اور شرافت کے ماتم کی صدائیں گونجتی ہیں۔

انکل سرگم کا حکومت کو مشورہ ہے کہ وہ عوام کو ہنسانے کی بجائے عوام کی اس سنجیدگی سے پورا فائدہ اُٹھائے اور ہر سنجیدہ رہنے والے پہ ٹیکس عائد کر دے تاکہ عوام ٹیکس سے بچنے کے لئے خوامخواہ قہقہے لگانے پڑیں۔ عوام کو یوں ہنستا دیکھ کر ایک تو ان پہ مزید ٹیکس لگانے کا جواز پیدا ہو گا اور دوسرا یہ کہ ساری دُنیا میں ہماری زندہ دلی کی دھوم مچ جائے گی۔

جلسہ جلوس ٹیکس: آج کل چونکہ الیکشن کا سیزن لگا ہوا ہے جس میں سیاستدانوں کا پرانا مال بھی ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے لہٰذا حکومت کو سیاسی جلسہ جلوس پہ ٹیکس لگانے کا سنہری موقع میسر ہے۔ اگر حکومت ہر سیاسی جلسے پہ دس لاکھ اور ہر جلوس پہ پندرہ لاکھ روپے ٹیکس عائد کر دے تو اگلی حکومت کے کھانے کے لئے خزانہ بھرا جا سکتا ہے۔ جلسہ جلوس پہ ٹیکس لگانے سے نہ صرف وکیلوں کی ہڑتال پہ قابو پایا جا سکے گا بلکہ اس ٹیکس سے جلسوں میں کچلے اور جلوسوں میں مارے جانے والوں کو سرکاری معاوضہ دینے میں سرکار کو پلے سے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔

☆☆

ساتویں ملکہ

نعیم نیازی

میڈیا چاہے الیکٹرانک ہو یا پرنٹ، ہر دم "مصالحے" کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے تاکہ اپنی خبریں مزید چٹخارے دار بنا سکے۔ کچھ عرصہ پہلے وینا ملک نے ان کی مشکل آسان کردی اور بیٹھے بٹھائے یکمشت بارہ مصالحے انہیں فراہم کردیئے جس کے تڑکے سے نہ صرف ان کے پراڈکٹس ہاتھوں ہاتھ بکنے لگے ہیں بلکہ اکثر چینل والے تو "لوٹ سیل" کے مزے بھی لوٹ رہے ہیں۔ ماتھے سے ماتھے نیوز چینلز کا سسپنس اس وقت دگنا ہو جاتا ہے، جب اس کے آگے یا پیچھے وینا ملک کے کلپس دکھا دیئے جائیں کیونکہ ہمارے ناظرین فطری طور پر خاصے مہم جو واقع ہوئے ہیں اور ہمیشہ سکینڈل کی ٹوہ میں رہتے ہیں---میڈیا پر تو وینا ملک کے چرچے تھے ہی، اب تو پارلیمان میں بھی اسی کے تذکرے ہورہے ہیں۔ پچھلے دنوں سینٹ میں تجویز پیش کی گئی کہ وزراء اور ارکان کو اجلاس میں لانے کیلئے وینا ملک کو سینیٹ یا ڈپٹی چیئرمین بنا دیا جائے۔ کافی عرصے سے یہ شکایت عام ہے کہ اراکین سینٹ بالعموم اور وزراء بالخصوص سینٹ کے اجلاسوں سے غیر حاضر رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کاروائی متاثر ہوتی ہے---قوم کا درد رکھنے والے اراکین نے ایوان میں حاضری بہتر بنانے کیلئے یوں تو متعدد تجاویز پیش کیں مثلاً کسی نے کہا کہ غیر حاضر اراکین کو پی آئی سی کی ادویات کھلائی جائیں تو کسی نے مشورہ دیا کہ غیر حاضر ارکان کی تنخواہ والا ڈونسر ایک ماہ کے لئے بند کردیئے جائیں لیکن یہ دونوں تجاویز کافی مضر ہیں اور جانی و مالی نقصان کا باعث بن سکتی ہیں۔ ادویات والی تجویز اس لئے قابل عمل نہیں ہے کہ اس سے دوائی کھانے والے کی جان جاسکتی ہے جبکہ تنخواہ بند کرنے والی تجویز مالی نقصان کا باعث بنے گی، غریب سینیٹرز ایسی سزا بھلا کیسے افورڈ کرسکتے ہیں؟ لے دے کے وینا ملک والی آپشن ہی باقی بچتی ہے جو دل کو لگتی ہے--- وینا ملک جس فیاضی سے پڑوسی ملک میں جلوہ ہائے صدرنگ بکھیر رہی ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی "فیض خواص" کیلئے مذکورہ ایوان میں پیش کردے تو بہتوں کا بھلا ہو جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ایوان کی حاضری سو فیصد مکمل ہو جائے گی اور کورم ٹوٹنے کی نوبت کبھی نہیں آئے گی بلکہ ہر اجلاس کے موقع پر ایوان کھچا کھچ بھرا ہوا ہوگا۔ کئی معزز اراکین تو ایسے بھی ہوں گے جو وقت بے وقت اجلاس کرنے کی ریکوزیشن جمع کراتے رہیں گے بیشتر باذوق حضرات کی قلبی کیفیت کچھ یوں ہو گی--- "تیرے پنڈے تے نظر نہیں ہٹتی، ایجنڈا اہم کیا ہیں"--- قانون سازی کا کام ہو نہ ہو، بفضل جمہوریت اراکین پارلیمنٹ کو اچھا خاصا مشاہرہ ملتا ہے۔ وینا بے چاری پیسوں کیلئے آئے روز دیس دیس کی خاک چھانتی ہے اور طرح طرح کی باتیں سنتی ہے اگر یہ سہولت یعنی معقول روپیہ پیسہ اور بھرپور پذیرائی اُسے اپنے ملک میں ہی میسر آجائے تو اسے پردیس جانے کی ضرورت یقیناً نہیں رہے گی بلکہ وہاں تو اس کی پرفارمنس اتنا جگ ہنسائی کا موجب بنتی ہے کیونکہ سب کیا دھرا ہے کیمرے کے ذریعے منظر عام پر آجاتا ہے جبکہ یہاں پردہ ان کیمرہ پرفارمنس کا مطالبہ بھی کرسکتی ہے جو کہ ایک حفاظتی اقدام ہوگا۔ نہ کسی بولڈ سین کی نمائش عام ہو گی، نہ کوئی انگلی اٹھا سکے گا۔ یعنی فاضل پارلیمنٹیرین تو حسن بے پرواہ کے "لائیو" جلوؤں کا لطف اٹھائیں گے لیکن عوام کیلئے "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا" والی صورتحال ہو گی۔ ایوان کا فلور ٹینشن فری ماحول کی تصویر پیش کرے گا۔ معزز اراکین جب بور کر دینے والی قانون سازی سے اکتا جائیں گے تو ان ہاؤس انٹرٹینمنٹ سے دل پشوری کرلیں گے۔ ریفرشمنٹ کا عمل چاردیواری کے اندر پردہ داری سے جاری و ساری رہے گا--- یہ خبر اس امر کی بھی عکاس ہے کہ وینا "خواص" میں بے پناہ مقبول ہے اور عوام بے چارے کس گنتی میں ہیں؟ بے روزگاری اور مہنگائی نے ان کی ایسی "مت" ماری ہے کہ وینا ملک کے توبہ شکن جلوے دیکھنے کی انہیں فرصت ہی نہیں ملتی انہیں۔ سچ پوچھیئے تو ساری طاقت کا مرکز و محور بھی یہی خواص ہیں، عوام کی کیا مجال کہ انتہائی اوپر تک رسائی رکھنے والی اس بے باک فن کارہ کے ڈھیلے کریکٹر کا سوال اٹھائیں--- خدا لگتی کہیں تو ملکی معیشت جس طرح بدحالی کا شکار ہے۔ مہنگائی اور کساد بازاری جس طرح ہر روز نئی افتاد ڈھا رہی ہے، نہ صرف روپے کی قدر گھٹ رہی ہے بلکہ لوگوں کی جان مال اور عزت بھی بے وقعت ہو رہے ہیں اور السپر ائیں چارو ناچار وینا ملک کی تقلید کریں گی۔ یہ راہ مشکل ضرور ہے لیکن ایک تو کوئی متبادل صورت موجود نہیں ہے، دوسرے اس کے مالی فوائد مدنظر رکھے جائیں تو "ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے" والی صورت نظر آئے گی۔ بس ایک جھلک دکھلایئے اور پلک جھپکتے ہی کوٹھی، کار اور بینک بیلنس پایئے۔ ہے نا! کمال کی بات---- موصوفہ نے صرف چند دن میں کروڑوں روپے کمائے ہیں اتنے مختصر وقت میں اتنا ڈھیر سارا دھن کمانا آسان کام نہیں ہے، دیکھنے والے انگشت بدنداں ہیں۔ اپنی آنکھوں پر انہیں یقین ہی نہیں ہوتا کہ ایک کمزور کی حوا زادی ایسا زبردست کماؤ پوت بھی ثابت ہوسکتی ہے؟ فلاسفر کا کہنا ہے کہ یار لوگ جب پرائی لڑکیوں کو یوں دونوں ہاتھوں سے دھن سمیٹتا دیکھتے ہیں تو ان کو اپنے نکھٹو بیٹے زہر لگنے لگتے ہیں جو از خود تو ایک پھوٹی کوڑی تک نہیں کماتے، الٹا اپنے والدین کے خون پسینے کی کمائی اللے تللے میں اڑا دیتے ہیں۔ فلاسفر کو یقین ہے کہ اب شادی شدہ جوڑوں کا چوائس تبدیل ہو جائے گا اور وہ بیٹے کیلئے منت مراد مانگنے کی بجائے کماؤ بیٹی کی دعا کیا کریں گے--- اپنے دیس میں تو وینا "بدنام جو ہوں گی تو کیا نام نہ ہوگا" والی کسوٹی پر کب کی پوری اتر چکی ہے۔ اب تو اس کا جادو بین الاقوامی مشاہیر کے سر بھی چڑھ کر بولنے لگا ہے اور تو اور، بھارتی سماجی کارکن انا ہزارے بھی وینا ملک کے پرستار ہیں۔ انہوں نے محض وینا ملک کا گانا دیکھنے کیلئے فلم "گلی گلی چور ہے" دیکھی۔ انا ہزارے کا کہنا ہے کہ اس سے ملک میں کرپشن کے خاتمے کیلئے آئیڈیاز ملیں گے۔ خدا جانے موصوف کس قسم کی کرپشن مکانے کیلئے وینا ملک کے کردار سے رہنمائی لینا چاہتے ہیں؟--- فلاسفر کا کہنا ہے کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے، موصوف نے محض اپنی خفت مٹانے کیلئے کرپشن کے آئیڈیاز کی بات کی ہے ورنہ اندر خانے ان کا مقصد بھی دیگر ناظرین کی طرح محض اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا تھا۔ مانا، جسمانی طور پر وہ خاصے بوڑھے ہیں لیکن کیا بوڑھوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟ پرانے سیانے کہتے ہیں---

دل ہونڑا چاہیدا جوان
عمراں وچ کیہہ رکھیا

ویسے بھی ایک کہاوت ہے کہ مرد اور گھوڑے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ یعنی وینا کئی زندہ دل بوڑھوں کے دل کی بھی دھڑکن بن چکی ہے--- ادھر ایک اور خبر آئی ہے کہ وینا ایک برطانوی فلم میں کام کر رہی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر امید رکھنا چاہئے کہ وینا واقعی صحیح مقام پر پہنچ چکی ہے۔ یقیناً ان فلموں میں اسے اپنے جوہر خوب کھل کر دکھانے کا موقع ملے گا انگریز بڑا دور بین واقع ہوا ہے کسی چیز پر محض ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہے اور وہ سب کچھ تاڑ لیتا ہے جو دوسرے گھنٹوں گھور گھور کر دیکھنے کے باوجود نہیں دیکھ پاتے۔ وینا کا معاملہ تو اُن کیلئے اور آسان ہوگا۔ پوشیدہ کونے کھدرے کھنگالنے کیلئے انہیں اس لئے بھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوگی کہ وہ تو خود پکار پکار کر کہتی ہے کہ---

جو چھپا تھا وہ دکھانے کیلئے آئے ہیں
ہم نئے "پوز" بنانے کیلئے آئے ہیں

بہرحال، کان کو سامنے سے پکڑا جائے یا ہاتھ گھما کر، ایک ہی بات ہے۔ یہ تو طے ہے کہ وینا نے تھوڑے وقت میں بہت زیادہ شہرت اور دولت کمائی ہے جہاں تک اس "عزت" کا سوال ہے تو موصوفہ کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس نے یہ نام اور یہ دھن دولت جس طریقے سے کمایا ہے، اس پر اعتراض کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں بھلا؟ یہ تو اس کا اپنا کمال ہے، اپنا سٹائل ہے۔ یہ اعزاز کوئی معمولی تو نہیں ہے کہ آج اپنی ہمت سے اس نے اپنا نام "ملکاؤں" کی فہرست میں درج کرالیا ہے قبل ازیں اس فہرست میں ملکہ ترنم، ملکہ غزل، ملکہ سنگیت، ملکہ سخن، ملکہ حسن اور ملکہ جذبات یعنی چھ ملکائیں شامل تھیں۔ اب موصوفہ نے اپنے سر پر ملکہ افیئرز کا تاج لیا ہے اور یوں ساتویں ملکہ کے روپ میں میڈیا پر جگمگا رہی ہے۔ یہ اچیومنٹ کم ہے؟ ☆☆

''سرکاری رشتے''

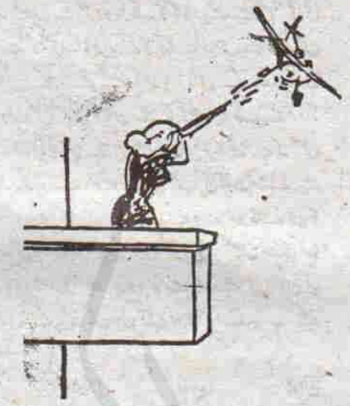

سمیع اللہ نیازی

دوستو! آج میں آپ کو جس رشتے کے متعلق بتانے جارہا ہوں، اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگالیں کہ پیر جنگلی جو کہ شادی کے نام سے 120KM کی رفتار سے بھاگتے ہیں، وہ بھی اس رشتے کی خاطر الٹا لٹک کر 40 دن کا چلہ کاٹنے کے لئے بیتاب ہوں گے۔ ہماری حکومت یعنی پاکستانی کلرک جب ''سوہنی رہی'' کی شادی ہونا ہوتی ہے تو اسے ملک کے کونے کونے سے پڑھے لکھے اور کسی حد تک مالدار نوجوان رشتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اخبار میں اشتہار چھپتا ہے کہ ''ہماری بھاگاں بھری'' کے لئے رشتہ درکار ہے--- امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میں ''سرکاری ملازمتوں'' کی بات کر رہا ہوں۔'' آیئے، میں آپ کو ان رشتوں کی اقسام سے متعارف کراتا ہوں۔

اونچے رشتے: یہ رشتے آئل و گیس، اٹامک انرجی اور میشن کے ہوتے ہیں۔ جن کے لئے پڑھے لکھے سے زیادہ مالدار ہونا ضروری ہوتا ہے تاکہ حکومت کے سینئر دامادوں کو خوش کیا جاسکے۔ جب حکومت کے فیملی ممبر بن ہی رہے ہیں تو سب رشتے داروں کو رام تو کرنا ہی پڑے گا، چاہے وہ نائب قاصد ہی کیوں نہ ہوں۔ اب سب کو رام کرنے کے لئے انسان کے پاس ''حرام'' کا ہونا ضروری ورنہ ایک کمائی سے انسان خود کو ہی ''حلال'' کر بیٹھتا ہے۔ ویسے اگر آپ کا کوئی عزیز یا رشتے دار پہلے ہی سے حکومتی دامادی کی پگڑی سنبھالے ہوئے ہے تو آپ بھی اس کی پگڑی سے لٹک جائیے۔ میرا مطلب ہے، آپ اسی کو ''خوش'' کر دیں۔ وہ آپ کو خوش کر دے گا۔ پھر آپ محلے والوں کو خوش کر دیجئے گا۔

شریف رشتے: یہ کلرک ٹائپ رشتے ہوتے ہیں۔ ایسا رشتہ مل تو جاتا ہے پر بعد میں انسان کو پچھتانا پڑتا ہے کیونکہ ٹائپنگ کی ٹھک ٹھک میں وقت ایسے نکل جاتا ہے جیسے شیریں رحمان کے ہاتھ سے وزارت نکل گئی--- انسان خوشی خوشی کلرکی جوائن کرتا ہے، پھر کچھ عرصے کے بعد جب چھٹی کر کے گھر جارہا ہوتا ہے تو کوئی کہنے والا کہہ دیتا ہے۔

''اے بھائی! کیا مری گئے تھے، سر پر برف پڑی ہوئی ہے؟''

جب گھر جا کر کلرک آئینہ دیکھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ سر میں برف تو نہیں لیکن ''چاندی'' ضرور اتر آئی ہے--- ایسی گھر دامادی سے بہتر ہے انسان کسی بس کی کنڈیکٹری کرلے، کم از کم بور تو نہیں ہو گا۔ ویسے سرکاری رشتہ کرنے کا ایک مزا اور بھی ہے وہ یہ کہ جہیز سارا ''سرکار'' یعنی حکومت دیتی ہے پر رشتے کے اینڈ پر (آپ سوچ رہے ہوں گے رشتے کا اینڈ؟)

چونکہ ہماری حکومت امریکہ کی مقروض ہے اور ان کی پالیسوں کو قائداعظم کے چودہ نکات مانتی ہے اسی لئے مغربی رشتوں کی طرح اس رشتے کا انجام بھی ''چلو چلو گھر چلو'' ہوتا ہے۔ اس کے بعد چونکہ انسان بندہ ہے، بندر نہیں اس لئے ''پرائیویٹ'' رشتہ ڈھونڈ لیتا ہے۔

یہ کلرک لوگ اپنے سسرال یعنی حکومت کو ایسے لوٹتے ہیں جیسے تقسیم پاک و ہند کی کہانی دہرا رہے ہوں یا پھر تصور کریں کہ چینی کا سٹال ہو اور حکومت چینی فری کر دے تو کیا منظر ہوگا؟ یہ کلرک لوگ دن میں چائے بہت زیادہ پیتے ہیں، ان کی رگوں میں بھی شاید چائے کی مقدار خون کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔ ہر آنے والے سے کہتے ہیں کہ ''چائے پئو گے یا پلاؤ گے؟'' --- بندہ سوچتا ہے کہ اپنا کام کراؤں یا چائے پئوں؟ تو وہ چائے کا آرڈر دے دیتا ہے کہ ایک کپ چائے--- تھوڑی دیر میں ایک ٹرے میں دس کپ چائے آجاتی ہے، آخر نائب قاصد بھی تو سرکاری داماد ہیں نا!

سخت رشتے: سخت رشتوں میں آرمی پولیس اور ریسکیو رشتے شامل ہیں چونکہ ان دامادوں نے اپنے سسر کی حفاظت اور سسرال کے اردگرد امن قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے ان کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کی عمر کی حد جوانی 18 سے 25 سال تک ہوتی ہے۔ جس طرح فرہاد نے شیریں کے لئے نہر کھودی تھی، بالکل اسی طرح ان کو یہ رشتہ حاصل کرنے کے لئے 7 منٹ کے اندر اندر ڈیڑھ کلومیٹر، یعنی ایک میل بھاگنا پڑتا ہے۔ پھر ڈینٹ نکالنے پڑتے ہیں۔ پھر Chin up کرنا پڑتا ہے۔ (میں بقلم خود ان رشتوں کی خاطر کئی دوڑیں لگا چکا ہوں لیکن آپ تک کوئی سرکاری رشتہ تو نہیں ملا پر ''بھگوڑا'' کا لقب ضرور مل گیا ہے مجھے) اول تو یہیں سے انسان پیر جنگلی کے ہاتھ پر بیعت کر لیتا ہے، یعنی وہ آپ شادی نہیں کرے گا' اب منزل قریب ہے تو پھر وہاں انسان پیر جنگلی کو چینی کے ذائقے کی طرح بھول جاتا ہے پھر وقت آتا ہے اس رشتے کے لئے باقاعدہ قربانیاں دینے کا، یعنی ٹریننگ کا لیکن اس وقت تک منگنی کی مٹھائی بانٹی جا چکی ہوتی ہے اور آدھا رشتہ طے ہو چکا ہوتا ہے سرکار سے--- پھر پاسنگ آؤٹ والے دن باقاعدہ ہاتھ میں بندوق تھما دی جاتی ہے کہ جا بیٹا! جا کے خودکشی کر لے۔ پھر ان کو تنخواہ اتنی کم دی جاتی ہے کہ بیچارے پولیس والے تو سڑکوں پر آجاتے ہیں چائے پانی کا خرچہ بنانے کے لئے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں۔

میں اور میرے دوست اکثر عشاء کی نماز کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے ہوٹل پر چائے پینے کے لئے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم چار دوست جب ہوٹل کے قریب پہنچے تو دو پولیس والے مل گئے۔

''کدھر جارہے ہو اوئے؟'' پولیس والے نے پوچھا۔

''صاحب! چائے کا موڈ بنا تھا' ہوٹل پر آئے تھے۔'' میں نے کہا۔

ایک بیلٹ بکس میں سے کوئی ووٹ نہیں نکلا' اسے کہتے ہیں شفاف انتخابات---! ☺ شاہد اطہر

''اچھا' اچھا اتنی رات گئے تم لوگوں کو چائے کی ضرورت پڑ گئی؟'' پولیس والا بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہم تو ادھر آتے رہتے ہیں۔'' تو وہ ہنسنے لگا۔

''اچھا تو اکثر آتے رہتے ہو' وہ بھی ہم سے چھپ کر؟''

''چائے پینے آئے ہیں' اس میں چھپنا کیسا؟'' میں بولا۔

''پولیس والے نے عجیب جواب دیا' کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ملک میں چینی کا بحران ہے اور ہم شدید قلت کا سامنا کر رہے ہیں اور تم لوگ ملک کو نقصان کی طرف دھکیل رہے ہو؟--- اوئے رشید! ان پر کونسی دفعہ لگتی ہے ذرا بتا ان کو۔'' وہ اپنے اسسٹنٹ سے بولا۔

اتنے میں' میں بولا۔ ''دفعہ دو کپ چائے بمعہ ایک پیکٹ بسکٹ بطور سزا۔''

پولیس والا بولا۔ ''تم سمجھدار لگتے ہو' چلو ہوٹل میں۔''

وہاں جا کر حکومت کے ان شریف دامادوں نے 4 کپ چائے پی اور چار پیکٹ بسکٹ خریدے ہمارے خرچے پر ہمارے پوچھنے پر پولیس والے نے بتایا کہ ''یہ بسکٹ شانی پتر اور نکی بیٹی کو بہت پسند ہیں اور تمہارا تحفہ سمجھ کر لے جا رہے ہیں۔'' اور ہم نے دل کی ''اتھاہ'' گہرائیوں سے وہ تحفے دے دیئے۔

اب کچھ حال احوال فوجی دامادوں کا!

ایک بات تو میں آپ کو لوہے کی طرح پکی اور کنفرم بتاتا جاؤں کہ فوجی کی آدھی پینشن تو مینٹل ہسپتال میں علاج پر خرچ ہوتی ہے کیونکہ ان کو دوران ''میرج لائف'' اتنے رگڑے لگائے جاتے ہیں کہ ان کا دماغی توازن 45 کے زاویے تک کھسک جاتا ہے جو کچھ پینشن ملتی ہے تو پہلے علاج ضروری ہوتا ہے۔ علاج کرا کے جب ہسپتال سے ٹھیک ہو کر گھر پہنچتے ہیں تو بچی کچھی رقم (پینشن) دیکھ کر دوبارہ مینٹل ہو جاتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ فوجی بہت دلیر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مخصوص وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ بندہ سوچتا ہے ''اتنی تنخواہ سے تو ڈسپرین کی گولی بھی نہیں ملتی تو کیوں نہ یہ دشمن کی گولی ہی کھا لی جائے---'' اس لئے حکومت کا یہ داماد جی دشمن کے سامنے ''وہائٹ بورڈ'' کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے اور 21 توپوں کی سلامی لیتا ہے۔ اب ذکر کچھ ریسکوئر اداروں کا بھی ہو جائے۔ آخر یہ بھی تو سسر کی ''ہڈیاں'' توڑ رہے ہیں--- سوری' روٹیاں توڑ رہے ہیں۔ ان دامادوں کو سستی کا عالمی ایوارڈ دیا جانا چاہئے۔ ہیں آگ لگ جائے تو موصوف حضرات ''چابکدستی'' سے دو گھنٹے بعد پہنچتے ہیں اور اکثر پہلا جملہ یہی ہوتا ہے کہ ''کس نے ہمیں سات منٹ پہلے اس حادثہ کی اطلاع دی تھی---'' مذکورہ سرکاری دامادوں کو نو دو گیارہ--- اوہ' سوری گیارہ بائیس کا نمبر بھی الاٹ ہے--- فائر بریگیڈ والے بلڈنگ کی آگ بجھاتے ہوئے پانی کا اس اکثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ صبح اخبار میں خبر لگی ہوتی ہے۔

''جس بلڈنگ میں آگ لگی تھی اس میں دس افراد پانی کے اندر ڈوب کر ہلاک ہو گئے' باقی سامان سارا جل گیا۔''

1122 کے آنے سے پہلے ان کا حال یہ تھا کہ ان کو حادثے کی اطلاع بندہ بھیج کر دی جاتی تو تب ہی یہ حرکت میں آتے کیونکہ اکثر لوگ فائر بریگیڈ والوں کو اپنا سمجھ کر ''دل لگی'' کرتے رہتے تھے اور فون کالز کرتے تھے اور اس وقت فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کی حالت یہ تھی کہ جب وہ جائے حادثہ پر پہنچتی تھیں تو گاڑی کا انجن اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ آدھا پانی تو بونٹ کھول کر انجن پر بہانا پڑتا تھا' پھر جا کر بلڈنگ کی باری آتی تھی۔ پانی کے پائپ میں اتنے سوراخ ہوتے تھے کہ زیادہ تر پانی ساتھ والی بلڈنگ یا مکان میں جمع ہو جاتا تھا اور اس جدوجہد میں آگ خود ہی ہتھیار ڈال دیتی تھی' یعنی سرینڈر کر دیتی تھی۔

ان دامادوں میں سے اگر کوئی داماد اپنی بیگم (نوکری) سے ناراض ہو تو ''چھٹو'' نامی سزا تجویز ہوتی ہے اور بالکل ہی چھوڑ دے تو ''آٹھ ماہ'' قید کی سزا ملتی ہے۔

رشوتی رشتے: ایسے رشتوں کو لوگ ''ٹھنڈی آہیں'' بھر کر حسرت کرتے ہیں۔ ایسے رشتوں کو پانے کے لئے نہ تو تعلیم کا ہونا ضروری ہے' نہ ہی انسان کا فٹ ہونا ضروری ہے بلکہ ''انسان اگر نہ بھی ہوں تو بھی ملازمت مل سکتی ہے۔ اس کے لئے ایک چیز ضروری ہے اور وہ ہے چار عدد جیبیں جو کہ نیلے پیلے نوٹوں سے بھری ہوں۔ ایسے رشتوں (ملازمتوں) کے لئے نہ تو اشتہار آتا ہے ورنہ ہی کسی کو کانوں کان خبر ہوتی ہے' بس محکمہ میں موجود افراد خود یہی سادگی سے ''رسم نکاح'' کر کے ''دلہن'' (ملازمت) کے ہاتھ پیلے کر دیتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بعض لوگ رشتے پیسے لے کر کرتے ہیں' یعنی بیچتے ہیں تو ان رشتوں کی نوعیت بھی کچھ اس قسم کی ہو سکتی ہے بلکہ اکثر رشتے تو ہوتے ہی پیسوں کے مرید ہیں۔ جس طرح رشتہ کرانے کے لئے کچھ مخصوص قسم کی بوڑھی مائیاں ہوتی ہیں' اس طرح اس فیلڈ میں رشتے کرانے کا کام MPA اور MNA حضرات سر انجام دیتے ہیں' یعنی جہاں مرضی آئی رشتہ پکا کر دیا۔

شاہی رشتے: ویسے تو ایسے رشتوں میں پولیس والے بھی شامل ہوتے ہیں لیکن یہاں پر میرا فوکس ''کسٹم'' کی ملازمت پر ہوگا۔ آیئے ذرا ان کی شخصیت کے چند پہلو کریدتے ہیں۔

یہ ہمارے ملک کی سب سے گنہگار، سوری ہونہار فورس مانی جاتی ہے۔ ان کو بلیک کو وہائٹ کرنا خوب آتا ہے--- اکثر ملک کی سرحدوں پر دشمن کے ارادوں کو ناکام کرتے ہوئے' ان کا سامان ہتھیا لیتے ہیں جو بعد میں اکثر ''گم'' ہو جاتا ہے' یعنی ''وہائٹ'' ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جن کو یہ رشتہ مل جائے' ان کا مستقبل ''انرجی سیوروں'' سے بھرا ہوتا ہے' یعنی روشن مستقبل ہوتا ہے۔

ان کے پاس ''چرس'' سونگھنے والے کتے بھی ہوتے ہیں جن کو جب چرس پکڑنے کے لئے چھوڑا جاتا ہے تو وہ اکثر ''کسٹم والوں'' کے اردگرد ہی گھومتے رہتے ہیں جیسے کسی چیز کی نشاندہی کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ کتے ان کے اس پیار کو دیکھ چکے ہوں جو کہ ان کی ''جیبوں'' میں بھرا ہوتا ہے۔

☆☆

☆لڑکیاں بلاشبہ بے حد حسین...اوہ سوری...بے حد ذہین ہوتی ہیں ویسے پہلا لفظ بولنے میں بھی کوئی قباحت تو نہیں کہ لڑکیوں کی اکثریت واقعی بہت ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہے (یہ لڑکے لوگ کیوں کسمسانے لگے بھئی؟) لیکن سب ہی لڑکیاں ایسی ہوں اب ایسا بھی ضروری نہیں ہے کچھ غبی اور ناسمجھ بھی ہوتی ہیں اور رج کے ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک ناسمجھ لڑکی کا احوال سرفراز شاہد اپنی ایک نظم "یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی" میں بیان کرتے ہیں پڑھیے اور لطف اُٹھایئے!

وہ اس کالج کی شہزادی تھی اور شاہانہ پڑھتی تھی
وہ بے باکانہ آتی تھی وہ بے باکانہ پڑھتی تھی
بڑے مشکل سبق تھے جن کو وہ روزانہ پڑھتی تھی
وہ لڑکی تھی مگر مضمون سب مردانہ پڑھتی تھی
جماعت میں ہمیشہ دیر سے وہ آیا کرتی تھی
کتابوں کے تلے فلمی رسالے لایا کرتی تھی
وہ جب دوران لیکچر بور سی ہو جایا کرتی تھی
تو چپکے سے کوئی تازہ ترین افسانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

کتابیں دیکھ کر کڑھتی تھی محو یاس ہوتی تھی
بقول اس کے کتابوں میں نری بکواس ہوتی تھی
تعجب ہے کہ وہ ہر سال کیسے پاس ہوتی تھی
کہ جو اردو میں نانا جان کو جاناں پڑھتی تھی
وہ سلطانہ مگر پہلے سی سلطانہ نہیں یارو!
سنا ہے کوئی بھی اب اس کا دیوانہ نہیں یارو!
کوئی اس شمع خاکستر کا پروانہ نہیں یارو!
خود افسانہ بنی بیٹھی ہے جو افسانہ پڑھتی تھی
یہی کالج ہے وہ ہمدم جہاں سلطانہ پڑھتی تھی

☺نگاہِ ادب میں عبیر ابوذری کا نام اور کلام بہت دھانسو قسم کا ہے موصوف جب جب بھی گویا ہوئے تو مزاح کی پھلجھڑیاں چھوٹتی چلی گئیں---

پلس نوں آکھاں رشوت خور تے فیدا کی
پچھوں کردا پھراں ٹکور تے فیدا کی

اور یہ کہ---

رویا ہوں تیری یاد میں دن رات مسلسل
ایسے کبھی ہوتی نہیں برسات مسلسل
اجلاس کا موضوع تو ہے اخلاق و مروت
بدخوئی میں مصروف ہیں حضرات مسلسل
کرتے ہیں مساوات کی تبلیغ وہ جوں جوں
بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں طبقات مسلسل
ہر روز کسی شہر میں ہوئے نہیں دھماکے
رہتی ہے میرے دیس میں شب رات مسلسل
پیشے نہیں بنتی ہے تو پھر جاتی کہاں ہے
یہ ذہن میں اُٹھتے ہیں سوالات مسلسل
ہر روز وہ ملتے ہیں نئے روپ میں مجھ کو
پڑتے ہیں میری صحت پر اثرات مسلسل
چہرے کو نئے ڈھب سے سجاتے ہیں وہ ہر روز
بنتے ہیں میری موت کے آلات مسلسل
کانٹے کی طرح ہوں میں رقیبوں کی نظر میں
رہتے ہیں میری گھات میں چھ سات مسلسل

☺مشتاق احمد یوسفی کے مطابق "بلیاں بے حد مغرور ہوتی ہیں۔ انہیں اس بات سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ دوسرے ان کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔ ان سے اگر کہا جائے کہ ہمیں دُنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ دوسروں کی مدد کریں تو ان کا پہلا سوال یہ ہوگا کہ پھر دوسرے یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟

☺مشہور ارب پتی راک فیلر ایک روز جب اپنے دفتر سے اُٹھے تو ایک اجنبی نے انہیں روک کر اپنی دکھ بھری داستان سنائی اور امداد کرنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ میں بیس میل پیدل چل کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ راستے میں جتنے بھی لوگ ملے سب نے بتایا کہ پورے نیو یارک میں آپ سا رحم دل کوئی اور نہیں۔

راک فیلر نے پوچھا۔ "کیا آپ واپس اسی راستے سے جائیں گے؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "جی ہاں---"

راک فیلر نے کہا۔ "تو برائے مہربانی میرا ایک کام کر دیجئے پورے راستے میں اسی "افواہ" کی تردید کرتے جایئے۔"

☺برطانیہ کا نشریاتی ادارہ (بی بی سی) پاکستان کے سیاسی حالات پر بہت گہری نظر رکھتا ہے۔ پچھلے دنوں بی بی سی نے نہایت دلچسپ انداز میں موجودہ حالات پر بہت جامع تبصرہ کیا جو کچھ یوں تھا۔

"میزبان کا اچانک آ ٹپکنے والے مہمان سے ملنے کا کوئی موڈ نہیں تھا لہٰذا میزبان نے اپنے ملازم کو آگے کر دیا۔ ملازم نے نہایت عزت کے ساتھ بن بلائے مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا کہ صاحب ابھی تیار ہو رہے ہیں آپ بتائیں کہ چائے پئیں گے یا ٹھنڈا؟ مہمان نے کہا کہ ایک اچھی سے چائے پلوا دو۔ ملازم الٹے قدموں واپس چلا گیا اور ذرا دیر بعد نمودار ہوا اور پوچھا کہ صاحب چائے آپ مکس پیتے ہیں یا دودھ الگ سے لاؤں مہمان نے کہا کہ مکس ہی پلا دو۔ ملازم واپس چلا گیا کچھ دیر بعد پھر اندر آیا۔"

"صاحبہ پوچھ رہی ہیں کہ آپ چینی لیتے ہیں یا پھیکی چائے پیتے ہیں؟"

"یہ تم نے اچھا کیا کہ پوچھ لیا۔ میں چینی نہیں لیتا۔"

کچھ دیر بعد ملازم پھر خالی ہاتھ کمرے میں داخل ہوا تو مہمان کی تیوری پر ایک بل پڑ گیا۔

''معاف کیجئے گا' بیگم صاحبہ نے پوچھا ہے کہ آپ چائے کپ میں پیتے ہیں یا ہمارے صاحب کی طرح مگ میں پیتے ہیں؟''

'ارے بھئی' بیگم صاحبہ سے کہو کہ میں بہت زیادہ چائے نہیں پیتا لہٰذا کپ میں ہی لے آؤ۔''

ملازم ''ٹھیک ہے' سر جی'' کہتا ہوا لوٹ گیا اور پھر پردے کے پیچھے سے اُبھرا ''معاف کیجئے گا' بس ایک بات اور بتا دیں۔ ہمارے ہاں دیسی کپ بھی ہیں اور میڈان چائینہ بھی--- صاحب کے کچھ دوستوں کو ملکی کپ پسند ہیں تو کئی کو--- آپ کونسے کپ میں چائے نوش فرمائیں گے؟''

مہمان نے لال پیلا چہرے پر رومال پھیرتے ہوئے کہا ''لاحول ولا قوہ--- بھئی' کسی بھی کپ میں لے آؤ' دیسی کپ میں ہی لے آؤ۔''

ملازم چہرے پر شرمندگی سجائے لوٹ گیا اور ذرا دیر بعد پھر داخل ہوا۔

''اب کیا ہوا---؟'' مہمان نے پوچھا۔

''وہ جی' بیگم صاحبہ نے پوچھا ہے کہ ہمارے ہاں دیسی کپ کے دو سیٹ ہیں۔ ایک سادہ اور دوسرے پر پھول بنے ہوئے ہیں تو آپ---''

اس سے پہلے کہ ملازم اپنا جملہ پورا کرتا' مہمان گھڑی دیکھتا ہوا کھڑا ہو گیا'' بیگم صاحبہ سے کہنا کہ مجھے ایک اور جگہ پہنچنا ہے۔ ان شاء اللہ میں جلد ہی فرصت سے آؤں گا اور صاحب سے بھی معذرت کر لینا۔''

یہ کہتا ہوا مہمان تیزی سے باہر نکل گیا اور ملازم نے زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔

بات یہ ہے کہ اگر آپ کی نیت عدلیہ کو دو نومبر کی پوزیشن پر بحال کرنے کی ہے تو پھر کر ڈالیں' یہ نہ پوچھیں کہ سب کو بحال کروں یا مائنس ون بحال کروں۔ آئینی پیکج کے ذریعے بحال کروں یا ایک سادہ قرار داد کافی رہے گی۔ ایوان میں بحث کے ذریعے بحال کروں یا سٹینڈنگ کمیٹی کے سپرد کر کے، موجودہ پی سی او حلف یافتہ ججوں کے ساتھ بحال کروں یا ان کے بغیر' آپ کی مرضی کے تیس دن مان کر بحال کروں یا اپنی مرضی کے تیس دن گن کر۔ ''لالاپ'' شروع ہونے سے قبل بحال کروں یا راگ مکمل ہوتے ہی بحال کر دوں؟--- وہ اور تھے جو بیزار ہو کر بکتے جھکتے اپنا ہی خون پی کر مروت اور وضع داری کا پاس کرتے ہوئے لوٹ جاتے تھے۔ آج کی جوتا لگا ؤ جتنا چاہئے پٹے بغیر نہیں جائے گی۔

☺ یہ دلچسپ واقعہ بھی بی بی سی کا ہی بیان کردہ ہے کہ شہنشاہ ایران رضا شاہ پہلوی ایک بار ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے دنوں میں ان کی دعوت پر لاڑکانہ آئے تھے۔ شہنشاہ کے اعزاز میں عشائیے کے موقع پر سندھ کے وزیر بلدیات جام صادق علی نے اپنے سر پر بڑی مہارت سے شراب کا جام رکھ کر اسی طرح رقص کیا تھا کہ ان کے سر پر رکھے جام سے دوران رقص شراب کا ایک قطرہ گرا اور نہ ہی جام گرا۔ شہنشاہ ایران نے جام کی یہ ''پرفارمنس'' اور پروٹوکول دیکھ کر ازراہ مذاق بھٹو صاحب سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس وزیر کو انہیں مستعار دے دیں کہ وہ انہیں ایران کا وزیر خزانہ بنالیں جب جام صادق کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُنہوں نے بڑے اشتیاق سے بھٹو صاحب سے پوچھا۔

''تو پھر سائیں' آپ نے کیا جواب دیا؟''

بھٹو صاحب بولے۔ ''میں نے شاہ سے کہا کہ اگر جام جیسا وزیر خزانہ ایران کا ہو تو آپ چار ہی دنوں بعد ''ایلفنسٹن'' سٹریٹ کراچی میں بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔''

☆☆

ساتھیو! ہماری نگاہ کا انتخاب سفر کرتا ہوا اب آپہنچا ہے آپ تک--- جی ہاں' آپ دوستوں کے وہ دلچسپ ایس ایم ایس جو ہمیں موصول ہوتے رہے ہیں وہ بھی اس کالم کا حصہ بنا کریں گے۔

☺ باوجود اس کے کہ وسیم حسن باہر چانڈ میں قلم کاری نہیں کرتے پھر بھی وسیم کی حس مزاح بے حد ''فعال'' ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ ''زندگی ملتی ہے ایک بار، دوستی ہوتی ہے ایک بار، پیار ہوتا ہے ایک بار، اقرار ہوتا ہے ایک بار۔ جب سب کچھ ہوتا ہے ''ایکبار'' تو کوئی مجھے بتائے کہ پھر یہ لائٹ کیوں جاتی ہے بار بار؟

☺ عبدالقیوم اسد کا شمار چانڈ کے اُن نوعمر اور نوآموز لکھاریوں میں ہوتا ہے جو بہت تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے لکھاریوں کی صف میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں ہماری اس بات کی تصدیق قیوم کی وہ تحریریں کرتی ہیں جو چانڈ کے گزشتہ شماروں میں شائع ہوئیں اور کہ جنہوں نے پڑھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ قیوم نے ہمارے ان باکس پر جو پرلطف میزائل داغے ملاحظہ کیجئے!

میں نے پوچھا چانڈ سے

کہ دیکھا ہے کہیں

میرے یار سا حسیں

چانڈ نے کہا۔

ارے ناں سینس! اتنی اوپر سے بھی کبھی کچھ ٹھیک طرح دکھائی دیتا ہے کیا؟

☺ ایک چھوٹے سے بچے نے اپنی دادی سے پوچھا۔

''دادی! آپ کیا ڈراموں میں کام کرتی ہیں؟''

دادی نے کہا۔ ''نہیں' بیٹے! تم سے کس نے کہا؟''

بچہ بولا۔ ''امی رات کہہ رہی تھیں کہ اب بڑھیا آگئی ہے' اب گھر میں ہر روز ایک نیا ڈرامہ ہوا کرے گا۔''

☺ ایک نوجوان کی گرل فرینڈ کی سولہویں سالگرہ قریب آ رہی تھی لیکن اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے تحفے میں کیا دے؟ آخر اُس نے والدہ سے مشورے کی ٹھانی اور پوچھا ''امی! فرض کریں کہ کل آپ پورے سولہ برس کی ہو جائیں گی تو آپ کس چیز کی خواہش کریں گی؟''

''پھر میری کوئی اور خواہش نہیں رہے گی' میرے بچے!'' والدہ کا جواب تھا۔

اسی طرح ایک اور نوجوان نے اپنے دوست سے پوچھا ''یار! تو بتا' اُسے تحفے میں کیا دوں؟''

دوست نے پوچھا ''دیکھنے میں وہ کیسی ہے۔''

''بے حد لولی' بے حد سمارٹ---؟ نوجوان کا لہجہ فخریہ تھا۔''

''تو پھر ایسا کر' اُسے میرا موبائل نمبر دے دے۔'' دوست نے کہا۔

☺ تمہیں جب کبھی ملیں فرصتیں' میرے دل سے بوجھ اُتار دو میں بہت دنوں سے اُداس ہوں' مجھے کوئی شام اُدھار دو مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک اٹھیں میری خواہشیں مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو' میرے سارے زنگ اُتار دو

☺ ارسلان آصف سے آپ ہرگز واقف نہیں ہیں کیونکہ ارسلان چانڈ کے لئے قلم کاری نہیں کرتے لیکن اگر کریں تو محفلیں لوٹ سکتے ہیں۔ ارسلان کی شگفتہ بیانیاں ملاحظہ کیجئے!

ایک صاحب کو مچھلی کے شکار کا بے حد شوق تھا۔ ایک بار وہ ایک مچھلی پکڑ کر لائے اور بیوی کے حوالے کی کہ اسے پکاؤ۔ بیوی جو پہلے ہی گوناگو مسائل سے پریشان بھری بیٹھی تھی' تڑخ کر بولی۔

''نہ پانی ہے' نہ گیس ہے' نہ آٹا ہے۔ کہاں سے پکاؤں۔ وہ صاحب واپس دریا پر گئے اور جا کر مچھلی کو دریا

کی طرف اُچھال دیا۔ مچھلی پانی میں اُتری، تیرتی ہوئی کچھ دور تک گئی۔ پھر کچھ خیال آنے پر پلٹی پانی سے اُچھل کر فضا میں بلند ہوئی اور ایک زوردار نعرہ مارا ''ق لیگ زندہ باد'' --- اور پھر گہرے پانیوں میں اُتر گئی۔

☺ سات سال پہلے تک میری ''جانِ تمنا'' کے ساتوں بھائی اکثر اوقات گھر میں ہی رہتے تھے جس سے مجھے سخت دشواری کا سامنا تھا لیکن اب ایسا نہیں کیونکہ اب وہ سب کے سب صبح سے لیکر شام تک آٹے کی لائن میں لگے ہوئے ہیں، یعنی کہ اب موجاں ای موجاں --- ق لیگ، زندہ باد!

☺ ہارون حسرت جالندھری کی صلاحیتوں سے کون واقف نہیں۔ موصوف کا چلبلا اور شریر قلم آئے دن کوئی نہ کوئی ''آفت'' ڈھائے رکھتا ہے۔ ہمارا موبائل ''ان باکس'' بھی آپ جناب کی ظرافتوں سے کچھ یوں فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔

ایک بچہ پیدا ہوتے ہی نرس سے بولا ''موبائل ہے کیا؟''

نرس بولی ''ہے تو سہی لیکن تو کرے گا کیا---؟''

بچہ بولا ''جہاں سے آیا ہوں وہاں مس کال مارنی ہے کہ میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔''

☺ امتحان میں سوال تھا کہ چیلنج کیا ہے؟ سردار جی نے پورے صفحات خالی چھوڑ کر آخر میں لکھا۔

''باپ کی اولاد ہے تو پاس کر کے دکھا--- یہ ہے چیلنج!''

☺ ایک گھر میں جڑواں بچے پیدا ہوئے تو ایک پڑوسن نے کہا ''ہائے ہائے، ملک کے حالات کیسے ہو گئے کہ بچے بھی اب اکیلے آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔''

☆ زلف دراز کٹ گئی یہ شارٹ ہو گئی
چوٹی کٹا کے دو شیزہ سمارٹ ہو گئی
ہر چیز رفتہ رفتہ ہو جائے گی چھوٹی
بالوں سے یہ بیماری اسٹارٹ ہو گئی

☆☆

اس دورِ ابتلاء میں کہ جس میں کہیں سے بھی کوئی خوشی کی خبر نہیں آئی، ہمارے اور آپ کے لئے یہ بات کسی خوشخبری سے کیا کم ہے کہ ہمیں اور آپ کو بیٹھے بٹھائے ایک ''ماموں'' مل گئے ہیں جو خیر سے ''گرو'' بھی ہیں، گرو ماموں (بھائی لوگ) کے شگوفے دیکھئے۔

☺ پہلے وہ میری گرل فرینڈ تھی تو میں بولتا تھا اور وہ سنتی تھی، پھر وہ میری منگیتر بنی تو وہ بولتی تھی اور میں سنتا تھا، اب جبکہ ہم میاں بیوی ہیں تو ہم دونوں بولتے ہیں اور سارا محلہ سنتا ہے۔

☺ ''شیر جب تین دفعہ دھاڑتا ہے تو پتہ ہے کیا ہوتا ہے؟''

''نہیں پتہ---؟''

''تو سوچو--- اور سوچو--- خیر چھوڑو میں بتاتا ہوں۔ ٹوم اینڈ جیری کارٹون شروع ہو جاتے ہیں۔

☺ جنگل میں ایک انوکھا واقعہ رونما ہوا کہ ایک نوعمر بکری اور ہاتھی کا افیئر چل نکلا۔ ایک دن بکری نے شرماتے بل کھاتے ہوئے اپنے بوائے فرینڈ سے کہا کہ اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر رشتے کے لئے بھیجو، ہاتھی نے گھر والوں کو بھیجا، بات چلی اور کچھ میل ملاپ کے بعد ''لڑکی والوں'' نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ وجہ کھوجنے پر معلوم ہوا کہ لڑکی والوں کا کہنا تھا، اور تو سب کچھ ٹھیک ہے لڑکے کا قد کاٹھ بھی خوب ہے لیکن بس دانت ذرا بڑے ہیں۔

☺ عاصم محمود (پریشان 420) چاند کا ایک درخشاں ستارہ، بے انتہائی شریر تیز بلا کا ایس ایم ایس Send کرنے میں ایک دم ماسٹر! اِدھر آپ نے عاصم کو کوئی ایس ایم ایس Send کیا اُدھر کھٹ سے جواب حاضر--- نہایت مصدقہ اطلاع کے مطابق عاصم کی عمر عزیز ماشاءاللہ صرف 24 برس ہے اور صاحبو! اس اطلاع کی صداقت پر ہمیں تو ایک پرسنٹ بھی شبہ نہیں ہے آپ عاصم کے شوخ و شنگ ایس ایم ایس ملاحظہ کریں آپ کو بھی نہیں رہے گا۔

ابھی کچھ ہی روز ہوئے عاصم نے ہمیں اپنا نمبر Send کر کے ''ہدایت'' کی کہ میرا یہ نمبر دس انتہائی خوبصورت اور سمارٹ لڑکیوں کو Send کرو، ان شاءاللہ دس دن میں تمہیں بہت کیوٹ سی بھابی ملے گی لیکن وائے قسمت، ہم اپنے روایتی ''تساہل'' کے باعث یہ ''نادر موقع'' گنوا بیٹھے وگرنہ تو اب تک ہم ایک کیوٹ سی بھاوج پا چکے ہوتے--- یونہی ایک شام عاصم نے ہمیں ہولا کے رکھ دیا۔

''مجھے پولیس نے پکڑ لیا ہے، مجھ پر تو خوبصورت لڑکیوں کے قتل کا الزام ہے لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں تو اُن کی طرف دیکھ کر صرف مسکرایا تھا لہٰذا قاتل تو میری مسکراہٹ ہوئی نا---؟''

اسی طرح ایک لڑکا لڑکی کے راز و نیاز عاصم نے کہیں سے سماعت کئے تو فی الفور ہم سے شیئر کیئے۔

لڑکا: (لڑکی سے نہایت رومان پرور لہجے میں) تمہاری آنکھیں جھیل سی ہیں۔

لڑکی: (شرماتے ہوئے) چھوڑو بھی---!

لڑکا: تمہارے بال گھٹاؤں سے ہیں۔

لڑکی: (مزید شرماتے ہوئے) چھوڑو بھی---!

لڑکا: تمہارے دانت موتیوں جیسے اور تمہاری چال ناگن سی ہے۔

لڑکی: او جان! اب چھوڑو بھی---!

لڑکا: (ہنستے ہوئے) اتنی دیر سے ''چھوڑ'' ہی تو رہا ہوں۔

☆☆

عاصم کو ''گندے'' ایس ایم ایس کرنے میں بھی خوب مہارت حاصل ہے۔ ایک بار ایک نہایت گندا ایس ایم ایس Send کرنے سے پہلے عاصم نے ہمیں خبردار کیا اور Send کرنے کے بعد پوچھا بھی ''تھا نا گندا؟''--- یہی سوال ہمارا آپ سے بھی ہے۔ ایس ایم ایس ملاحظہ ہو۔

ایک بار ایک لڑکی پھسل کر نالی میں جا پڑی۔ کالی کالی کیچڑ سے اُس کے سفید براق سے کپڑے کالے ہو کر رہ گئے۔

مذکورہ بالا ایس ایم ایس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ عاصم کا موضوعِ سخن ہمہ وقت لڑکیاں ہی ہوتی ہیں--- ہرگز نہیں بلکہ یہ تو ہماری اپنی شرارت ہے کہ جو ہم نے چن چن کر ایسے ایس ایم ایس آپ کے سامنے رکھے سو اس تاثر کو زائل کرنے کے لئے عاصم کے چند مزید ایس ایم ایس پیشِ نظر ہیں۔

سردار جی سموسے کے اندر کا میٹریل کھا رہے تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولے کہ ڈاکٹر نے باہر کا کھانے سے منع کیا ہے۔

''مصیبت مول لینے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی غلط وقت پر درست بات کہہ دے۔''

☆☆

عقل کیا ہوتی ہے؟--- آسمان نے کہا بہت بلند ہوتی ہے۔ ساگر نے کہا، بہت گہری ہوتی ہے اور آپ نے کہا--- ''ہیں وہ کیا ہوتی ہے؟''

☆☆

سمیرا ڈھونڈتی ہے اب کسی کپتان کا رشتہ
غنیمت سے جو مل جائے اُسے دربان کا رشتہ
جوانی ڈھل چکی ہے، اور اب وہ یاد کرتی ہے
کبھی ملتان کا رشتہ، کبھی مردان کا رشتہ
کئی اُمیدوار آئے مگر ٹھکرا دیئے کہہ کر
مجھے تو چاہئے، امی! کسی سلطان کا رشتہ
سمیرا سے کہو، یارو! کہ افریقہ چلی جائے
کہ مشکل ہے ملے اب اس کو پاکستان کا رشتہ

کچھ ادھر کی، کچھ ادھر کی

☆ شاہد اطہر

پنجابی اسٹیج ڈرامہ

اخلاقیات کی سطح پر پنجابی اسٹیج ڈرامہ جس طرح انحطاط پذیر ہوا ہے' اُس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ امتیاز علی تاج' خواجہ معین وغیرہ نے بڑی جانفشانی کے بعد اسٹیج ڈرامے کو اُس وقت مقام دلایا جب فنونِ لطیفہ میں صرف فلم کا دور دورہ تھا۔ اُس وقت ڈرامے میں کوئی مقصد ہوتا تھا' کوئی پیغام ہوتا تھا۔ 80ء کی دہائی میں ڈرامہ لاہور میں شروع ہوا تو اُدھر کراچی میں عمر شریف' معین اختر وغیرہ وغیرہ نے مزاحیہ ڈراموں کی وباء پھیلا رکھی تھی۔ لاہور میں سہیل احمد' امان اللہ' مستانہ' شوکی خان' روبی انعم' شیبا حسن' انور علی اور دیگر نے رنگ بھر رکھے تھے۔ پندرہ سال خوب ڈرامہ چلا۔ پھر کراچی میں ڈرامہ دم توڑنے لگا تو عمر شریف جیسے فنکار نے لاہور کا رُخ کر لیا...... دو تھیٹروں کی جگہ کئی تھیٹر بن گئے۔ اداکاروں کی گروپ بندیاں ہوگئیں' مقابلہ بازی شروع ہوگئی۔ آگے بڑھنے کی دوڑ چل پڑی' ہر جائز اور ناجائز حربے اختیار کئے جانے لگے اور پھر ڈراموں میں نرگس آ گئی...... یہاں پر ہمارا مقصد ڈراموں کا تاریخی جغرافیہ بیان کرنا نہیں ہے' اِس کے لئے ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم فقط یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج کل اسٹیج ڈراموں کا کیا حشر ہو چکا ہے۔ یہ بیان کرنا کچھ اتنا مشکل بھی نہیں کیونکہ اگر ہم آپ کو فقط ایک ڈرامے کا احوال بتا دیں تو آپ ایک لاکھ ڈراموں کو خود ہی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ سب کے سب ایک ہی پیٹرن پر ہوتے ہیں' بس تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے...... آیئے' پہلے اسٹیج ملاحظہ فرمائیں۔

ڈرامہ ہال پہلے سینما ہال ہی ہوا کرتے تھے۔ فلموں کا زوال جب سے شروع ہوا' کراچی کے سینما ہال شاپنگ سنٹرز میں اور لاہور کے ڈرامہ ہال میں تبدیل ہوگئے...... اسٹیج ایک ہی طرح کا ہوتا ہے جس میں صوفے پڑے ہوتے ہیں اور کچھ دیگر سامان' یعنی ڈرائنگ روم کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ صوفوں وغیرہ کے سامنے خاصی جگہ کو خالی رکھا جاتا ہے جس کا مقصد اداکاروں کی بیہودہ حرکات کے لئے جگہ چھوڑنا ہوتا ہے اور پھر نرگس نے بھی تو آنا ہوتا ہے...... اُس نام نہاد ڈرائنگ روم کے پانچ چھ راستے ہوتے ہیں۔ اُلٹے ہاتھ پر مین داخلہ' سیدھے ہاتھ کچن کو جاتا راستہ' تین چار کمروں کو جاتے راستے' وہیں سیڑھیاں بھی بنی ہوتی ہیں۔ ایک سیدھے ہاتھ کو جاتی ہے' دوسری اُلٹے ہاتھ کو اوپر جانے کا سندیسہ دے رہی ہوتی ہیں مگر دراصل وہ میک اپ روم میں جاتی ہیں جہاں ہیروئن نے بار بار کپڑے تبدیل کرنے ہوتے ہیں۔ ڈرامہ کا ہدایتکار بھی وہیں بیٹھا ہوتا ہے' پروڈیوسر بھی وہیں ہوتا ہے ہمراہ چند دوستوں کے جن کا ڈرامے میں سرمایہ لگا ہوتا ہے۔ شاید اِسی لئے سیانے لوگ کہتے ہیں کہ ایک اسٹیج پر دو ڈرامے چل رہے ہوتے ہیں...... اداکاروں کے کرداروں کے بارے میں کچھ بھی بتانا بہت مشکل ہے۔ بھلا جو چیز اداکاروں کو نہ پتہ ہو وہ ہم کیسے بتا سکتے ہیں؟

ہر ڈرامے میں کئی نوکر ہوتے ہیں۔ مالک' مالکن ہوتے ہیں' لڑکیاں ہوتی ہیں' اُن کے عاشق ہوتے ہیں۔ بھانڈ ہوتے ہیں۔ دودھ گھی بیچنے والی حسینائیں ہوتی ہیں اور کئی جگت باز ہوتے ہیں۔ یہ کسی تماشبین کو نہیں پتہ ہوتا کہ کون سا کردار کب آئے گا اور کون سے دروازے سے برآمد ہوگا۔ پہلے بڑے اداکار جیسے سہیل احمد برآمد ہوتے تھے تو ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا تھا' اب نرگس کے آنے سے ہال تالیوں سے گونج اُٹھتا ہے...... کرداروں میں اداکار ضرور ہوتے ہیں' اداکاروں میں کردار نہیں ہوتے۔ ہر کردار نے ایک جملہ ''میرے نال ویاہ کر لے'' (مجھ سے شادی کر لو) ضرور بولنا ہوتا' خواہ اُس کا پوتا بھی ڈرامہ دیکھنے آیا ہوا ہو۔ یہ جملہ آپ کو اتنی مرتبہ سنائی دے گا کہ آپ بور ہو جائیں گے۔ عورتیں بھی یہی جملہ بولتی دکھائی دیں گی جو اِس مکالمے سے حریف ہو جاتا ہے۔

اداکارہ: مجھ سے شادی کر لو میں زیرو میٹر ہوں۔

اداکار: جاؤ' جھوٹی! تم نے میٹر پیچھے کروا رکھا ہے۔

جس قدر ذو معنی جملے بولے جاتے ہیں

بھی قاصر ہیں۔ اسٹیج پر اداکار ایک دوسرے کی ماؤں کو بھی نہیں بخشتے۔ تمام گندے لطیفے اسٹیج پر زندہ پیش کئے جاتے ہیں۔ گالی گلوچ اِس قدر عام ہے کہ لگتا ہے جیسے "حرامزادہ، کنجر" وغیرہ صرف شریف لوگوں کی زبان ہے۔ خواتین کی زبان سے یہ سب سن کر تماشبین زیادہ مسرور ہوتے ہیں۔ شیبا حسن نے اِن جملوں کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔

آیئے اب ذرا موجودہ دور کی اسٹیج ہیروئینز اور ہیروز پر گفتگو ہو جائے...... یوں لگتا ہے کہ ساری کی ساری کوٹھوں سے اتر کر اسٹیج پر آ گئی ہیں اور اس کا سہرا اسٹیج ڈراموں کی ملکہ سپر اسٹار نرگس کے سر ہے۔ نرگس نے اپنے کیریئر کا آغاز فلموں سے کیا۔ گوری چٹی، لمبی، خوش شکل اور سب سے بڑھ کر رج کے بے شرم...... دماغ کی انتہائی تیز، فلموں کے زوال کو بھانپ کر ڈرامے کا رُخ کر لیا اور اپنے ہمراہ اپنی اداکارہ بہن کو ڈراموں میں لے آئی۔ پھر شروع ہوا موجودہ دور یعنی طوفانِ بدتمیزی۔ نرگس نے ڈانس شروع کیا اور دیدار سے بھی کروایا، جس سے اسٹیج ڈرامہ مجرے میں تبدیل ہو گیا۔ نرگس نے اپنے کھلے گلے کی پوشاکوں کا کھل کر استعمال کیا اور ترسے ہوئے تماش بینوں کو مزے کروا دیئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خواتین نے ڈرامہ دیکھنا چھوڑ دیا اور مردوں نے یلغار کر دی۔ دو سو روپے والا ٹکٹ ہزار کا ہو گیا، جو بلیک میں دو ہزار کا ملنے لگا...... پھر کیا ہوا۔ اگر درجن بھر ہال تھے تو سب کے سب ہاؤس فل رہنے لگے۔ ڈرامے میں اسٹوری وغیرہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ چند بھانڈ قسم کے لوگ چھچھوری جگت بازی کرتے، پھر نرگس آ جاتی اور اس نرگس کے لئے ہی لوگ آتے تھے۔ ڈانس گانا ہوتا، لوگ باقاعدہ اُن پر نوٹوں کی بارش کرتے۔ ایک ڈرامہ میں کئی کئی ڈانس شامل ہو گئے۔ کچھ احتجاجی صدائیں بھی بلند ہونا شروع ہو گئیں، تماش بینوں میں جھگڑے بھی ہونے لگے۔ اگلی سیٹیں بلیک ہونے لگیں۔ دولت کی ریل پیل ہونے لگی جس کا سب سے نمایاں فرق ہیروئینز کے لباس پر پڑا۔ پہلے ہیروئن کا ڈھکا چھپا لباس دو سو کا ہوا کرتا تھا مگر نرگس کا ایک جوڑا جو ڈھکا چھپا بھی نہ تھا، بیس ہزار کا بننے لگا۔ دونوں بہنوں نے عالیشان کوٹھیاں بنائیں۔ اِن کی دیکھا دیکھی نئی آنے والیوں نے بھی سب کچھ وہی کرنا شروع کر دیا مگر نرگس کو کوئی پیچھے نہ چھوڑ سکی۔

اسٹیج پر ناچ گانے کی فحاشی پھیلانے کے لئے نرگس کے علاوہ دلگر گانوں کی بھی اشد ضرورت تھی، پنجابی فلمی گانوں نے یہ مسئلہ فوری حل کر دیا کیونکہ پنجابی فلمی گانوں میں تو کوئی بات ڈھکی چھپی بھی نہیں۔ نور جہاں نے بھی کچھ ایسے گانے گائے ہیں اور شروعات میں اُن سے ہی کام چلایا جاتا تھا، پھر پنجابی فلموں میں نصیبولال آ گئی مگر نصیبولال کو ہم

بے قصور ہی سمجھتے ہیں۔ اُسے تو یہ فلمی دُنیا کے لوگ جو گانا دیں گے، وہی گائے گی نا! آپ ایک ہزار ڈرامے دیکھ لیں، گانے وہی ہوں گے۔ جی ہاں، ہر ڈرامے میں وہی گانے۔ پھر وہی گانے، پھر وہی گانے۔ پھر وہی نرگس، پھر وہی دیدار...... ہم وہ گانے بھی آپ کو بتائے دیتے ہیں مگر اِن گانوں کے بول لکھنے کی ہم میں تاب نہیں۔ جنہوں نے سن رکھے ہیں، وہ سمجھ جائیں گے اور باقی "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی"...... بہرحال، صاحب! جس طرح فلموں میں سب کچھ ہو جانے کے بعد پولیس آتی ہے، اِسی طرح انتہائی ننگے پن کو عام کرنے کے بعد حکومت حرکت میں آ گئی اور ڈرامے والیوں کو اِس حد تک راضی کر لیا ہے کہ وہ اپنے جسموں کو بغیر کپڑوں کے نہ دِکھائیں لہٰذا اب انہوں نے کپڑوں میں خود کو عریاں کر رکھا ہے...... دیگر ڈرامہ کسی کی سمجھ میں آتا ہی نہیں۔ ایک گھر میں ہر طرف سے لوگ گھس آتے ہیں اور ایک دوسرے کی ماں بہن ایک کرتے رہتے ہیں۔ پولیس بھی ڈراموں کے اندر ڈرامے کرتی ہے مگر وہاں تو پولیس بھی بھانڈ ہی ہوتی ہے۔ لڑکے بمقابلہ لڑکے یا مرد بمقابلہ عورتیں اشعار کا مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ مثلاً عورت کہے گی......

کہاں تھے آپ زمانے کے بعد آئے ہیں
میری عمر ڈھل جانے کے بعد آئے ہیں

مرد جواب دے گا۔

"میں اُس وقت بھی آیا تھا مگر بہت رش لگا ہوا تھا۔"

پنجابی ڈراموں میں نوکر، مالک کی جتنی چاہے بے عزتی کر دے۔ ماں کا رُتبہ تو وہاں کسی بیسوا سے بھی کم ہے...... اکثر مقالمے اِس طرح کے ہوتے ہیں۔

"اوئے، تم شیداں کے بیٹے ہی ہو، نا جو دودھ والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی؟"

"یار! تیری ماں کے کتنے شوہر ہیں۔"

"تیری ماں نے اے کی چول ماری اے۔"

اِسی قسم کے ڈائیلاگ باپ کے لئے بھی بولے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ ڈرامہ کرنیوالوں کا ہی کلچر ہوگا۔ اب تو ہیروئن گانا ڈانس شروع کرتی ہے تو چار چھ لڑکے بھی آسمان سے نازل ہو کر ڈانس پیش کرتے ہیں۔ اب یہ ہیروئن اگر نرگس یا دیدار یا ایک آدھ اور ہے تو الگ بات ہے ورنہ ہاس بازار سے امپورٹ کیا ہوا "گوشت کا پہاڑ" ہے اور وہ گانا گا رہی ہے "لک پتلا" (کمر پتلی) تو واقعی ڈرامہ مزاحیہ ہی معلوم پڑتا ہے۔

پہلے ڈراموں میں جسمانی ربط مرد، عورت میں نہیں ہوا کرتا تھا۔

یعنی ہاتھ پکڑنا' گلے لگانا وغیرہ اور اب یہ باتیں معمولی ہیں' ڈرامہ دیکھنے والے بھی آوازیں کس کر اپنی شمولیت کا احساس دلاتے ہیں۔ ایک سین ملاحظہ فرمائیں...... ڈرائنگ روم میں لڑکا کھڑا ہے۔ اچانک ایک حسین لڑکی جس نے کم از کم دس ہزار کی پوشاک پہن رکھی ہے اور تین ہزار کا میک اپ کر رکھا ہے اور چالیس ہزار کی جیولری سے لدی ہے' ہاتھ میں گڑوی (دودھ کا برتن) اُٹھائے اسٹیج پر وارد ہوتی ہے۔ ہال میں موجود تماشائی دل کھول کر تالیوں سے اُس کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ منیار اسٹیج کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کیٹ واک کرتی ہے' اس دوران وہ لڑکے کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔ پھر اچانک اس سے گفتگو شروع ہوتی ہے۔

لڑکی: اوئے' تم کون ہو؟

لڑکا: تمہارا ہونے والا شوہر!

لڑکی: اپنا منہ شیشے میں دیکھا ہے؟

لڑکا: شادی میں منہ کا بھلا کیا کام؟...... بس تم مجھ سے شادی کرلو۔

لڑکی: مَیں لڑکی ذرا اور قسم کی ہوں۔

لڑکا: کیوں' تم نے اپنا میٹر پیچھے کر رکھا ہے؟

لڑکی: اوٗ منحوس کی اولاد! میں زیرو میٹر ہوں۔

لڑکا: لگتی تو نہیں پر شاید ہو۔

لڑکی: تمہارا باپ کدھر ہے؟

لڑکا: کیوں' اُس پاگل کا کیا کرنا ہے؟

لڑکی: مَیں اس سے شادی کر کے تمہیں بیٹا بناؤں گی۔

لڑکا: تم دودھ والی ہو' نا؟...... چلو پھر کرلو شادی میرے باپ سے' دودھ تو مَیں ہی پیئوں گا' نا!

یہ کہہ کر لڑکا لڈیاں ڈالنے لگتا ہے' ہال میں بیٹھے لوگ زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ ایک آدھ جوش جذبات میں اِسے ماں کی گالی بھی دے دیتا ہے' لڑکا ہال کی طرف اُسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

''اگر بہن کا اتنا ہی خیال تھا تو پھر ڈرامے میں کام کرنے کیوں بھیجا تھا۔''

ہال میں بیٹھے لوگ اور زیادہ زور سے تالیاں بجاتے ہیں اور پھر نہ جانے اُس ہیروئن کو کیا ہوتا ہے کہ اونچی ہیل کی جوتی اُتار کر سائیڈ پر رکھتی ہے' دوپٹہ اُتار کر وہ پھینکتی ہے اور جسم کے انگ انگ کی نمائش کے ساتھ ڈانس شروع کر دیتی ہے۔ ناچ گانا ختم ہوتے ہی وہ کہتی ہے۔

''یہ گڈوی (دودھ کا برتن) مجھے اُٹھا دو' مجھے اپنا دودھ بھی بیچنا ہے۔''

اِس مکالمے کا لڑکا جو جواب دیتا ہے' وہ لکھا نہیں جا سکتا...... ایک اور مکالمے والا سین ملاحظہ فرمائیں۔ ہیروئن ابھی ابھی ناچ گا کر فارغ ہوئی ہے۔ گانا وہ تھا ''وے گجراوے'' اب اِس کا مکالمہ شروع ہوتا ہے۔

لڑکا: جانو! میرے ساتھ شادی کرلو۔

لڑکی: میری کچھ شرائط ہیں۔

لڑکا: بولو' جانو!

لڑکی: تمہیں تھوڑا سا بے غیرت بننا پڑے گا۔

لڑکا: تھوڑا تو مَیں پہلے ہی ہوں' اور کیا کرنا ہوگا؟

لڑکی: تم بچے پیدا نہیں کرواؤ گے۔

لڑکا: ٹھیک ہے' جانو!

لڑکی: یہ کام مَیں خود ہی کرلوں گی اور تمہاری غیر موجودگی میں جو لوگ آئیں' اِن کو تم کچھ نہیں کہو گے۔

نمکین شعرونہ

کیا ملے گا اُنہیں چرانے سے
میرے جوتے تو ہیں پرانے سے

فائدہ کیا ہے سر کھپانے سے
کچھ ملے گا نہیں زمانے سے

گر نہ نیت بھرے جو آدم کی
پیٹ بھرتا نہیں ہے کھانے سے

بے سرے گانے والے سن سن کر
کھجلی ہوتی ہے گنگنانے سے

لوڈشیڈنگ کے اِن اندھیروں میں
ملنے آؤ کسی بہانے سے

تم کو شوگر کہیں نہ ہو جائے
صبر کے میٹھے پھل کو کھانے سے

سر میں خشکی کے ساتھ جوئیں ہیں
مجھ کو لگتا ہے سر کھجانے سے

✿ محمد کامران شہزاد
محلہ معصوم آباد ضلع بھکر
موبائل: 0333-6846299

لڑکا حیران ہوتا ہے اور ہال والے تالیاں بجاتے ہیں۔

لڑکا: ٹھیک ہے، جانو!

لڑکی: گھر کے خرچ کا کبھی نہیں پوچھو گے۔ تم دال کے پیسے دے کر جایا کرو گے اور گھر میں گوشت، مرغی، مچھلی پکے تو اعتراض نہ کرنا۔

لڑکا: لو جانو! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟

لڑکی: مجھے مجرا کرنے کی کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔

لڑکا: جانو! آج کل کافی سختی ہے، تم بند چھٹی لے لینا۔

لڑکی: بس ٹھیک ہے، جانو! تم میری مرضی کے مطابق ہو...... تم شادی کی تیاری کرو میں اپنے سابقہ شوہروں سے طلاق لے کر آتی ہوں۔

لڑکا حیران ہوتا ہے اور ہال والے اور زیادہ شور سے تالیاں بجاتے ہیں۔

میک اپ، لباس کے علاوہ حسین لڑکیاں بھی ڈراموں میں دِکھائی دیتی ہیں اور سب کی سب بہترین رقص کرتی ہیں کیونکہ سب کا تعلق وہاں سے ہے جہاں بچی کے پیدا ہونے پر ڈھیروں مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ مرد فنکاروں کے بیک گراؤنڈ کا پتہ نہیں چلا البتہ اُن کے بھانڈ پن سے یہی لگتا ہے کہ اکثر نرگس اور دیدار کے بھائی بند ہیں اور اُن کے منہ سے حرامی اور گنجے کے بچے کے القاب سن کر مسکراتے رہتے ہیں۔ ڈرامہ میں سب سے زیادہ مکالمے ایک دوسرے پر تنقید بھرے ہوتے ہیں۔ مثلاً ''اوے تیرا منہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں نمائش لگ جائے''...... ''تو اتنا کالا کیوں ہے، کیا تیری پیدائش کے وقت بلیک آؤٹ تھا؟''

تو صاحبو! پنجابی ڈرامے کے بارے میں آپ کو یہ کچھ بتانے کا مقصد یہ تھا کہ ڈرامہ بہت دگر ہو چکا ہے۔ اخلاق سوز حرکتیں، ذومعنی جملے لہٰذا اب یہ ڈرامہ دیکھنے کے قابل نہیں رہا، آپ ہرگز نہ دیکھئے گا۔ ہم اب اجازت چاہتے ہیں کیونکہ نرگس کے نئے ڈرامے کی CD خرید کر لائے ہیں، ذرا اطمینان سے اُسے دیکھ لیں۔

ائیر ہوسٹس

بچپن میں ٹونی کرٹس کی مشہورِ زمانہ مزاحیہ فلم ''بوئنگ بوئنگ'' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ فلم ائیر ہوسٹسز کے متعلق تھی اور ہیرو صاحب نے ایک ہی وقت میں تین عدد ائیر ہوسٹسز سے چکر چلایا ہوا تھا، ایک فلائٹ پر جاتی تو دوسری لینڈ کر رہی ہوتی۔ وہیں سے ہمیں بھی ائیر ہوسٹس سے دلچسپی ہو گئی۔ ہمارے ایک کلاس فیلو جس کا نک نیم بی تھا، ہم پر جان چھڑکا کرتی تھی اور ہمارا ایک عزیز ترین دوست شانی اُس پر دل و جان سے فدا تھا، یوں یہ تکون چل رہی تھی۔ ایف ایس سی کرنے کے بعد بی اچانک غائب ہو گئی۔ کئی سال بعد شانی نے ایک دن انکشاف کیا۔

''شاہد بابو! بی یاد ہے؟''

''ہاں، یاد کیوں نہیں ہے...... دو سال ساتھ پڑھے ہیں اور پھر تم تو مرتے تھے اُس پر......''

''اب تم بھی مرو گے......''

''ٹھیک ہے، مر جاتے ہیں مگر ایسا کیا ہوا ہے؟''

''وہ ائیر ہوسٹس بن گئی ہے۔''

''ہائیں، سچ...... کب...... تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

''میں کل ائیر پورٹ گیا تھا اپنے چچا کو چھوڑنے، وہیں اُس کو دور سے جاتے ہوئے دیکھا۔ یونیفارم میں اتنی اسمارٹ لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں......''

''لیکن، یار! اب وہ ہمیں گھاس نہیں ڈالے گی۔''

پھر واقعی اُس نے ہمیں گھاس نہیں ڈالی...... ہم دونوں نے بڑے جتن کر کے ایک مرتبہ اُس سے ملاقات کر ہی لی۔ بظاہر وہ اچھی طرح ملی، ہم لوگوں کو چائے بھی پلائی مگر انداز ایسا تھا جیسے کوئی ایم این اے اپنے علاقے کے ووٹروں کو جیتنے کے بعد ملتا ہے۔ ہم لوگوں نے بھی جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس کی پرواز اُونچی ہو گئی ہے اور اب وہ ہم بچوں کی پہنچ سے بہت دور جا چکی ہے۔

دِن مہینوں میں، مہینے سالوں میں بدل گئے۔ ہم کراچی میں رہتے تھے، ماموں جان نے شریکِ حیات لاہور میں ڈھونڈ نکالی۔ شادی کے اگلے دِن ہم دُلہن کے ساتھ جہاز میں واپس کراچی جا رہے تھے کہ شومئی قسمت، اِس میں ائیر ہوسٹس جو ہماری لائن میں سروس دے رہی تھی، وہ بی تھی۔ اُسے پتہ نہیں کیا ہوا، سیدھی ہمارے پاس آئی اور انتہائی بے تکلفی سے گویا ہوئی۔

''کمینے! تو نے شادی کر لی......؟''

''ہمیں کاٹو تو خون نہیں۔ پھر وہ ہماری ایک دِن کی دُلہن سے مخاطب ہوئی۔

''آپ حیران نہ ہوں۔ یہ میرا کلاس فیلو تھا، میرا بڑا دِل توڑا تھا اِس نے...... خیر اب شادی کر لی ہے تو آپ کو مبارک ہو۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ''بےغم'' نے کوئی خاص ردِعمل شو نہ کیا، فقط دھیمے سے بولیں۔

''صرف کلاس فیلو اور اتنی بے تکلف......؟''

ہم نے اُن کو دوسری باتوں میں لگا لیا لیکن آج عرصے بعد پتہ چلا کہ وہ اُس بات کو کبھی بھی بھولی نہ تھیں۔

کراچی میں ہی ہم نے اِرم نام کی غریب سی لڑکی کو ٹیلی فون آپریٹر

کی نوکری دی تھی۔ وہ پتلی دُبلی سی لڑکی اچھے نقش و نگار رکھتی تھی اور عزائم بھی بلند تھے۔ جلد ہی وہ ہم سے بے تکلف ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ بتا دیتی کہ فلاں فلاں صاحب اُس کو لائن مار رہے ہیں' چھوٹے موٹے مشورے بھی لیا کرتی۔ ایک دِن بولی۔

''سر! مَیں ائیر ہوسٹس بننا چاہتی ہوں...... کیا مَیں بن سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں...... تعلیم تمہارے پاس ہے' شکل صورت کی اچھی ہو۔ ٹرائی کرو۔''

''آپ کی جان پہچان بھی تو ہے۔''

''بھئی' تم اپلائی تو کرو' ہم بھی کہہ سن لیں گے۔''

اِس گفتگو کے ٹھیک چھ ماہ بعد وہ ائیر ہوسٹس بن چکی تھی اور (بلاوجہ) ہماری احسان مند بھی...... ہم سے وہ ٹیلی فونک رابطہ رکھتی۔ جب ہمارا ٹرانسفر اِسلام آباد ہوا تو طے شدہ پروگرام سے وہ فلائٹ لی گئی جس میں وہ سروس دے رہی تھی۔ پھر جب بھی اسلام آباد آتی اور وقت ہوتا تو اپنی ساتھی ائیر ہوسٹس کو بھی ہمراہ لے کر ہمارے آفس آتی۔ سارا دفتر ہمیں ٹونی کرٹس سمجھتا اور قابلِ رشک نظروں سے دیکھتا۔

ایک مرتبہ ہم انگلینڈ جا رہے تھے۔ ٹکٹ میں پیسے بچانے کی خاطر ہم نے ''ترکیو ہاوا لواری'' (کہ یہی اصل نام ہے ٹرکش ائیر ویز کا) میں سیٹ بک کروالی۔ ہمارے ہمراہ ہمارے کزن صاحب بھی تھے جن کا حلیہ ترک لوگوں جیسا ہی تھا۔ جہاز روانہ ہوا تو سروس شروع ہوئی۔ انتہائی حسین ائیر ہوسٹس آئی اور کزن صاحب سے ترکی میں کچھ پوچھا۔ کزن صاحب کو کچھ سمجھ نہ آیا البتہ انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی' وہ بھی مسکراہٹ کے ساتھ...... کچھ دیر بعد ائیر ہوسٹس ایک ٹرے لے آئی جس میں چھوٹی چھوٹی شراب کی ڈھیروں بوتلیں تھیں۔ اب ہم دونوں میں کوئی بھی نہ پیتا تھا۔ کزن صاحب نے گھبرا کر ''نو' نو'' کہا اور انکار میں گردن بھی ہلائی۔ اُس نے پھر ترکی میں کچھ پوچھا' کزن صاحب نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ سوچ کر کہ اب جو کچھ لائے گی وہ جوس وغیرہ ہوگا مگر وہ بدبخت چار بئیر کی بوتلیں لے آئی۔ اِس مرتبہ کزن کے انکار نے اِس کے چہرے پر ناگواری سی پیدا کر دی۔ اب وہ ہم سے مخاطب ہو کر کچھ بولی...... ہم سمجھ چکے تھے کہ میڈم کو انگلش کا ایک لفظ بھی نہیں آتا اور اِسی لیئے وہ ترکی بول رہی ہے۔ ہم نے بھی ضد میں اُسے اُردو میں کہا۔

''چائے......''

وہ مسکرا کر چلی گئی اور ہم دونوں بھی مسکرانے لگے کہ دیکھو اب کیا لاتی ہے؟...... پھر ہم حیران رہ گئے کہ وہ فوری چائے لے آئی تھی' زیادہ لطف بعد میں آیا جب ہمیں پتہ چلا کہ ترکی زبان میں چائے کو چائے ہی کہتے ہیں۔

جہاز نے کراچی سے استنبول اور وہاں سے لندن جانا تھا۔ اب استنبول سے ائیر ہوسٹس سروس دے رہی تھی۔ ہم نے چھوٹتے ہی اُسے چائے کا کہا اور اُس نے چائے حاضر کر دی لیکن اب نیا مسئلہ شروع ہو گیا۔ وہ لڑکی انگلش جانتی تھی مگر ہمارے چائے طلب کرنے پر وہ ہم سے ترکی زبان میں بات کرنے لگی۔ ہم نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ ہم ترک نہیں ہیں بلکہ پاکستانی ہیں اور پاکستان میں بھی چائے کو چائے ہی بولتے ہیں...... آگے کا سفر بڑا ہی خوشگوار ہو گیا۔ اُس لڑکی نے ہمیں غیر معمولی توجہ دینی شروع کر دی' ہم نے کزن سے کہا کہ تم پر مرتی ہے۔ کزن بولا کہ نہیں' تم پر مرتی ہے۔ فیصلہ ہوا کہ چلو اِس سے ہی پوچھ لیتے ہیں اور پھر ہم نے اِس سے پوچھا۔

''مس! تم نے ہمیں خصوصی توجہ دی ہے' اِس کی کوئی خاص وجہ ہو تو بتاؤ؟''

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور کہا۔ ''کیوں نہ دیتی...... تم پاکستانی مسلم ہو' میرے بھائی ہو......''

زبان میری ہے بات اُن کی

- حسن ایک قدرتی سفارش جس سے بہت کام نکلتے ہیں---- عمران سہیل بوبی
- ☆ جیسے ایزی لوڈ' جوتے کپڑے اور بینک بیلنس۔
- زندگی ایک انجکشن کی طرح ہے جو درد بھی دیتی ہے مگر آرام بھی---- توصیف احمد
- ☆ زندگی نہیں---- عورت----!
- عورت صرف اُس وقت مرد سے نفرت نہیں کرتی جب وہ سو رہی ہوتی ہے---- توصیف احمد
- ☆ کیوں سوئے جذبات کو جگاتے ہو؟
- آج کل کی لڑکیاں بڑی خدا ترس ہیں' ہر کسی کو دِل دے دیتی ہیں---- نازن 421
- ☆ اور ساتھ ہی ایزی لوڈ اور میک اَپ کا بل بھی دے دیتی ہیں۔
- صد شکر کہ اسلام نے عورت کو عزت دی ورنہ مرد اسے کوڑے کی طرح اُٹھا کر باہر پھینک دیتے---- نازیہ ناز نازی
- ☆ اب اسلام کی یہ بات بھی مان لو کہ مرد کو عورت پر اہمیت دی گئی ہے۔
- اکثر نوجوان اس لئے بھی چشمہ چڑھائے رکھتے ہیں کہ لڑکیوں کو بغور دیکھ سکیں---- نایاب رضوی
- ☆ اللہ اللہ کر' اب تو نوجوانوں کو دیکھنا چھوڑ دو۔
- حقیقت یہ ہے کہ آج مرد اور عورت کے درمیان صرف لباس کا فرق باقی رہ گیا ہے---- نایاب رضوی
- ☆ دھوکہ نہ کھانا' دُنیا بہت ترقی کر چکی ہے۔

ڈاکٹر محمد جمیل' عبدالحکیم

اپنی ایئر لائن کا توڑ کر ہی بیکار ہے۔ اُس میں تو شاید ریورس میرٹ لاگو ہے۔ یعنی جتنی بدشکل ہو اُسے سب سے پہلے چنا جائے البتہ نخرے ایسے ہیں جیسے حسینہ عالم ہوں وہ بھی رواں سال کی...... ہم نے ہزاروں مرتبہ جہاز کا سفر کیا مگر ہمیں صرف ایک واقعہ نے متاثر کیا' آپ بھی سن لیں۔

ہماری نشست سے آگے والی نشست پر پشتو فلموں کے ایک مقبول ہیرو بیٹھے تھے اور جہاز کی ہیروئن اُن کو کوئی خاص لفٹ نہ دے رہی تھی بلکہ شاید وہ ہیرو صاحب کو نظر انداز کر گئی تھی۔ ہیرو صاحب نے آتے جاتے اُسے ایک آدھ مرتبہ کچھ کہا۔ وہ میڈم شاید پشتو فلمیں نہیں دیکھتی تھیں یا روایتی اکڑ تھی۔ بہرحال' ہیرو صاحب نے تنگ آ کر باقاعدہ اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔

''تم کو دو مرتبہ پانی کا بولا' لاتی کیوں نہیں ہو؟''

ہوسٹس بولی۔ ''ہاتھ چھوڑو......''

ہیرو صاحب کا ہیرو جاگ اُٹھا' بولے۔ ''نہیں چھوڑتا...... جو کرنا ہے' کرلو......''

ہوسٹس نے اُسے زور کا جھانپڑ رسید کیا اور دھاڑی۔ ''یہ تمہاری فلم کا سیٹ نہیں۔ اب اگر غنڈہ گردی کی تو ایئر گارڈ کے حوالے کر دوں گی۔''

ہیرو کا سارا ہیرو نکل گیا۔

''کیتھے پیسفک'' ہانگ کانگ کی ایئر لائن کا نام ہے۔ یہ ایئر لائن ہانگ کانگ کی برطانیہ سے جان خلاصی اور چین میں دوبارہ شمولیت کے باوجود رواں دواں ہے۔ جن لوگوں نے ہماری طرح اِس فضائی کمپنی سے سفر کیا ہے' وہ جانتے ہوں گے کہ سب سے باصلاحیت ایئر ہوسٹس اِسی ایئر لائن کی ہیں' فوراً پہچان لیتی ہیں کہ کس مسافر کے ساتھ کس طرح برتاؤ کرنا ہے۔ پاکستانیوں کو تو بھائی تک بنا لیتی ہیں۔ اُن کے حسن سلوک کا ایک چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ آپ خود کرلیں۔

ہماری نشست کے ساتھ ایک جاپانی خاتون اور اُس کی 8 سالہ بچی بیٹھی ہوئی تھی۔ وائن کا گلاس جس پر جہاز کا لوگو بنا ہوا تھا' بچی کو اس قدر پسند آیا کہ اُس نے اُسے ٹشو میں چھپا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ ہمارے ساتھ ایئر ہوسٹس نے اُس کی اِس حرکت کو دیکھ لیا۔ وہ کچھ دیر بعد آئی اور ویسا ہی گلاس اُس بچی کو دیتے ہوئے بولی۔

''پیاری بچی! یہ گلاس ہماری طرف سے تمہارے لئے چھوٹا سا تحفہ ہے۔''

ہم دِل میں ''واہ واہ'' کر اُٹھے اور سوچا کہ اگر ایسا واقعہ ہماری ایئر لائن میں ہوتا تو ہماری ایئر ہوسٹس اِس سے کہتی۔

''چل نی' چوریئے...... ساڈا کلاس کڈ......''

بھارت میں چونکہ کبھی بھی برقعہ کلچر آنے کا اندیشہ نہیں ہے اِس لئے وہاں ایئر ہوسٹس خاصی معقول ہوتی ہے۔ ایئر انڈیا میں سفر کرتے ہوئے یہ ہی لگا جیسے وہاں کے سلیکٹر اندھے نہیں ہیں۔ وہاں تو ایئر ہوسٹس مسافروں سے اِس طرح بات کرتی تھی جیسے اُسے احساس ہو کہ اِن مسافروں کی وجہ سے ہی اُسے تنخواہ ملتی ہے۔ سنا ہے' وہاں بھی ایک قباحت ہے۔ چونکہ وہاں ایئر ہوسٹس میرٹ پر آتی ہے اور شکل صورت سے لے کر ذہانت تک کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے لہٰذا ایئر ہوسٹس بنتے ہی کچھ عرصے میں وہ سہاگن ہو جاتی ہے اور وجہ یہ ہی ہے کہ سیانے امیر لڑکے فوراً اُن سے شادی رچا لیتے ہیں...... یہاں لڑکے سے مراد 40 سال سے اوپر کے لڑکے ہیں۔

ملیشیا کی ہوائی کمپنی کا نام ''ملیشین ایئر لائن سسٹم'' ہے۔ ہم نے جب بھی اِس ایئر لائن سے سفر کیا' ہمیں لگا جیسے تمام ایئر ہوسٹسیں لڑکیاں نہیں بلکہ مشینیں ہیں۔ اُن کی ٹریننگ ہی کچھ ایسی ہے کہ قطعی مشین کے انداز میں کام کرتی ہیں۔ جہاز میں پریڈ دیکھنی ہو تو آپ اِس ایئر لائن سے سفر کر دیکھیں۔ کھانا پینا بھی روبوٹ کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ ہم اُن کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر گمان ہے کہ جن بیچاروں کی یہ بیویاں بنتی ہوں گی' اُنہیں یہی محسوس ہوتا ہوگا جیسے اُن کا بیاہ کسی روبوٹ سے ہوگیا ہے۔

اب مختصر سا ذکر یورپ اور امریکہ کی ایئر ہوسٹس کا بھی ہو جائے۔ وہ تمام کی تمام بڑی پروفیشنل ہوتی ہیں۔ امریکن ایئر ہوسٹس تو ڈیوٹی کے وقت اپنے سارے کے سارے بوائے فرینڈز کو فراموش کر دیتی ہے نئے بوائے فرینڈ بنانے کی خاطر...... جرمن ہوسٹسیں اچھی ہوسٹس کے ساتھ ساتھ کپتان کی نورِ نظر بھی ہوتی ہے۔ برطانوی شکل کی اچھی ہوتی ہے نہ اخلاق کی' بدد ماغی میں پاکستانی کی طرح ہوتی ہے۔ فرنچ کے کیا کہنے' ہر طرح زبردست...... بہرحال' صاحب! یہ بھی ایک دُنیا ہے مگر ہم اندر کی بات بتائے دیتے ہیں کہ یہ دُنیا اتنی حسین ہرگز ہرگز نہیں جتنی نظر آتی ہے۔

ٹی وی چینلز

ہمارے خیال میں مزاح پاکستانیوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔ پہلے مزاح کا مزاج مختلف ہوا کرتا تھا۔ انگریز خود پر ہنسنے کو مزاح کہتا تھا' پاکستانی سکھوں پر ہنسنے کو مزاح کہتے تھے۔ پاکستان کی آزادی میں بھی انگریزوں نے مزاح کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور ہمیں ایسا ملک دیا جس کے درمیان سولہ سو کلومیٹر کا دُشمن پڑتا تھا۔ محمد حسین آزاد اگرچہ

سنجیدہ مذاق رکھتے تھے مگر وہ اِس مذاق کو سب سے پہلے (تادمِ تحریر آخری بھی) بھانپ گئے تھے۔ نجومی نہ ہونے کے باوجود انہوں نے کہہ دیا تھا کہ یہ ملک 25 سال سے زیادہ یکجا نہیں رہ سکے گا اور حیران کن بات ہے کہ عین 25 سال بعد ملک دو ٹکڑے ہوگیا۔ اب فرانس کا باشندہ ''نوسٹر ڈیمس'' ایسی پیشین گوئی کرتا تو ساری دُنیا واہ واہ کرتی۔ بہرحال' قیامِ پاکستان کے وقت لکھنے پڑھنے کا ذوق و شوق موجود تھا۔ مزاح کے حوالے سے خدا کا شکر ہے کہ مشتاق احمد یوسفی ہمارے حصہ میں (PIB کالونی کراچی کے رہائشی بن کر) آ گئے اور یہی مزاح پر ''قائداعظم'' کا سب سے بڑا احسان تھا۔ (یہاں قائداعظم سے مراد محمد علی جناح نہیں بلکہ وہ والے قائداعظم ہیں جسے حرفِ عام میں کرنسی نوٹ کہتے ہیں) کیونکہ یوسفی صاحب بنک سے منسلک ہو کر غمِ روزگار سے مبرا ہو گئے اور مزاح کی وہ خدمت کی کہ تمغہ حسن کارکردگی کا اعزاز پایا۔ اُن کے علاوہ شفیق الرحمٰن اور کرنل محمد خان جیسے لوگوں نے مزاح کو خوب خوب پیش کیا۔ اُس زمانے میں ٹی وی ہوا ہی نہیں کرتا تھا لہٰذا فلم سب سے مقبول تفریح کا ذریعہ ہوا کرتی تھی اور اس میں مزاح کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ پھر 1964ء میں اُس بیماری نے جنم لیا جسے ٹی وی کہا جاتا ہے۔ اِس ٹی وی نے اور چیزوں کے ساتھ ساتھ مزاح کو بھی گھر گھر پہنچا دیا اور حق بات ہے کہ اس قدر معیاری مزاح جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ''تعلیم بالغاں'' اُسی زمانے کا شہکار ہے...... یہ اکلوتا چینل مکمل حکومت کے کنٹرول میں ہوتا تھا' صرف وہی دکھایا جاتا جو حکومت چاہتی ہے۔ عوام بھی اتنے سادہ تھے کہ خبرنامہ کو سنجیدہ شے سمجھ کر دیکھا کرتے تھے۔ قسم لے لیں کہ اگر خبرنامہ میں یہ کہا جاتا' ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے تو عوام اُس کو بھی سچ ہی سمجھ لیا کرتے تھے۔

اب چلتے ہیں موجودہ دور میں...... روشن خیال حکمرانوں نے بہت سے ٹی وی چینلز کی اجازت دے دی اور پھر شروع ہوا موجودہ دور۔ اب موجودہ دور میں چینلز کی بھرمار ہے اور دیکھا جائے تو یہ مزاح سے بھرپور ہیں۔ ان چینلز کے سب سے مقبول پروگرام ''لائیو شوز'' ہوتے ہیں۔ اور یہ سب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں اتنے آگے نکل چکے ہیں کہ بیچاری حکومت اب سوچ میں پڑی ہے کہ ان کو واپس کیسے لایا جائے؟...... سب پروگراموں کا ذکر خیر کرنا ممکن نہیں البتہ چند ایک کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ پہلے یہ بتاتے چلیں کہ ہر پروگرام میں عموماً ایک میزبان ہوتا ہے' دو ایک حکومت کے فنکار ہوتے ہیں' چند دل جلے حزبِ اختلاف سے ہوتے ہیں' ایک آدھ غیر جانبدار مگر جانبدار صحافی ہوتا ہے۔ پہلا پروگرام جیو نیوز کا ''کامران خان کے ساتھ'' ہے اور اِس کی مقبولیت کا اندازہ اُن اشتہاروں سے لگایا جا سکتا ہے جو اِس پروگرام سے پہلے' درمیان میں اور پھر آخر میں چلتے ہیں۔ اِس پروگرام کا فارمیٹ سب کو پتہ ہے۔ کامران خان نے جس کو پروگرام میں شامل کرنا ہوتا ہے' اُسے وہ لائن پر لے آتے ہیں۔ کچھ غلط نہ سمجھئے گا' فون لائن پر لے آتے ہیں...... اِن کے بعد آتے ہیں حکومتی سوپر اسٹار یعنی وزیر اطلاعات محمد علی دُرانی...... دھیمے لہجے میں بات کرتے ہیں اور ہمارے اندازے میں ایک دِن میں 12 گھنٹے بولتے ہیں۔ پتہ نہیں' کسی دِن گینز بک آف ورلڈز ریکارڈ والے اُن کو اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیں...... وزیر قانون وصی ظفر صاحب دوسرے سوپر اسٹار ہیں' انہیں بھی بہت زیادہ بولنا پڑتا ہے۔ ہر وقت ''نمبر ایک بات اور نمبر دو بات'' کرتے ہیں۔ سچ ہے کہ آج کل سرکاری نوکری بھی بہت مشکل ہوتی جا رہی ہے...... اِن کے بعد حکومتی نظر میں ولن یعنی حزبِ اختلاف کے سوپر ڈوپر اسٹار ہیں چودھری اعتزاز احسن جو شومئی قسمت' چیف جسٹس کے وکیل بھی ہیں۔ اعتزاز احسن جس ڈرامے میں نہ ہوں' وہ بہت پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔

ہم ''کامران خان کے ساتھ'' پروگرام کو مس نہیں کرتے کیونکہ مزاح سے ہمیں بڑا لگاؤ ہے...... پروگرام میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جو ہمارے لئے نئی ہو' بالکل فلموں کی طرح کہ سب کی اسٹوری پہلے ہی سمجھ آ جاتی ہے مگر ساری لذت پیشکش میں ہے۔ مثلاً کرکٹ ٹیم کے ورلڈ کپ

حماقت سلامت

مبارک ہو شادی' رفاقت سلامت
رہے قید یہ بامشقت سلامت
ارے چھوڑیئے' کیسی منصوبہ بندی
رہے آپ کی یہ طبابت سلامت
مرا کام کیسے رُکے گا کہیں پر
دفاتر میں ہے رسمِ رشوت سلامت
ارے تم تو تقریر کرنے گئے تھے
نہ کپڑے ہیں سالم' نہ صورت سلامت
وکیلوں کا ہوتا رہے گا گزارہ
رہے رشتہ داروں میں نفرت سلامت
شرافت اگر اِک حماقت ہے عاصی
رہے حشر تک یہ حماقت سلامت

✿ مرزا عاصی اختر' میرپور خاص

میلے میں جانے سے پہلے کامران خان نے عمران خان سے پوچھا کہ اس ٹیم کے بارے میں کیا خیال ہے تو عمران خان نے کہا کہ میں اس ٹیم سے بہت پُراُمید ہوں' یہی فائنل تک آسانی سے پہنچ جائے گی۔ پھر ٹیم کی ابتدائی ناکامی اور واپسی کے بعد عمران خان نے اُسی پروگرام میں کہا کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا' حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ٹیم پرفارم نہیں کرسکتی اور چونکہ ہم اس پروگرام کے مستقل ناظر ہیں سو ہم نے اس مزاح کو بہت انجوائے کیا...... پھر قانون کے لمبے ہاتھوں پر وزیر قانون کا تبصرہ مزاح کا ایک شہکار ہی تو تھا یا وزیر اطلاعات کا سیاستدانوں کے بار بار کہنا آپ اس معاملے کے سیاسی رنگ دے رہے ہیں' مزاح نہیں تو اور کیا ہے؟ اب سیاستدان سیاسی بات نہیں کرے گا تو کیا نصیبولال کے گانے گائے گا؟...... مزید براں کسی بھی دورِ حکومت میں صحافی کا آزادیِ صحافت پر شکوہ کرنا مزاح نہیں تو اپنے ساتھ مذاق ضرور ہے۔ اس پروگرام پر پابندی لگائی گئی تو کامران خان نے دُعاؤں کا سلسلہ شروع کردیا۔ دُعائیں اب غائب ہیں کہ پروگرام پھر سے رواں دواں ہے۔ اس لائیو پروگرام میں جتنے بھی فنکار شرکت کرتے ہیں' وہ اپنا موقف صحیح ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ نوکری پکی رہے...... فی الحال چونکہ جیو چینل کی بات ہو رہی ہے تو اسی کے دوسرے پروگرام ''کیپٹل ٹاک'' پر کچھ روشنائی پھینکتے ہیں۔ اس کے اینکر پرسن ہیں معروف صحافی حامد میر۔ اس پروگرام میں باقاعدہ مہمانوں کو مدعو کیا جاتا ہے اور پھر ایک شوشا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مزاح کے دلدادہ لوگوں کو وہ وہ تبصرے سننے کو ملتے ہیں کہ ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس میں بھی فنکار گنے چنے وہی ہوتے ہیں جو ہر چینل کے ہر پروگرام میں چھائے ہوئے ہیں۔ جھلک ملاحظہ ہو...... چیف جسٹس کی عدالت میں پیشی کا موقع ہے۔

حامد میر: کیوں' جناب وزیر صاحب! آج کے جلسے میں کتنے آدمی تھے؟

وزیر صاحب: دو تین سو۔

مخالف: پندرہ ہزار کو دو تین سو کہنے والوں کو اپنی آنکھوں کا علاج کروانا چاہے۔

وزیر صاحب: چلیں' تین سو نہیں تو پانچ سو ہوں گے...... نمبر ایک' اس سے حکومت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نمبر دو' اس سے عدلیہ کو بھی فرق نہیں پڑ سکتا۔ آپ لوگ آئینی مسئلے کو سیاسی بنا رہے ہیں۔

مخالف: آپ نے اللہ کو جان دینی ہے یا صدر صاحب کو؟

وزیر: نمبر ایک' سب نے اللہ کو جان دینی ہوتی ہے۔ نمبر دو' کسی نے صدر کو جان نہیں دینی ہوتی۔

حامد میر: مَیں نے تعداد کے بارے میں پوچھا تھا؟

مخالف: عوام سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ اگر حکومت رکاوٹیں کھڑی نہ کرتی تو ہم ڈیڑھ لاکھ کا جلوس لے آتے۔

وزیر: حکومت نے کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کی۔ اگر آپ کو سڑک پر سگنل کے اشارے بھی رکاوٹ محسوس ہوتے ہیں تو آپ اسمبلی میں تحریک استحقاق پیش کردیں...... ویسے بھی آپ کو ریڈ لائٹ نظر نہیں آتی۔

مخالف: معاف کیجئے گا' ریڈ لائٹ آپ کو تو نظر آتی ہے؟

وزیر: جی ہاں...... الحمدللہ دونوں آنکھیں سلامت ہیں' ریڈ لائٹ نظر آتی ہے۔

مخالف: پھر آپ سمجھ لیں' آپ آؤٹ ہو چکے ہیں۔ کرکٹ میں ریڈ لائٹ کا مطلب آؤٹ ہوتا ہے۔

وزیر: رہنے دیں' آپ کو کرکٹ کی الف بے کا تو پتہ نہیں ہے' یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری بات' آپ کے دور میں کرکٹ ٹیم کتنے ورلڈ کپ لے آئی تھی؟

حامد میر: ناظرین! ہم یہاں بریک لیتے ہیں اور ملتے ہیں بریک کے بعد۔

بریک میں اشتہاروں کی بھرمار ہوتی ہے اور ظاہر ہے' ان اشتہاروں کی آمدن سے ہی یہ سارے ٹی وی چینل چل رہے ہیں۔ بریک میں ایک ناظر یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ آخر وہ کیا دیکھ رہا تھا' قوم کو' دُنیا کو آخر کیا پیغام مل رہا ہے؟...... بریک ختم ہوتی ہے۔

حامد میر: ناظرین! آپ بریک سے پہلے دیکھ رہے تھے کہ حکومت اور حزبِ اختلاف میں جلوس کے شرکا کی تعداد پر بھی اختلاف ہے۔ ہم اسی بحث کو آگے چلاتے ہیں...... ہاں تو جناب مخالف صاحب! آج آپ کی ریلی میں کتنے لوگ تھے؟

مخالف: جی' تعداد سے گھبرا کر وزیر صاحب کرکٹ کی باتیں کرنے لگے ہیں...... اِن کے دور میں جتنی عبرت ناک شکست ملی' اُس کی مثال نہیں ملتی۔ اب مَیں آتا ہوں تعداد کی طرف......!

وزیر صاحب: اب ویسٹ انڈیز میں پچ خراب بنا دی گئی ہو تو اس کے بھی ہم ذمہ دار ہیں کیا؟...... نواز شریف کے دور میں تو ہم بنگلہ دیش سے بھی ہار گئے تھے۔

مخالف: لیکن فائنل میں پہنچ چکے تھے۔

حامد میر: ناظرین! ہم بات کر رہے تھے کہ چیف جسٹس کے پیشی پر کتنے لوگ جلوس میں شامل تھے' آپ نے حکومت کا اور حزبِ اختلاف دونوں

کا موقف سنا۔ یہاں ہم لیں گے ایک چھوٹا سا بریک...... اور بریک کے بعد اِس موضوع پر مزید گفتگو کریں گے۔

مگر ہم اِس پروگرام پر مزید گفتگو نہیں کریں گے۔ یہ پروگرام ہمیں صرف اِس لئے پسند ہے کہ خاصہ مزاحیہ پروگرام ہے اور یہ جیو جان چھوڑے تو کسی اور طرف چلیں۔ ڈاکٹر شاہد مسعود زبردست آدمی ہیں' خوب تحقیق کر کے پروگرام پیش کرتے ہیں...... پہلے ''اے آر وائی ون ورلڈ'' میں تھے اور اب پیش کرتے ہیں ''میرے مطابق'' اور وہ بھی جیو میں...... چونکہ یہ پروگرام ''میچور'' سا پروگرام ہے' شاید اسی لئے اِس میں جن سے بھی بات کی جاتی ہے' اِن میں اکثریت ریٹائرڈ لوگوں کی ہوتی ہے۔ ریٹائرڈ جج' ریٹائرڈ جرنل' ریٹائرڈ ہیرو' ہیروئن وغیرہ وغیرہ...... یہ لوگ خوب بال کی کھال نکالنے کی کوشش کرتے ہیں' کھال نکل آتی ہے مگر بال وہیں کا وہیں رہ جاتا ہے۔ اِس پروگرام میں اگر عمران خان آجائیں تو ہم سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ اُن کو کس حیثیت میں مدعو کیا گیا ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ یہ تو ریٹائرڈ کرکٹر ہیں جو اَب سیاست کھیل رہے ہیں...... اِس پروگرام میں جو بھی آتا ہے' وہ یہی ثابت کرتا ہے کہ وہ صحیح تھا' باقی سب غلط اور ہمیں اِن باتوں میں مزاح ہی مزاح ملتا ہے۔

ڈاکٹر شاہد مسعود کی ایک ہونہار شاگردہ محترمہ فائزہ داؤد ہیں جو اُن سے اے آر وائی کے زمانے میں سیکھا کرتی تھیں اور اب ''فوکس'' کے نام کے پروگرام میں دُنیا کو سکھا رہی ہیں۔ شکل وصورت کی اچھی ہیں اور اِن کا پروگرام ''کامران خان کے ساتھ'' جیسا ہی ہے لیکن خاتون ہونے کی وجہ سے ڈانٹ کم پڑتی ہے۔ ریٹائرڈ لوگ تو بیٹی کہہ کر بھی مخاطب کر لیتے ہیں' کم بوڑھے فائزہ ہی کہتے ہیں۔ لائیو پروگرام پر رابطے موبائل فون سے ہوتے ہیں لہٰذا موصوفہ کو کافی چیخنا پڑتا ہے...... اِن تمام پروگراموں میں ایک مسئلہ بہت ہوتا ہے کہ اگر سامنے والا اپنی آواز ٹی وی پر سننا چاہ رہا ہو تو پھر ایکو کی وجہ سے بات کرنا مشکل ہوتی ہے۔ فائزہ بی کو بات کاٹنے کا شوق بھی بہت ہے لہٰذا یہ نظارہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ بیچ میں نیا سوال داغ دیتی ہیں اور مہمان بولے جا رہا ہوتا ہے' پھر جب اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس سے دوسرا سوال بیچ میں ہی کر دیا گیا ہے تو اُس کی شکل مرحوم رنگیلے جیسی بن جاتی ہے۔ اِس پروگرام کی بھی خاص بات یہی ہے کہ ہر مہمان اپنی قابلیت جھاڑتا ہے سوائے اُن چند کے جو حقیقت میں قابل ہوتے ہیں۔ اِن کی تعداد آٹے میں نمک برابر ہوتی ہے مگر حق یہ ہے کہ تھوڑا سا نمک ہی سواد دیتا ہے۔

اے آر وائی ون ورلڈ کے کاشف عباسی کے کیا کہنے...... ہم اُن کی قابلیت سے زیادہ اُن کی برداشت کی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ پروگرام ''آف دی ریکارڈ'' ہے جس کی ہر بات آن ریکارڈ ہوتی ہے۔ اِس پروگرام کا ٹائٹل ہی حکومت کے لئے خوشگوار نہیں کہ اِس میں صدر مشرف کو اُس وقت کے وزیراعظم نواز شریف کو سلوٹ مارتے دیکھا جا سکتا ہے مگر اِس میں ہمیں تو کوئی خاص بات دِکھائی نہیں دیتی۔ ضیاء الحق بھی تو بھٹو کو سلوٹ مارا کرتے تھے...... اِس پروگرام کے سوپر اسٹارز بھی وہی ہیں جو ہر پروگرام کی رونق ہیں یعنی چودھری اعتراض احسن...... معاف کیجئے گا' اعتزاز احسن۔ وزیر قانون وصی ظفر' وزیر اطلاعات محمد علی دُرانی' خواجہ سعد رفیق وغیرہ وغیرہ...... اور بھی بہت سے ہیں جن کا شمار سپر اسٹارز میں ہوتا ہے۔ دوسرے درجے کے بھی بہت سے اسٹارز ہیں لیکن کوئی ڈرامہ سپر اسٹارز کے بغیر ہٹ نہیں ہوتا۔ اِس پروگرام کا نچوڑ اگر ایک جملے میں کرنا مقصود ہو تو وہ ہے ''مَیں نہ مانوں''...... کاشف عباسی سے ہر کسی کو شکایت ہوتی ہے کہ وہ پروگرام کے دوران اشتہاروں میں بڑا وقت ضائع کرتے ہیں مگر جس ڈرامے میں سوپر اسٹارز ہوں گے' وہاں اشتہارات تو ملیں گے ہی' نا!

کسی مزید بڑے ڈرامے (ٹاک شو) کا ذِکر کرنے سے پہلے ہم تھوڑے چھوٹے ڈراموں کا ذِکر بھی کر دیں تا کہ اُن کی حق تلفی نہ ہو۔ مثلاً انڈس ٹی وی پر معروف کرکٹر سکندر بخت اپنے بخت کو بخت آور بنانے کے چکر میں لگے رہتے ہیں' خوب بولتے ہیں۔ یہ پروگرام قطعی غیر سیاسی ہے مگر کرکٹ کی سیاست سے بھرپور ہے۔ شومئی قسمت' اِن کو کرکٹ بورڈ کی نئی بندر بانٹ میں کچھ نہیں ملا لہٰذا نقاد بن گئے...... اس قسم کے

قصہ زن مرید اعلیٰ

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ ایک بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک میدان میں سرخ جبکہ اس کے بالمقابل دوسرے میدان میں سفید جھنڈا اگاڑ دو اور پھر اعلان کرو کہ جو آدمی بیوی سے نہیں ڈرتا' وہ سفید جھنڈے کے نیچے کھڑا ہو جائے جبکہ بیوی سے ڈرنے والے سرخ جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ سفید جھنڈے والے (یعنی بیوی سے نہ ڈرنے والے کے لئے) دس لاکھ اشرفیاں انعام دیا جائے گا —— شہر بھر کے سارے شادی شدہ مرد آتے گئے اور سرخ جھنڈے والے میدان میں جمع ہوتے گئے حتیٰ کہ بادشاہ سلامت بھی اُدھر چلا گیا' صرف ایک شخص سفید جھنڈے کے نیچے کھڑا رہا۔

مقررہ وقت ختم ہونے پر بادشاہ نے اس شخص سے پوچھا کہ کیا تو واقعی بیوی سے نہیں ڈرتا؟ تو اِس شخص نے جواب دیا۔

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ مَیں تو بہت ڈرتا ہوں [illegible]''

بادشاہ نے کہا۔ ''پھر تم سفید جھنڈے کے نیچے کیوں کھڑے تھے؟''

اُس آدمی نے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت! یہ بھی میری بیوی کا حکم تھا کہ اِدھر کھڑے رہوں۔''

روح اللہ روحؔ' مردان

پروگرام میں سرفراز نواز سپر اسٹار ہیں۔ وزیر قانون کی طرح یہ بھی زوردار بولتے ہیں، حکومت میں ہیں، نا!...... اِس قسم کا پروگرام جیو سپورٹس میں جاوید میانداد بھی کرتے ہیں اور اپنے دستخط کر کے بیٹ انعام میں دیتے رہتے ہیں۔ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ ہم سابقہ سپر اسٹارز کو نہیں پوچھتے...... مرزا اقبال بیگ کو کمنٹری کا بہت شوق ہے، وہ بھی سپورٹس پروگرام پیش کرتے ہیں اور معمولی سی بات کو بھی اِس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے کرکٹ کا چھکا یا ہاکی کا گول ہو گیا ہو۔ کسی کا حال احوال بھی ایسے پوچھتے ہیں جیسے ابھی ابھی مہمان کو ایمپائر نے غلط ایل بی ڈبلیو دے دیا ہو...... اِن پروگراموں کو لوگ بھاگ صرف اس وقت دیکھتے ہیں جب سپر اسٹارز کے پروگراموں میں اشتہارات کا وقفہ آتا ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے جب پروگرام ''پارلیمنٹ کیفے ٹیریا'' سچ مچ پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا سے پیش کیا جاتا تھا اور اُسے جیو ٹی وی کی شرمیلی عاصمہ شیرازی پیش کرتی تھیں۔ حسب اقتدار اور حسب اختلاف کو ایک ساتھ اِس پروگرام میں کیفے ٹیریا کی عمدہ چائے پیسٹریز اور کیک کھاتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ لیکن ہماری دانش میں کسی پارلیمنٹرین کا استحقاق مجروح ہو گیا کہ اُسے زیادہ کھاتے ہوئے دِکھا دیا گیا اور اُس ظالم نے پارلیمنٹ کیفے ٹیریا سے یہ پروگرام ہی بند کروا دیا۔ اب بھی یہ پروگرام تو جاری ہے مگر کچھ ردوبدل کے ساتھ۔ مثلاً پہلے کیفے ٹیریا میں ہوتا تھا تو اب سڑکوں یا اسٹوڈیو میں ہوتا ہے۔ پہلے پارلیمنٹ کے ارکان کیک پیسٹریز کھاتے نظر آتے تھے، اب بڑی بڑی کاروں میں اُترتے چڑھتے نظر آتے ہیں۔ اب دیکھیں، وہ دِن کب آتا ہے جب کسی کی ''کار'' کا استحقاق مجروح ہوتا ہے۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ عاصمہ شیرازی کو اے آر وائی ون ورلڈ والے لے اُڑے۔ یہ جوابی کاروائی تھی کیونکہ جیو والے ڈاکٹر شاہد مسعود کو اے آر وائی سے لے اُڑے تھے...... خیر، صاحب! عاصمہ شیرازی اب اے آر وائی ون ورلڈ میں آ گئی ہیں اور سڑکوں کے کنارے پارلیمنٹ والوں کو بٹھا کر ''پارلیمنٹ گیلری'' بنا بیٹھی ہیں...... اِس پروگرام میں پارلیمنٹ والوں کا حسنِ اخلاق بخوبی دیکھا جا سکتا ہے، بس آزادی صحافت میں ابھی کھلی گالم گلوچ کا رواج نہیں ہوا۔ جیو ٹی وی والوں نے وقت ضائع کئے بغیر اپنی دوسری عاصمہ، یعنی عاصمہ چودھری کو اُس پروگرام ''پارلیمنٹ کیفے ٹیریا'' میں لگا دیا ہے۔

دونوں عاصمہ اور پاکستان کے باعزت پارلیمنٹرین ان پروگرامز میں ''حقیقی کلچر'' کا عمدہ مظاہرہ پیش کرتے ہیں۔ لوگ اِن پروگراموں کو دیکھ کر روتے ہیں، ہم ہنستے ہیں کیونکہ اِن حالات میں ہنسا رونے سے زیادہ مشکل کام ہے۔

''آج'' ٹی وی اور طلعت حسین کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ''آج'' کافی عتاب میں رہتا ہے، وجہ یہی ہے کہ وہ کامیڈی زیادہ ہی دِکھا دیتا ہے۔ طلعت حسین لائیو پروگراموں کے پُرانے چمپئن ہیں اور ''لائیو ود طلعت حسین'' نام کا جاندار پروگرام پیش کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر سپر اسٹار وہی ہوتے ہیں، نمبر ایک، نمبر دو کرنے والے...... بہر حال، مزاح کے دلدادا لوگوں کے لئے اِس پروگرام کو انجوائے کرنے کو بہت کچھ ہوتا ہے البتہ حکومتی ہیروز زیادہ بول کر بھی ناخوش رہتے ہیں اور حسب اختلاف جتنا بھی بول سکیں، کچھ بھڑاس تو نکال لیتے ہیں۔

اِن تمام چینلز پر آج کل سب سے بڑا دھماکے دار شو چیف جسٹس آف پاکستان کے جلوسوں کا چلا۔ ہر چینل کی کوشش تھی کہ دوسرے پر سبقت لے جائے...... سارے راستے کا پروگرام لائیو یعنی براہِ راست دِکھایا گیا۔ جتنے لوگوں کو ہم ذِکر کر چکے ہیں، وہ سارے کے سارے اِن پروگراموں میں موجود تھے۔ گلے پھاڑ پھاڑ کر یا بول بول کر اُن کے حلق خشک ہو گئے اور ذرا اندازہ لگائیں کہ 25 گھنٹے کے جلوس کی لائیو کوریج کرنے والوں کا کیسا جلوس نکلا ہو گا، دیکھنے والوں کا بھی جلوس نکلا...... شاید وہ سوچ رہے ہیں کہ ملک میں ہنگامی حالات کا عندیہ دیا جا رہا ہے لہٰذا جتنا شوق پورا کرنا ہے، کر لو...... اِن چینلز کا ایک اور خاصہ بھی ملاحظہ فرمائیں...... CNN یا BBC میں بریکنگ نیوز یہ ہوتی ہے کہ صدام حسین پکڑا گیا یا عراق سے جنگ شروع ہو گئی یا نیویارک کے ٹاورز سے جہاز ٹکرا دیئے گئے...... پاکستان چینلز میں بریکنگ نیوز آتی ہے کہ چودھری اعتزاز احسن کی گاڑی خراب ہو گئی ہے اور چیف جسٹس کو دوسری ہرے رنگ کی گاڑی میں منتقل کر دیا گیا ہے جسے زمرد خان چلا رہے ہیں۔ دوسری بریکنگ نیوز یہ بھی ہے، گوجرانوالہ میں غبارے پھٹ گئے جو چیف جسٹس کا استقبالیہ اسٹیج بنایا گیا تھا، اِس میں آگ لگ گئی اور دو لوگ زخمی ہوئے۔

بہر حال، صاحب! ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ خود پہ ہنسنے والے ترقی کرتے ہیں۔ دیکھ لیں، میڈیا پاکستان کو ترقی کروانے میں کتنا اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اب بھی ''ہم سب اُمید سے ہیں'' مگر حضرات اُمید سے ہوں تو حیرت کی بات ہے اور اگر خواتین اُمید سے ہوں تو پریشانی کی بات ہے کیونکہ اب یہاں ہر کوئی ''جوابدہ'' ہے...... اِس عنوان کا خاتمہ کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہیں گے کہ اگر آپ ''ایک دِن جیو کے ساتھ'' گزار لیں اور اِس کے بعد اپنے اطراف کے لوگوں کو کاٹنا شروع کر دیں تو ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔

☆☆

عشق کمینہ

☆ منظور احمد اعوان

نُور اسلم خان میرا لنگوٹیا یار ہے۔ انتہائی ہنس مکھ اور زندہ دِل انسان ہے۔ میٹرک ہم نے ایک ساتھ کیا تھا، اس کے بعد وہ کمرشل کالج چلا گیا اور میں نے خواجہ فرید کالج میں داخلہ لے لیا لیکن ہمارا میل جول برقرار رہا۔ ہماری دوستی مثالی تھی جو کہ تا حال قائم و دائم ہے۔ اڈہ گلمرگ پہ اُس کا سگریٹ اور نسوار کا کھوکھا تھا جو کہ اب اچھی خاصی دُکان بن گئی ہے۔ اِس کام میں اُس نے خُوب مال کمایا، اور شادی کے بعد بچے بھی ماشاءاللہ بہت پیدا کئے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ مال کتنا کمایا تو وہ خاموش ہو جاتا ہے اور اگر بچوں کی تعداد دریافت کی جائے تو زور زور سے ہنسنے لگتا ہے جیسے کوئی لطیفہ سُن لیا ہو۔ یوں خاموشی اور ہنسی میں بات کو ٹال دیتا ہے --- فون پر کبھی کبھار اُس سے "ہیلو ہائے" ہو جاتی ہے اور جب میں چھٹی پر پاکستان ہوتا ہوں تو میرا فارغ وقت اکثر اُنہی کے پاس گزر جاتا ہے۔ گاہکوں کے ساتھ ساتھ اُس کے ہاں بھانت بھانت کے دوستوں کی آمد و رفت بھی لگی رہتی ہے جو نسوار کوٹنے، بعد ازاں اس کی ٹکویاں کاٹنے اور پھر انہیں پولی تھین کی ننھی ننھی تھیلیوں میں پیک کرنے میں اُس کی معاونت کرتے ہیں، ساتھ ہی گپ شپ بھی لگی رہتی ہے۔ ایسے ہی ملنے والوں میں سے ایک انکل پھتّو بھی ہیں۔ وہ گہری سانولی رنگت کے ہٹے کٹے سالخوردہ انسان ہیں۔ نہایت مِلنسار اور خُوش مزاج ہیں۔ میں نے اُنہیں جب بھی دیکھا، چٹخارے دار باتیں کرتے اور چہکتے ہی دیکھا ہے۔ اُس روز بھی انکل پھتّو نسوار کی ٹکویوں کو تھیلیوں میں بھرتے ہوئے لطائف سناتے اور قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔ میں اُن کے قریب چارپائی پہ بیٹھا گرما گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ نُور اسلم خان مختلف برانڈ کے سگریٹوں کو کھوکھے کی شیلفوں میں ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اُس نے اُنہیں کُریدا۔

"انکل! آپ بہت لطیفے اور دوسروں کے قصّے کہانیاں سُناتے ہیں، آج کوئی اپنی ہی بپتا سُنا دیں، نا!"

انکل پھتّو کے ہاتھوں میں قہقہوں کو یکا یک بریک لگ گئی۔

"اپنی ---" وہ گڑبڑا کر بولے۔

"ہاں، اپنی ---" نُور اسلم خان نے کہا۔ "اِتنی عمر گزاری ہے، بال یُونہی تو سفید نہیں کر لئے۔ زمانے کے سرد و گرم سے واسطہ پڑا ہوگا، کبھی کوئی عِشق وِشق بھی فرمایا ہوگا۔ اُسی کا تذکرہ کر ڈالیں۔"

انکل پھتّو نے کہ سُنا تو سوچوں کے گرداب میں ڈُوب گئے۔ کچھ دیر مُنہ اُٹھا کر خلا میں دیکھتے اور کچھ سُونگھتے رہے۔ غالباً اپنی کسی بُھولی بسری رنگین اور سنگین داستان کے اوراق یکجا کر رہے تھے۔ پھر بڑبڑا کر اس کیفیت سے نکلے۔ ان کے چہرے پہ ایک معصوم سی مُسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"لو، پھر ہمہ تن گوش ہو جاؤ ---" اُنہوں نے کہا۔ "آج میں تمہیں اپنے عِشق کی رُوداد سُناتا ہوں۔"

پھر اُن کی زبان چل پڑی اور ہاتھ بھی۔

"یہ میری نوجوانی کے ابتدائی دِنوں کی یاد ہے۔ میری عمر تقریباً سترہ یا اٹھارہ برس تھی۔ میں عباسیہ سکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ عمر اس لئے زیادہ ہوگئی تھی کہ مجھے دراصل بہت دیر سے سکول میں داخل کرایا گیا تھا۔ والد بزرگوار عباسیہ مِل میں کام کرتے تھے جہاں سُوتی کپڑا اور تولیے بنتے تھے۔ اُس مِل کے مال کی اندرون و بیرونِ مُلک بہت مانگ تھی۔ اَب تو مِل کا نام ونشان نہیں رہا، اس کی بجائے عباسیہ ٹاؤن بن گیا ہے جو شہر کے مہنگے ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اُن دنوں رحیم یار خان شہر چھوٹا سا تھا، اب اس کی وُسعت دیکھتا ہوں تو حیرت کے جھٹکے لگنے لگتے ہیں۔

ہمارا کنبہ کُل چار افراد پر مشتمل تھا۔ ابا، اماں، دادی اور میں۔ ہم غریب آباد، میں کرائے کے ایک مکان میں بسیرا کئے ہوئے تھے۔ غریب آباد، شہر کا ایک پس ماندہ علاقہ تھا۔ وہاں کی گلیاں ٹیڑھی اور کچی تھیں۔ مکان بھی بس چند ایک ہی پختہ تھے۔ بجلی بھی کسی کسی گھر میں تھی،

گیس کا تو نام و نشان نہیں تھا۔ لکڑیاں اور بھینسوں کے گوبر کی تھاپیاں بطور ایندھن استعمال ہوتی تھیں۔ گٹر لائین کی آمد بھی نہیں ہوئی تھی البتہ گندے پانی کے نکاس کے لئے نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ گھروں میں لیٹرین قدیم طرز کی تھیں۔ ان کی چھتیں نہیں تھیں، دروازے بھی ناپید تھے۔ بس ٹاٹ کے پردے تھے جو اوٹ کا کام دیتے تھے۔ اندر چولہے سے بنے تھے۔ جس کو بھی رفع حاجت کے لئے جانا ہوتا، پانی کا لوٹا بھر کے لیٹرین میں جا گھستا۔ پھر اُس چولہے پہ چڑھ کے اُکڑوں بیٹھ جاتا تھا۔ دوپہر کو نواب نامی ایک بھنگی مُنہ پہ ڈھاٹا باندھے، شانے پہ کنستر دھرے آتا اور دروازہ کھٹکھٹاتا اور پوچھا جاتا۔

''کون---؟''

آواز آتی۔ ''جمعدار---!''

''آجاؤ، بھیا---!''

اجازت ملنے پر کنستر بردار نواب اندر آتا۔ لیٹرین کے چولہے میں جمع شدہ غلاظت کو سمیٹ کر کنستر میں منتقل کرتا، چولہے پر کچھ پانی بہا کر اسے صاف کرتا اور چلا جاتا تھا۔ مہینے کے مہینے اُسے ایک معقول رقم دے دی جاتی تھی۔ ایک بار دروازے پہ دستک ہوئی۔ دادی نے کہا۔

''بیٹا! دیکھو تو کون آیا ہے؟''

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے نواب کو کھڑا دیکھا۔

''بھنگی آیا ہے---'' میں نے چلا کر خبردار کیا۔

یہ سن کر نواب کا چہرہ غُصّے سے لال بھبھوکا ہو گیا، بعد میں اُس کی اس کیفیت کے بارے میں ابا کو بتایا تو اُنہوں نے سمجھایا۔

''بیٹا! یہ لوگ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ کسی کی عزتِ نفس کو مجروح نہیں کرنا چاہئے۔ بھنگی تو دراصل بھنگ پینے والے نشئی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ حقارت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، تم جمعدار کہہ سکتے ہو۔ اس سے ان کی تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ بھی معزز لوگوں میں سے ہیں۔''

پھر تو نواب جب بھی آتا، میں ادب سے کہتا۔

''خبردار، ہوشیار، جمعدار نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔''

نواب شفقت بھری نظر مجھ پہ اُچھالتا اور کنستر لے کر گھر میں داخل ہو جاتا۔ کچھ عرصہ بعد اُسے زمیندارہ کالونی میں چند کھاتے پیتے لوگوں کے چولہے--- میرا مطلب ہے، لیٹرینیں مل گئیں اور ہمارا محلہ اُس کی بیگم فردوس نے سنبھال لیا۔ فردوس ایک ادھیڑ عمر، کالی کلوٹی، باتونی اور چڑچڑی عورت تھی، بالکل میری دادی کی طرح۔ میری دادی غصیلی طبیعت کی تھیں۔ جھگڑے تو وہ مول لیا کرتی تھیں۔ ان کی زبان میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ اُن کی تُو تُو مَیں مَیں سے صرف ابا، اماں ہی عاجز نہ تھے بلکہ محلّے کا ہر فرد اُن سے کنی کتراتا تھا۔ دادا بھی سُنا ہے کہ ان کی بک بک سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ گئے تھے۔ ان کی گرم مزاجی کے سب لوگوں نے انہیں ''ہری مرچ'' کے خطاب سے نوازا ہوا تھا۔ محلّہ میں لڑاکا خواتین کی کمی نہ تھی مگر دادی کی ٹکر کی کوئی نہیں تھی--- معاف کرنا بات ہو رہی تھی فردوس کی اور میں نے درمیان میں خوامخواہ دادی کو گھسیٹ لیا۔ فردوس، لیٹرین کے چولہے کی صفائی کرتے وقت زور زور سے بڑبڑ کرتی رہتی۔

''اِس گھر کے افراد نہ جانے کیا اَلا بَلا ہڑپ کر لیتے ہیں کہ پھر چولہے کو لبالب بھر ڈالتے ہیں۔ پورا پیپا تو اِن کے گند سے فُل ہو گیا ہے۔ اَب جا کر پہلے پیپا خالی کرنا ہو گا تب کسی اور گھر جا پاؤں گی۔''

شُکر ہے کہ دادی اُونچا سُنتی تھیں ورنہ فردوس کی تو اینٹ سے اینٹ بجا دیتیں۔ فردوس یہ ڈائیلاگ دُوسرے گھروں میں بھی بولتی تھی۔ یہ سُننے والوں کو غُصّہ تو بہت آتا تھا مگر ہر کوئی تحمل کے دامن کو تھامے رہتا تھا کیونکہ فردوس جیسی بھی تھی، اپنے کام میں طاق تھی۔ کبھی ناغہ نہیں کرتی تھی اور چولہوں کو چمکا دیتی تھی۔ کام تو اُس کا قابلِ ستائش تھا لیکن وہ اپنی بڑبڑ کی وجہ سے کسی کو بھاتی نہ تھی۔ پھر شاید کسی کی آہ لگ گئی۔ ایک روز گلی میں پڑے کیلے کے چھلکے پر پھسلی، دھڑام سے نالی میں گری اور ٹانگ تڑوا بیٹھی اور چارپائی کی ہو کر رہ گئی۔ اب اُس کی جگہ اُس کی جواں سال بیٹی شہزادی آنے لگی تھی۔

میں نے شہزادی کو پہلی بار دیکھا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ وہ تیکھے نینوں، بیضوی چہرے، درمیانے قد اور بھرے جسم کی ایک سانولی سلونی پُرکشش لڑکی تھی۔ وہ شانے پہ کنستر ٹکائے، ناک کو دوپٹے سے دبائے آتی۔ سلام کرتی، اماں اور دادی سے تھوڑی سی گپ شپ کرتی اور لیٹرین میں گُھس جاتی۔ صرف اُس کی صُورت ہی پیاری نہیں تھی بلکہ آواز میں بھی شہد جیسی حلاوت تھی حالانکہ میں ایک شریف النفس انسان ہوں، شرافت مجھ میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے مگر جب سے شہزادی کو دیکھا تھا، میرے اندر گُدبُد سی رہنے لگی تھی۔ سرگوشیاں سی سُنائی دیتی تھیں۔

''دیکھو تو، کتنی حسین لڑکی ہے۔''

پھر مجھے خود پہ اختیار نہیں رہتا تھا۔ وہ اُس وقت آتی تھی جب سکول میں آدھی چھٹی ہوتی تھی۔ میں گھنٹی بجتے ہی گھر کی جانب دوڑ پڑتا تھا۔ گھر کونسا دُور تھا، درمیان میں ریلوے لائن ہی تو تھی۔ اماں میرے لئے جلدی سے کھانا تیار کر کے رکھ دیتی تھیں۔ پھر میں چارپائی پہ بیٹھ کر بظاہر

تو کھانا تناول کرتا تھا لیکن میرے کان اُس کے قدموں کی آہٹ پہ لگے رہتے اور آنکھیں اُس کے دیدار کے لئے بچھی رہتیں۔ وہ جب بھی آ کر سلام کرتی، مجھے لگتا کہ وہ سلام مجھے کر رہی ہے۔ میں دِل ہی دِل میں وعلیکم السلام کہتا تھا۔ پھر وہ جب تک وہاں رہتی، میں چور نظروں سے اُسے ہی دیکھتا رہتا تھا، اُس کی رسیلی آواز کو سُنتا رہتا تھا۔ بعض اوقات اُسے آنے میں تاخیر بھی ہو جاتی تھی مگر میں اسے دیکھنے کے بعد ہی واپس سکول جاتا تھا۔ دیر سے سکول پہنچنے پر ماسٹر جی مولا بخش سے میری خوب سینکھائی کرتے تھے مگر میں ہنستے ہنستے وہ مار کھا لیتا تھا۔ شہزادی کی خاطر مار کھانے میں لطف آتا تھا--- میں روزانہ شدت سے اُس نازک بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن کی آمد کا منتظر رہتا تھا۔ میری دیوانگی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دِل کو کسی پل قرار ہی نہیں ملتا تھا مگر وہ ایسی ستمگر تھی کہ لفٹ ہی نہیں کراتی تھی۔

ایک روز ابا حسب معمول کام پر گئے ہوئے تھے، اماں اور دادی عید کی خریداری کے لئے بازار گئی تھیں۔ مجھے اُن کے پروگرام کا پیشگی علم تھا۔ میں آدھی چھٹی کی گھنٹی بجنے سے کافی پہلے سکول کی دیوار پھاند کر گھر آ گیا تھا۔ اب بے چینی سے شہزادی کا منتظر تھا۔ بالآخر وہ آ گئی۔ کام کی مشقت کے باعث وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ میری آوارہ نگاہیں اُس کے دِلآویز سراپے پر مٹر گشت کرنے لگیں۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ آج دِل کی بھڑاس نکال دینی ہے، پھر نہ جانے ایسا موقع ملے یا ملے--- اس نے تعجب سے ادھر دیکھا، اُدھر دیکھا۔ میں منتظر تھا کہ وہ سلام کرے گی اور مجھے پہلی بار دِل میں نہیں بلکہ زبان سے "وعلیکم السلام" کہنے کی سعادت نصیب ہوگی۔

"خالہ اور دادی کہاں ہیں؟" اُس نے روکھے پن سے پوچھا۔

میرے دل پہ جیسے کسی گدھے نے دولتی جھاڑ دی۔ مجھے اُس سے اسقدر بے رخی کی توقع نہ تھی۔

"وہ ب--- بازار گئی ہیں"۔ میں ہکلایا۔

نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا، جون کی اُس تپتی دوپہر میں بھی میرا بدن یوں لرز رہا تھا گویا جاڑے کے بخار میں مبتلا ہو گیا ہو۔ وہ مجھے نظر انداز کرتی ہوئی لیٹرین کی سمت بڑھ گئی۔ میں بھی ہانپتا پیچھے ہولیا۔ اُس نے کنستر کو شانے سے اتار کر لیٹرین کے فرش پہ رکھا۔ کنستر اور چولہے پہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ شہزادی کے پسینے کی مہک اور کنستر اور چولہے کی بُو مل کر میرے نتھنوں میں گھس گئی۔ مجھ پہ مدہوشی طاری ہونے لگی۔ اُس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

"لاؤ، میں کر دیتا ہوں۔" میں نے حوصلہ کر کے کہا۔

تاریخ لطائف

☆ قائداعظمؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک اجلاس میں شرکت کے لئے ناگپور آ رہا تھا کہ مَیں نے ایک بچے کو پاس بلایا جو بڑے جوش و خروش سے نعرے لگا رہا تھا۔ مَیں نے اُس بچے سے پوچھا کہ جو تم نعرے لگاتے ہو اُس کا مطلب کیا ہے؟ اُس بچے نے جواب دیا کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے--- چند لمحے ٹھہر کر قائداعظمؒ نے کہا۔

"اب دیکھئے کہ سات آٹھ سال کا بچہ تو یہ سمجھتا ہے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے لیکن مسٹر گاندھی کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

☆ ایک موقع پر گاندھی نے قائداعظمؒ سے دریافت کیا۔

"آپ کو کس نام سے پکارا جائے؟"

قائداعظمؒ نے کہا۔ "گلاب کو کسی نام سے بھی پکارا جائے اُس کی خوشبو میں فرق نہیں آتا۔"

☆ حمید نظامی کا بیان ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے مسلم سٹوڈنٹس یونین کے ارکان نے قائداعظمؒ سے ایک گروپ فوٹو میں شرکت کی درخواست کی۔ جب لڑکے فوٹو لینے کے لئے کھڑے ہوئے تو قائداعظمؒ نے مجھے بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ مَیں نے معذرت کرتے ہوئے ازراہِ اخلاق یہ کہتے ہوئے کہ مَیں وہابی ہوں اِس لئے فوٹو نہیں اُتروا سکتا--- جب یہ تقریب ختم ہوئی تو قائداعظمؒ نے مجھ سے پوچھا کیا تم واقعی متشدد وہابی ہو؟ مَیں نے کہا۔

"نہیں وہ بات میں نے مذاق کے طور پر کہی تھی۔"

قائداعظمؒ نے ہنس کر کہا۔ "یہ لڑکا کبھی لیڈر نہیں ہو سکتا لیڈر تو فوٹو بنوانے کے وقت دھکے مار کر آگے آ جاتے ہیں۔"

☆ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ذوالفقار علی خان گوہر اور شوکت علی تین بھائی تھے۔ شوکت علی منجھلے تھے۔ انہوں نے باون ترپن سال کی عمر میں ایک اطالوی عورت سے شادی کر لی۔ ایک بار ایک اخبار نویس نے اُن سے سوال کیا کہ آپ کے بڑے بھائی گوہر اور چھوٹے بھائی جوہر ہیں آپ کا تخلص کیا ہے؟ شوکت علی فوراً بولے۔

"شوہر---!"

☆ ملا دو پیازہ ایک دوست سے ملنے گیا تو دوست اپنے بچے کو سمجھا رہا تھا۔

"بیٹے! کبھی جھوٹ نہ بولنا، میں تمہیں وکیل بنانا چاہتا ہوں۔"

ملا دو پیازہ نے فوراً کہا۔ "اگر تمہارا بیٹا سچ بولے گا تو پھر کبھی وکیل نہ بن سکے گا۔"

☆ کسی مشاعرے میں ایک اجنبی نے فراق سے دریافت کیا۔

"کیوں صاحب! شاعرِ اعظم کے بنیادی اوصاف کیا ہونے چاہئیں؟"

دفعتاً فراق کی نظر روشن صدیقی پر پڑی جو قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے اور فراق نے ان کے ننھے منے قد پر مسکراتے ہوئے ایک نظر ڈال کر بڑی برجستگی سے کہا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعرِ اعظم کو قد آدم ہونا چاہیے۔"

☆ فراق صاحب حکیم ناطق لکھنوی کے مطب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے جیسے ہی ایک مریض کا طبی معائنہ ختم کیا، مریض نے سوال کیا۔

"کھانے پینے کے سلسلے میں کچھ پرہیز بھی بتائیں گے؟"

"گرم چیزوں سے پرہیز کیجئے گا۔" حکیم صاحب بولے۔

"گرم چیزیں---؟" مریض نے سوالیہ نظروں سے حکیم صاحب کی طرف دیکھا۔

اِس سے پہلے کہ حکیم صاحب کچھ کہیں، فراق صاحب جلدی سے بول پڑے۔

"جی ہاں، گرم چیزیں، مثلاً آگ---"

عرفان شہزاد، کوٹلی آزاد کشمیر

اُس کے تیور یکلخت یوں بگڑے جیسے کسی بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔

''خبردار---'' وہ غرائی۔ ''میرے کنستر کو ہاتھ مت لگانا۔''

اگلے روز میں ڈرا ڈرا سہما سہما رہا کہ اگر شہزادی نے میری شرافت کا بھانڈا پھوڑ دیا تو میرا کیا حشر ہوگا؟ بدنامی تو ہوگی ہی، لتریشن بھی خوب ہوگی لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آئی۔ اماں اور دادی سے علیک سلیک کی، اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا اور چلی گئی۔ یُوں میرا بھرم قائم رہ گیا۔

''یقیناً اُس کے دِل میں میرے لئے کوئی نرم اور گرم گوشہ ہے۔'' میں نے پُر امید ہو کر سوچا تھا۔ اِسی اُمید کے سہارے میں نے میدانِ عشق میں مزید پیش رفت کی ٹھان لی۔ میں نے اُس کا تعاقب کرنا شروع کر دیا مگر صرف چھٹی والے دِن---- وہ گھر گھر جاتی اور میں چلچلاتی دُھوپ میں اُس کے پیچھے پیچھے گلی گلی مارا پھرتا اور پھر اُسے اُس کے گھر تک صحیح سلامت پہنچا کر ہی لوٹتا تھا جو کہ ٹاؤن ہال کی عقبی جانب تھا۔ چند روز تو وہ خود پہ جبر کیے رہی لیکن ایک دِن حد سے زیادہ پھلائے غبارے کی طرح پھٹ پڑی۔

''کیا بیماری ہے تمہیں، کیوں پیچھا کرتے ہو میرا؟''

اُس وقت ہم بڑی نہر کے کنارے، اوڈھوں کی بستی کے پاس اُس وسیع و عریض میدان میں کھڑے تھے جہاں وہ کنستر خالی کرنے جاتی تھی۔ وہاں ہمارے علاوہ کوئی نہ تھا۔

''شہزادی! مجھے تم سے عشق ہو گیا ہے۔''

میں نے بالآخر دِل کی بات کو زبان دے ہی دی۔ اُس نے خالی کنستر کو ہاتھ میں تھاما، غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا اور رُکھائی سے بولی۔

''بکواس نہیں کرو۔''

یہ سُن کر مجھے بے حد رنج ہوا مگر اُس کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اُس کے آگے جھولی پھیلا دی اور منت ساجت پہ اُتر آیا۔

''شہزادی! اتنی ظالم نہ بنو، مجھ مسکین پہ ترس کھاؤ۔ اپنے پیار کی خیرات میری خالی جھولی میں ڈال دو۔''

''میں تمہاری جھولی میں گند تو ڈال سکتی ہوں مگر پیار نہیں---'' اُس نے غلاظت کے ڈھیر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

''تم اِتنی سنگدل کیوں ہو؟''

میں نے اُسے دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا۔ اُس نے کنستر نیچے رکھا اور میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ میرے دِل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

''آخر کار پسیج ہی گئی ہے---'' میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے سوچا۔

''خُدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو---'' اُس نے التجا کی۔ ''کیوں مجھ غریبنی کی روزی پہ لات مارتے ہو؟''

''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی روزی پر---'' میں نے غصّے سے تلملاتے ہوئے کہا ''یہ کام تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تُم شہزادی ہو، شہزادی بن کے رہو۔''

اُس نے کچھ نہ کہا، بس ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہی۔

''شہزادی! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے---'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''تُم ہاں تو کرو، میں تمہیں بیاہ کر گھر لے جاؤں گا۔ رانی بنا کر رکھوں گا، تمہیں ایسا گندا کام نہیں کرنے دُوں گا۔''

''مجھے ہرے ہرے باغ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اُس نے کھردرے پن سے کہا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟'' میں نے احتجاج کیا۔

''میرے ماما کا لڑکا ہے بلّا ---'' اُس نے بتایا ''وہ میونسپل کمیٹی میں ملازم ہے، شہر میں گٹروں کی صفائی کرتا ہے۔ اُسی بلّے سے میری منگنی ہوگئی ہے۔''

میں سُن ہو کر رہ گیا۔ مجھے لگا مجھ سے میرا سب کچھ چھن گیا ہے اور میں تہی دست رہ گیا ہوں۔

''بلّا نہیں، کتّا---!'' میں نے کڑواہٹ سے سوچا۔

وہ جانے ہی لگی تھی کہ میں چلّایا۔

''رُکو، میری بات تو سُنو۔''

وہ رُک گئی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''دیکھو، شہزادی! تم اُس منگنی کو مینگنی سمجھ کر بھول جاؤ۔ اپنی ماں کا اور اپنا سارا زیور اور کپڑے وغیرہ لے کر میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں بھی امّاں اور دادی کا زیور لے آؤں گا۔ ہم زیور بیچ کر دُنیا کی اُس نکر میں جا بسیں گے جہاں نہ بندہ ہوگا اور نہ ہی بندے کی ذات ہوگی۔ جب تک قسمت ساتھ دے گی، عیش کریں گے۔ پھر اللہ اللہ خیر صلّا۔'' میں نے اُسے اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔

اُس نے ''ہاں'' کی اور نہ ہی ''نہ'' کی۔ بس غصیلی نظروں سے مجھے گھورا اور پھر کنستر لے کر جانے لگی۔ میں نے لپک کر اُس سے کنستر چھین لیا۔

''شہزادی! میں تمہارے بغیر یہ پہاڑ سی زندگی کیسے بسر کروں گا؟'' میں روہانسو ہو کر بولا۔

اُس نے کنستر واپس چھینا اور جاتے جاتے بے رحمی سے بولی۔

''کیوں، بس میں ہی رہ گئی ہوں---غور کرو، دیکھو بھالو تمہیں اپنے آس پاس بے شمار شہزادیاں مل جائیں گی۔ کسی ایک کا ہاتھ تھام لو اور اپنی پہاڑ سی زندگی کو سکون سے گزارو۔ خود بھی جیو اور دُوسروں کو بھی جینے دو۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔

اَب میں کچھ نہیں کہتا تھا کیونکہ اُس کٹھور سے کچھ کہنا ہی فضول تھا۔ دُور ہی دُور سے نظارہ کرتا تھا۔ اُس کی دِید سے آنکھوں کو ٹھنڈک تو ملتی تھی مگر پلنے کے بارے میں سوچ کر دِل میں بھانبڑ (آلاؤ) سے جل اُٹھتے تھے۔ شہزادی مجھے اپنے پیچھے خوار ہوتا دیکھتی تو ہاتھ کا پنجا دِکھا کر اپنی نفرت کا اظہار کرتی تھی لیکن اُس کے عِشق نے مجھے ڈھیٹ بنا دیا تھا۔ میری دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ مجھے اس کی نفرت میں بھی پیار کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ میں اُس کے پنجے کے جواب میں دانت نکال دیا کرتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں ٹلنے والا نہیں تو تنگ آ کر ایک روز امّاں سے میری شکایت کر دی۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ امّاں نے بہت بُرا بھلا کہا، دادی نے خُوب کوسا۔ شام کو ابّا گھر آئے۔ اُنہیں میرے کرتُوت معلوم ہوئے تو وہ کلہاڑے کی طرح ہتھے سے اُکھڑ گئے۔ مجھے مُرغا بنا کر میری تشریف پر پورے ایک سو ایک بار اپنا پشاوری جُوتا رسید فرمایا۔ میری تشریف سُوج کر کُپّا ہو گئی۔ سیدھا بیٹھنا محال ہو گیا، درد اور جلن سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اتنا تو تھانے والے بھی نہیں مارتے ہوں گے۔ میں کئی روز تک صاحبِ فراش رہا، سکول بھی نہ جا سکا۔ امّاں اور دادی میری ٹکوریں کرتی اور سمجھاتی رہیں۔

''بیٹا! بھنگن کے پیار سے باز آ جاؤ ورنہ دُنیا ہم پر تُھو کے گی۔''

اگلے روز شہزادی نہ آئی۔ اُس کی بجائے اُس کی ماں فردوس لنگڑاتی ہوئی آ گئی۔ اُس نے اپنا کارِ منصبی ادا کیا اور جاتے جاتے خود ہی بتانے لگی۔

''شہزادی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لہٰذا کچھ دِن کام پہ میں آیا کروں گی۔''

اُس وقت دادی میرے پاس بیٹھی تھیں، امّاں نلکے کے سامنے گھڑے میں بیٹھی میلے کچیلے کپڑوں کو ڈنڈے سے کُوٹ رہی تھیں اور میں چارپائی پہ پڑا کراہ رہا تھا۔ فردوس نے میری حالت زار دیکھی تو ٹھٹک گئی اور پوچھنے لگی۔

''مُنڈے (لڑکے) کو کیا ہوا ہے؟''

وہ کچھ اُونچا بولی تھی اِس لئے دادی نے سُن لیا۔ دادی گھٹنے تھام کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

''یہ سارا کیا دھرا تیری لڑکی کا ہے---'' وہ پھٹ پڑیں۔ ''میرے پوتے کی مَت اُسی کلموہی نے ماری ہوئی ہے۔''

فردوس نے یہ الزام سُنا تو غُصّے سے تھر تھرانے لگی۔

''خبردار---ورنہ واچھیں (باچھیں) چیر ڈالوں گی۔''

دادی بھلا ڈرنے والی تھیں، اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی تھیں، شروع ہو گئیں۔

''او، کالی ڈائن! زیادہ بک بک نہ کر---'' اُنہوں نے اپنے

رُخسارِ دوست

ایک پڑیا نلے کے رکھ لی دیکھ کر اصرارِ دوست
سہہ نہیں سکتے کسی صورت بھی ہم تکرارِ دوست

مجھ کو بائیک سے گرا کر وہ رفوچکر ہوا
مَیں سڑک پر دیکھتا ہی رہ گیا رفتارِ دوست

اُس نے اِک غوطہ لگایا اور پھر اُبھرا نہیں
چھوڑ دوں ساحل پہ یا گھر لے چلوں شلوارِ دوست

مہ وشوں کو چیز کہتے ہیں مرے اِک مہرباں
اِس رعایت سے ہوئی ریشم گلی بازارِ دوست

اُس کے ابا، تایا، چاچا، خالو، ماموں ساتھ ہیں
ایسا حلقہ ہے کہ ممکن ہی نہیں دیدارِ دوست

منہ چڑانے لگتے ہیں سب لوگ مجھ کو دیکھ کر
رنگ پر ہے میرے دَم سے اِن دِنوں بازارِ دوست

آنے جانے کے لیے دَر کا تکلف ہے غلط
آیئے بل ڈوزر کر دیں مل کے ہم دیوارِ دوست

مَیں تو کوے یار سے چپکے سے واپس آ گیا
جب سنا مَیں نے کہ اپنے چل بسے بیمارِ دوست

آج تو پٹ وٹ کے جوتے چھوڑ کے بھاگا ہوں مَیں
آج مجھ کو پونے چھے سو میں پڑا دیدارِ دوست

سائے میں خوش باش بیٹھا ہے عدو درباں کے ساتھ
یاخدا! ایسے میں اِن پر آ پڑے دیوارِ دوست

کیوں جلائیں بلب عاصی کیوں کریں بجلی کا صرف
روشنی جب دے رہا ہے بزم کو رُخسارِ دوست

مرزا عاصی اختر، میرپور خاص

ناتوان بازوؤں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''فوراً سے پہلے یہاں سے دُم دبا کر بھاگ جاؤ ورنہ ہم تجھے گنجی کر کے، تیرے مُنہ پہ توا پھیر کے، گلے میں جُوتوں کا ہار ڈال کر اور تجھ جیسے ہی کسی کالے گدھے پہ بٹھا کر پورے شہر میں گھمائیں گے۔''

فردوس کے صبر کا پیمانہ غالباً اُس کے کنستر کی طرح لبریز ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے تو اپنے شانے پہ رکھے کنستر پر اپنی گرفت مضبوط کی، پھر دوسرے سے جھٹ سے دادی کی نٹی (گردن) پکڑ لی۔ دادی کی رگیں تن گئیں، آنکھیں اُبل پڑیں۔ یُوں لگا جیسے اَب تب میں اُن کی رُوح پرواز کر جائے گی۔ وہ خود کو اِس آفت سے چھڑوانے کے لئے پھڑ پھڑائیں۔ امّاں نے جو یہ ماجرا دیکھا تو لپک کر آئیں۔ آتے ہی کپڑے دھونے کا ڈنڈا فردوس کی کمر میں دے مارا۔ فردوس ''ہائے'' کا نعرہ مستانہ بُلند کر کے رگری۔ دادی کی گردن چھوٹی اور غلاظت سے بھرا کنستر اُلٹ کر اُن تینوں پہ جا پڑا۔ امّاں نے ڈنڈا پھینک دیا اور اُس کے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لئے۔ فردوس نے اڑنگا دے کر امّاں کو نیچے گرایا اور اُن پر سوار ہو گئی۔ امّاں نے بھی اُس کے بال نہ چھوڑے۔ دونوں نے گتھم گتھا ہو کر ایک دوسری کو خوب رگیدا۔ دادی کی زبان تو چلتی تھی مگر ہاتھوں پاؤں میں پہلے جیسی پھرتی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے سر اور کپڑوں پہ لگی غلاظت پُونچھ رہی تھیں، گردن سہلا رہی تھیں اور واویلہ کر رہی تھیں۔

''ہائے، مار ڈالا نامُراد بھنگن نے---''

گھر میں دھینگا مشتی، دھما چوکڑی اور چیخ و پکار کی صدائیں سُن کر وہاں محلہ بھر کے لوگ آدھمکے۔ اکثر صنفِ نازک کے اس فری سٹائل دنگل کو دیکھ دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چند ایک صُلح جُو نیک انسان بھی تھے، وہ جنگ بندی کا مطالبہ کر رہے تھے مگر دُور ہی دُور سے کیونکہ جنگجو خواتین غلاظت میں لت پت ہو کر بھوتنیاں بنی ہوئی تھیں۔

میرے نانا لالا گنجا پہلوان پیشے سے قصائی تھے۔ فنِ پہلوانی میں وہ بجلی پہلوان کے شاگرد تھے جس کا اکھاڑا ڈاکٹر ہسپتال کے سامنے تھا۔ اُنہوں نے علاقے کے کئی للّو پنجو پہلوانوں کو چت کیا ہوا تھا، دُور دُور تک ان کی شہرت کے ڈنکے ''ڈھما ڈھم'' بجتے تھے۔ امّاں کی رگوں میں اُسی پہلوان کا خون دوڑ رہا تھا، وہ بھلا کہاں مات کھانے والی تھیں، اُنہوں نے ایسے ایسے داؤ پیچ مارے کہ جلد ہی فردوس کی ہوا اُکھڑ گئی۔ امّاں کے تابڑ توڑ حملوں نے اُس کے چھکے چھڑوا دیئے۔ اُس نے یکا یک اپنا کنستر اُٹھایا، افراتفری میں گرتی پڑتی، بُرے نتائج کی دھمکیاں دیتی اور بکتی جھکتی وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی۔

شام کو ابّا گھر آئے، اُنہیں واقعہ کا علم ہوا تو غُصّے سے کانپنے لگے۔

''یہ سب تمہارے گھٹیا عشق کا نتیجہ ہے۔'' اُنہوں نے کہا۔

اَب میں مُرغا تو بن نہیں سکتا تھا، اُنہوں نے مجبوراً اُلٹا کر کے جُوتے پھر رسید کر دیئے جیسے کوئی فرض ادا کر رہے ہیں۔ خدا کسی کو ایسا جلاد باپ نہ دے۔ ان جُوتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور میں بے حال ہو گیا۔

بعد ازاں گوناں گوں مسائل نے ہمارے گھر کا احاطہ کر لیا۔ صفائی والوں نے ہمارا بائیکاٹ کر دیا۔ ہماری لیٹرین کے چُولہے کی صفائی کے لئے نہ تو نواب آتا، نہ فردوس اور نہ ہی شہزادی بلکہ اُنہوں نے دیگر تمام جمعداروں اور جمعدارنیوں کو بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔ اُن کی پوری برادری ہمارے خلاف ایکا کر چکی تھی۔ ہمیں جب بھی رفع حاجت کرنی ہوتی، ہم گھر کے پچھواڑے ریلوے لائن کے پاس بڑی بڑی اور گھنی جھاڑیوں کا رُخ کرتے تھے۔ پھر فردوس نے گھٹیاپن کی انتہا کر دی۔ وہ آس پاس کے گھروں کی صفائی کے لئے آتی تھی اور ایک آدھ کنستر ہمارے گھر کے دروازے پر خالی کر جاتی تھی۔ یہ ماجرا دیکھا تو ابّا کو بڑا غُصّہ آیا تاہم اُنہوں نے دو دِن انتہائی ضبط سے کام لیا۔ تیسرے دِن برداشت نہ کر سکے۔ شام کو وہ جمعداروں کے محلے میں جا پہنچے اور نواب کی ماں بہن ایک کر ڈالی۔ اگلے دِن شہر بھر کے جمعداروں نے مِل کر ہمارے گھر کی دہلیز پر گند کا ڈھیر لگا دیا۔ سبھی نے ایک ایک کنستر ڈال کر اس کارِ خیر میں حصہ مِلایا تھا۔ ابّا کے غُصّے کا یہ عالم تھا کہ گندی گندی گالیاں نشر کرتے اور کف بہاتے پھرتے تھے۔ وہ جمعداروں کے خلاف تھانے میں پرچہ کٹوانا چاہتے تھے مگر پڑوسیوں نے سمجھایا۔

''پولیس والوں کا کوئی دِین ایمان نہیں ہوتا۔ پرچہ کاٹنے پر رشوت طلب کریں گے، پھر دوسری پارٹی سے منہ مانگا کر کے اُنہیں چھوڑ دیں گے۔ جب وہ چھُوٹ جائیں گے تو اور زیادہ تنگ کریں گے۔ یُوں مسئلہ جُوں کا تُوں رہے گا۔ بہتر ہے کہ علاقہ کے کونسلر صاحب کے پاس چلتے ہیں۔ وہ بہت سُلجھے ہوئے انسان ہیں، مسئلے کا کوئی مُستقل اور مناسب حل نکال ہی لیں گے۔''

اُن کی بات ابّا کی عقل دانی میں آ گئی۔ وہ محلہ کی چند معتبر ہستیوں کی معیت میں کونسلر صاحب کے پاس دادرسی کے لئے جا پہنچے۔ کونسلر صاحب نے مسئلہ سُنا تو اظہارِ افسوس کیا، ہمدردی جتائی اور کہا کہ نواب کو ابھی بُلوا کر چھتر مرواتے ہیں۔

نواب اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ جمعدار برادری کا پورا جلوس ہمراہ لایا تھا۔ ان میں بچے، جوان، عمر رسیدہ، مرد و زن سبھی تھے۔ وہ سب نعرے

بُلند کر رہے تھے۔

"غُنڈہ گردی نہیں چلے گی---نہیں چلے گی۔"

کونسلر صاحب نے اُنہیں ڈرایا دھمکایا کہ اپنی اوچھی حرکتوں سے باز آ جائیں مگر وہ جوش میں تھے۔ نواب بولا

"ہم بھی عزت دار لوگ ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ہمیں ذلیل و خوار کرے۔ اگر ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی تو ہم آپ کی کوٹھی کے گیٹ کو بھی گند و گند کر ڈالیں گے۔"

کونسلر صاحب ڈر گئے۔ اُنہوں نے ابا کو مشورہ دیا۔

"چراغ دین! گند میں ہاتھ ڈالو تو ہاتھ گندے ہی ہوتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم نواب سے معافی مانگ لو۔"

مگر ابا نہیں مانے، وہ غُصّے میں تلملاتے ہوئے گھر لوٹ آئے اور آتے ہی سارا غُصّہ مجھ پہ اُتار دیا۔ بھئی، مرے ہوئے کو مارنا مردانگی تو نہیں ہوتی؟ ان کی لاتوں اور گھونسوں نے میرے جسم کی چولیں ہلا کے رکھ دیں۔ میرے وجود میں نفرت کی ایک لہر اُٹھی۔

"ابا مجھے ذرا سا اور بڑا اور خود کو بُوڑھا ہو لینے دے---" میں نے کرب سے کہا۔ "پھر دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں؟"

"کیا کرے گا تو میرا؟"

ابا نے طیش سے لرزتے ہوئے کہا اور پھر سے مجھ پر پل پڑے۔

ہمارے گھر کے سامنے گندگی کا ڈھیر بُلند سے بُلند ہوتا گیا۔ لوگ ناک دبا کر "تھو---تھو" کرتے اور ہمیں عجیب و غریب القابات سے نوازتے ہوئے ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتے تھے۔ پڑوسیوں اور رشتہ داروں نے ہمارے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ ہمارا گھر "چوہڑیاں دا گھر" کے نام سے مشہور ہو گیا تھا، معاشرے میں ہماری عزت کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ابا نے عاجز آ کر کہیں اور گھر کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر اُنہیں جلیبی چوک کے پاس تیلیوں والی گلی میں ایک مناسب گھر مل گیا۔ یہاں گٹر لائن تھی۔ بجلی اور سُوئی گیس بھی تھی۔ وہاں شِفٹ ہوئے تو جمعداروں کی عداوت سے نجات ملی۔ سُکھ کا سانس لینا نصیب ہوا۔

اُن دِنوں میں آٹھویں کا بورڈ کا امتحان دے چکا تھا۔ ہمارے نئے گھر سے کچھ فاصلے پر کالونی سکول تھا۔ نتیجہ آنے پر میں نے اسی سکول میں جماعت نہم میں داخلہ لینا تھا۔ ابا مجھے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ میرا اپنا ارادہ بھی یہی تھا لیکن شہزادی کے چکر میں پڑ کر میں ٹھیک طرح سے تیاری نہیں کر پایا تھا لہٰذا نتیجہ آیا تو میں بُری طرح سے فیل ہو چکا تھا۔ ابا کے سارے خواب بکھر گئے۔ اُنہوں نے میرے ساتھ وہی

لکی ورڈز

✿ آج کل بیوی کو سب سے زیادہ شوق شوہر کی بیمہ پالیسی کروانے کا ہوتا ہے---سیّد بدر سعید

☆ بیویوں کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ جیسا سنگل پسلی شوہر زیادہ عرصہ کارآمد نہیں رہ سکے گا۔

✿ آج کل وفا کی دیوی کے پاس وفا نہیں ہوتی---SBS

☆ ہاں موبائل، فیشن اور نخرے جو پاس ہوتے ہیں۔

✿ جب لاٹھی کی ضرورت محسوس ہوئی تو شادی کر لوں گا---(جنگلی)---آخر جنگلی بھی عورتوں کے سہارے کے قائل ہیں---روبینہ کوثر

☆ نہیں جی، پیر صاحب کبھی کبھی عورتوں کا دل رکھنے کے لئے ایسی بات کہہ جاتے ہیں۔

✿ عورتوں کو حکمران ہونا چاہئے کیونکہ محبت، رحم اور فیاضی اِس کا خاصہ فطرت ہے---ایک لڑکی

☆ زبان درازی، دھوکہ دہی، بے وفائی، فیشن اور فضول خرچی کی طرف آپ کا دھیان گیا ہی نہیں۔

✿ "ہم کسی ایسی لڑکی سے شادی کریں گے جو ہم سے زیادہ کماتی ہو"---کنوارے!"---ایک لڑکی

☆ کنواروں کی بات کا آپ نے غلط مطلب نکال لیا ہے۔ کہنے کا مطلب تھا کہ لڑکی ڈاکٹر یا وکیل ہو۔

✿ آہ جنگلی جی، جن کی بدولت مجھے مرد ذات میں کیڑے نکالنے پڑتے ہیں---ایک لڑکی

☆ آپ کیڑے نکالیں یا تعریف کریں، جنگلی جی پھنسنے والے نہیں۔

✿ پہلے خوبصورت نہیں ملتی تھی، اب مطالبہ ختم ہو گیا تو خوب سیرت نہیں ملتی---SBS

☆ تے حضور! تسی سیرت نوں کی کرنا اے؟

✿ وہ وفا کی دیوی ہے اِس لئے اُس کے پاس ہر وقت وفاداروں کا ہجوم ہوتا ہے---SBS

☆ اور ہر طرف سے آواز آتی ہے "مسٹر! فلاں نمبر بیڈ پر بھی ڈرپ لگا دیں۔"

✿ بیلنس بھجوانے کے بعد جب بات کرنا چاہی تو موبائل اپنے بھائی کو تھما کر بولی کہ نہ جانے کون تنگ کر رہا ہے---SBS

☆ آپ کے تو نصیب ہی سڑے ہوئے ہیں، اُس دن صبح صبح اپنی شکل دیکھ لی ہوگی۔

✿ کاش! دل واقعی دے دیا جاتا تو دُنیا کے مرد "بیدل" نظر آتے---ایک لڑکی

☆ پھر لڑکیاں ایک دل سینے میں اور دوسرا پرس میں لئے گھوما کرتیں۔

✿ تصویر میں عام طور پر لوگ مسکرانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں---پیر جنگلی

☆ کیونکہ تصویر میں اندر کا دُکھڑا سنایا نہیں جا سکتا۔

✿ آج کی عورت زندگی کے لئے گاڑی کا پہیہ نہیں، ڈرائیور ہے---پیر جنگلی

☆ جس پر مرد بے چارہ کہیں لٹک کر افسردگی سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔

✿ "مجنوں کے علاوہ دُنیا کے کسی مرد نے بدصورت عورت سے محبت نہیں کی---ایک لڑکی

☆ واقعی آپ جیسی ایسی کئی لڑکیوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔

✿ عورتیں جس وقت چاہیں مردوں کو فارغ کر سکتی ہیں---نسواں بل جو پاس ہو گیا---ذوالفقار علی

☆ باقی مردوں کو چھوڑیں آپ اپنی خیر منائیں۔

✿ وہ شوہر سے کبھی ناراض نہیں ہوئی، وہ ہر بات بن کہے جو مان جاتا ہے---شام

☆ واقعی آج کل آپ جیسے وفادار شوہر کہاں ملتے ہیں۔

عرفان شہزاد، کوٹلی آزاد کشمیر

سلوک کیا جو اُن کے فیل ہونے پر دادا جان نے اُن کے ساتھ کیا تھا---اِس طرح کی بے رحمانہ اور سفاکانہ ماریں کھا کھا کر میں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ ابّا نے دوبارہ آٹھویں جماعت میں داخل کرنا چاہا مگر پڑھائی سے میرا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ پڑھنا لکھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ ابّا نے تنگ آ کر مجھے لیور برل میں عام ورکروں میں بھرتی کرا دیا۔ لیور برل، ریلوے اسٹیشن کے پاس ہے۔ اَب یُونی لیور کہلاتی ہے۔ اِس میں گھی، کُوکنگ آئل، صابن، کریمیں اور شیمپُو بنتے ہیں اور چائے کی پیکنگ بھی ہوتی ہے۔ میں خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا، خوامخواہ تعلیم میں دماغ کھپانے سے نجات جو مل گئی تھی کیونکہ اب میں کماؤ پوت بن چکا تھا لہٰذا سب کو پیارا لگنے لگا تھا۔ امّاں اور دادی کی آنکھوں کا تارا تو پہلے ہی سے تھا، اَب جلالِ صفت ابّا کے رویّے میں بھی حیرت انگیز نرمی آ گئی تھی۔ اُن دِنوں اُن سب کو میرا گھر بسانے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

امّاں کے ایک چچیرے بھائی بستی نورے والی میں رہتے تھے۔ اُن کی ایک لڑکی تھی۔ اصل نام نہ جانے کیا تھا، پیار سے نوشی کہتے تھے۔ میری کبھی اُس سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ امّاں اور دادی اُس کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔ بقول اُن کے وہ گوری چٹی خوبصورت، خوب سیرت اور سگھڑ لڑکی تھی اور آٹھ جماعتیں بھی پڑھی ہوئی تھی۔ گھر والے چاہتے تھے کہ نوشی کو میرے لئے مانگ لیں۔ اُنہوں نے مجھ سے بات کی تو میں نے سختی سے منع کر دیا۔ شہزادی ابھی تک میرے دل و دماغ سے چھپکلی کی مانند چپکی ہوئی تھی۔ کیا نوشی اور گوشی، مجھے اُس کے سامنے بھی ہیچ نظر آتی تھیں۔ میں قسم کھا چکا تھا کہ شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ جب شہزادی نہیں تو کوئی اور بھی نہیں۔

شہزادی میرا پہلا اور آخری پیار تھی۔ اِن دِنوں وہ پھر شِدت سے یاد آنے لگی تھی۔ میں رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا، اُس کے بارے میں سوچتا، آہیں بھرتا اور سُلگتا رہتا تھا۔ اُن دِنوں ایک عجیب سی سوچ نے میرے دماغ میں گھر کر لیا تھا کہ عشق کی خاطر تو بڑی بڑی قُربانیاں دینی پڑتی ہیں، ماریں کھانی پڑتی ہیں، سنگلاخ چٹانوں سے ماتھا پھوڑنا پڑتا ہے۔ درد و الم کے صحراء عبور کرنے پڑتے ہیں، رُسوائیاں سہنی پڑتی ہیں، تب کہیں جا کر ایک عاشقِ صادق کو منزلِ مُراد نصیب ہوتی ہے۔ میں کِس قدر کم ظرف ہوں کہ ابّا نے ذرا سی چھترول کر دی تو سارے عشق کی ہوا اُکھڑ گئی۔ حیف ہے مجھ پر، آنے والی نسلیں میرے بارے میں کیا سوچیں گی کہ اس نے تو عشق کا بیڑا ہی غرق کر ڈالا۔ شاید وہ ابھی تک میری راہ تک رہی ہو---ایک روز اُس کی یاد نے حد سے زیادہ بے چین کیا تو میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے مِل سے چُھٹی کی اور پھر سے پُرانی ڈگر پہ چل نکلا۔

وہ گندے میدان میں دکھائی دی۔ وہ کنستر خالی کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ میں نے اُسے جالیا۔ اُس نے مجھے دیکھا تو پہلے تو ہکی اور پھر بکی رہ گئی۔ کنستر بھی اُس کے ہاتھ سے چُھوٹ کر لُڑھک گیا تھا۔ بدحواسی کے اس عالم میں وہ پہلے سے بڑھ کر پیاری لگی۔ میں مبہوت ہو کر اُسے تکنے لگا۔ پھر شاید اُسے ہوش آ گیا اور مجھے بھی۔

"دُر فٹے مُنہ، کُخ لعنت ہے---" اُس نے ہاتھ کا پنجہ دِکھا کر کہا۔ "تُو پھر آ گیا---بڑا بے غیرت ہے۔"

"شہزادی! میری بات تو سُنو۔" میں نے التجا کی۔

"مجھے نہیں سُننی تیری بکواس---" وہ کھردرے پن سے بولی۔ "فوراً سے پہلے یہاں سے بھاگ جا۔ اگر میرے پلّے کو پتا چل گیا تو تیری کھال کھینچ لے گا۔"

اُس کی یہ گیدڑ بھبکی سُنی تو میری مردانگی نے جوش مارا۔ مجھے طیش آ گیا۔

"میں نے بہت دیکھے ہیں کُتے پلّے---" میں نے جلے ہوئے انداز میں کہا۔ "تمہارا ابّا "میاؤں، میاؤں" کے سوا کیا کرلے گا؟"

"دیکھ، میرے گھر والے کی بے عزتی خراب نہ کر---" اُس نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ "ورنہ---"

"ورنہ کیا---؟" میں نے چھاتی تان کر کچھ آگے بڑھ کر کہا۔

"میرے قریب مت آنا ورنہ---" وہ غُرّائی۔

میں نے اُس کی سُنی اَن سُنی کر دی، ہر طرح کے نتائج سے بے پروا ہو کر مزید پیش قدمی کی۔ دراصل میں اُس کے گھمنڈ کی حد دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اُس کے بےحد قریب پہنچ گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُوچھا۔

"ورنہ کیا---؟"

اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یکایک پاؤں سے مُرگابی اُتاری اور تابڑ توڑ میری کھوپڑی پر برسانا شروع کر دی۔ میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے، دِن میں تارے دکھائی دے گئے۔ حُسن ستمگر بھی ہوتا ہے، اس بات کا تجربہ مجھے اُس روز ہوا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

شام کو شہزادی کی ماں فردوس اور پلّا میرے بارے میں پُوچھتے پاچھتے ہمارے محلّے میں آدھمکے۔ اُنہوں نے آتے ہی ہمارے گھر کا دروازہ بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیا۔

''باہر نکل اوئے، گیدڑ کی اَولاد---!'' پلّے کی للکار سُنائی دی۔

میری تو رُوح فنا ہوگئی، میں بھاگ کر لیٹرین میں گھس گیا اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ یکا یک میرے پیٹ میں مروڑ اُٹھے اور پھر بادلوں کی گھن گرج سُنائی دی۔ پہلی بار مجھ پر یہ بھید عیاں ہوا کہ پیار کرنے والوں سے بڑھ کر بُزدل اور ڈرپوک کوئی نہیں ہوتا۔ فردوس اور پلّے نے چیخ چیخ کر محلہ سر پر اُٹھالیا تھا۔ ابّا باہر نکلے تھے سینہ تان کر پلّے نے ان کا گریبان پکڑا تھا۔ مغلظات بکی تھیں۔ کچھ ہاتھا پائی کی تھی، ذرا سا گھسیٹا بھی تھا۔ محلّہ والے بھلے لوگ تھے جنہوں نے ابّا کو پلّے کے چُنگل سے چُھڑوالیا تھا۔ میں لیٹرین میں بیٹھا سب کچھ سُن رہا تھا۔ خوف سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ چند دانا و بینا بزرگوں کے سمجھانے بجھانے پر بلّا اور فردوس وہاں سے چلے گئے۔ جاتے جاتے بلّا دھمکی دے گیا۔

''اگر اس ذلیل کنجر نے دوبارہ ہمارے علاقے کا رُخ کیا یا شہزادی سے چھیڑ چھاڑ کی تو میں اس کی ناک کا اس کی تلی (ہتھیلی) پر رکھ دُوں گا۔ پھر یہ کسی کو مُنہ دِکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

وہ چلے گئے اور محلّے میں چہ میگوئیاں گردش کرتی رہیں۔

پلّے کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اَب اس سے بھی بڑا خطرہ درپیش تھا اور وہ خطرہ تھا اپنے ہٹلر مزاج ابّا کا--- اُنہوں نے لیٹرین کا دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا تھا۔

''باہر نکل اوئے، اُلّو کے پٹھے---!''

اُن کی دھاڑ سُن کر میں دہل گیا، میری گِھگھی بندھ گئی اور جُلاب زار و قطار بہنے لگے۔ کافی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ اتنے میں عشاء کی اذان ہوگئی۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر سُن گُن لینی چاہی۔ کوئی آہٹ یا سرسراہٹ سُنائی نہ دی۔ میں مُطمئن ہوگیا۔

''ابّا غالباً نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد کو روانہ ہوگئے ہیں۔'' میں نے سوچا۔

میں چپکے سے دروازہ کھول کر آہستگی سے لیٹرین سے برآمد ہوا۔ ابّا نے جو کہ دراصل دروازے کے ساتھ ہی گھات لگائے بیٹھے تھے، جھٹ سے مجھے یوں دبوچ لیا جیسے کوئی بُھوکا جنگلی بلّا کسی معصوم چُوزے کو ہڑپ کرنے کے لئے دبوچتا ہے۔ پھر اُنہوں نے میری ایسی شاندار درگت بنائی کہ نانی مرحُومہ یاد دِلا دی۔ میں نے اُن کے سامنے فرش پہ ناک رگڑی۔ اتنی رگڑی کہ وہ گِھس کر آدھی رہ گئی۔ شہزادی کے عشق سے توبہ تائب ہوا۔ پھر زندگی کی بندھی ڈگر پہ چل نکلی۔

اَب شہزادی کے عِشق کا بُھوت تو اُتر گیا تھا لیکن یہ احساس دِل میں جاگزیں ہوگیا تھا کہ زندگی اکیلے ہی اکیلے نہیں کاٹنی چاہئے بلکہ زندگی کی ہاتھ ریڑھی کو دھکیلنے کے لئے ایک عدد ہیلپر اشد ضروری ہے۔ میں نے دبے لفظوں میں امّاں سے کہا۔

''میں خوشی سے بیاہ رچانے پر آمادہ ہوں۔''

میری رضامندی پاکر امّاں اور دادی خوشی سے پُھولی نہ سمائیں۔ اگلی صبح وہ تانگے میں بیٹھ کر بستی نُورے والی کو روانہ ہوگئیں۔ پھر شام کو مُنہ لٹکا کے لوٹ آئیں۔

''بیٹا! اُنہوں نے انکار کر دیا ہے۔'' امّاں نے بتایا۔

''مگر کیوں---؟'' میں نے حیران و پریشان ہو کر پُوچھا۔

''تیرے کارناموں کی خبر اُنہیں بھی ہو گئی ہے---'' امّاں بولیں۔ ''وہ کہتے ہیں کہ تمہارا لڑکا بھنگن کا شیدائی ہے، ہماری بیٹی کو کیا خوش رکھے گا؟--- ہم نے بہتیرا کہا کہ اَب اُس نے توبہ کر لی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ کیا پتا، اسے پھر کبھی دورہ پڑ جائے۔''

میرے ارمانوں پہ اوس سی پڑ گئی۔ اس رات مجھے نیند آئی۔ میں اپنی بدنصیبی پر رات بھر چُپکے چُپکے آنسو بہاتا رہا۔

اس کے بعد جب بھی کہیں میرے رشتہ کی بات چلی، میری داستانِ عِشق نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ لڑکی والے ''توبہ، توبہ'' کا ورد کرنے لگتے تھے۔ ابّا، امّاں اور دادی سب نے اپنے تئیں خُوب دوڑ دُھوپ کی مگر میں رنڈوا ہی رہا۔ لڑکی والوں کو نہ جانے کیا تکلیف ہوتی تھی کہ ہمارے اڑوس پڑوس میں پُوچھ تاچھ شروع کر دیتے تھے۔

''لڑکا کیسا ہے، کیا کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ---''

ایک صاحب نے دیکھا کہ دوزخ کی طرف سے بڑی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی ہیں۔ وہ متجسس ہوئے اور دیوار سے دوسری طرف جھانکا تو حیران رہ گئے دوزخ میں دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں، فتنہ عالم حوریں شراب کے جام لئے پھر رہی تھیں۔ معطر اور خوشبودار فضا میں ہر طرف رنگ برنگے پھول اپنی بہار دکھلا رہے تھے۔ غرض کہ بہت ہی دلفریب نظارہ تھا۔ اِن صاحب کا جی للچایا۔ جھٹ سے داروغہ جنت کے پاس پہنچے اور التجا کی کہ اُنہیں دوزخ میں بھیج دیا جائے۔ داروغہ جنت نے بلاتردد اجازت نامے پر دستخط ثبت کر دیئے اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اِسے دوزخ میں لے جائیں۔ وہ صاحب خوشی خوشی رنگین نظاروں کو تصور میں سجائے دوزخ میں پہنچے۔ ارے--- یہ کیا---؟ اندر کا حال دیکھ کر اِن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آگ کے یہ لمبے لمبے شعلے خوفناک سانپ بچھو زہریلے کیڑے مکوڑے بلائیں اور بدہیت ناگ اژدھے منہ پھاڑے کھڑے تھے۔

''یہ--- یہ سب کیا ہے؟'' وہ ہکلائے۔

''یہ دوزخ ہے!'' محافظ فرشتے نے کہا۔

''اور--- اور وہ سب کیا تھا---؟'' وہ گھبرا کر بولے۔

''وہ دوزخ کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ تھا۔'' فرشتے نے اطمینان سے جواب دیا۔

گل نوخیز اختر

ہمارے اکثر پڑوسی اچھے تھے مگر ساری اُنگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔ چند بدخواہ بھی تھے، وہ نمک مرچ لگا کر میرے کرتوت اُنہیں بتا دیتے تھے۔ یہ سُن کر لڑکی والے وہاں سے یوں غائب ہو جاتے تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ---دادی کو خبر ہوتی تو وہ گھر میں ہی واویلہ شروع کر دیتیں۔ وہ میرا رشتہ خراب کرنے والوں کو انتہائی بھیانک بددُعائیں دینے لگتیں۔

''اللہ کرے ان کی زبان میں کیڑے پڑیں، اللہ ان کو ٹی بی کا مریض بنائے۔ ان کو باؤلا کتا کاٹے، ان کو حرام موت نصیب ہو---''

دادی زیادہ چلنے پھرنے سے لاچار تھیں، اُن کی ساری توانائی اُن کی زبان میں سمٹ آئی تھی۔ اُن کی آواز بغیر کسی لاؤڈ سپیکر کے محلّے کے کونے کونے تک باآسانی سُنائی دیتی تھی۔ اُن کی بددُعائیں سُن کر دل سُوکھے پتوں کی مانند لرزنے لگتے تھے۔ پھر غالباً لوگوں نے اِن بددُعاؤں کے خوف سے ہمارے خلاف بولنے سے توبہ کر لی کہ ایک جگہ ٹانکا جو ہی گیا مگر لڑکی والوں کی شرط تھی کہ لڑکا اُن کے ہاں گھر داماد بن کے رہے گا۔

شرط بہت کڑی تھی۔ ابا، امّاں اور دادی مجھے خود سے جُدا کرنے پر ہرگز آمادہ نہ تھے لیکن میری منحوس صورت پر پھٹکار برستی دیکھتے تو اُن کا کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔ میری مُرجھائی زندگی کو گل و گلزار کرنے کی خاطر اُنہوں نے طوعاً و کرہاً لڑکی والوں کا ناجائز مطالبہ تسلیم کر لیا---وقتِ رُخصت امّاں اور دادی بین کر کر کے رو رہی تھیں اور رقت بھری لے میں یہ سہرا گا رہی تھیں۔

''ڈولی چڑھدیاں ماریاں ھِکو چیکاں---''

حالانکہ میں نے کوئی چیک (چیخ) نہیں ماری تھی۔ میری سِسکاریاں بھی بس جُھوٹ مُوٹ کی تھیں۔ دِل میں تو میں بھنگڑے ڈال رہا تھا۔ غمزدہ ابا نے روایتی باپوں کی طرح میرے سر پر دستِ شفقت پھیر کے فرمایا تھا۔

''تمہارے جیسے بیٹے پرایا دَھن ہوتے ہیں۔ اِس گھر سے تمہاری ڈولی جا رہی ہے، واپس جنازہ آنا چاہئے۔''

ابا کی اِس نصیحت کو نیفے میں اُڑس کر میں بینڈ باجوں کی گھن گرج میں بجنی کے دیس ''کھسریاں دی بستی'' جا پہنچا۔

نئی بستی، نئے لوگ، نیا ماحول۔ کچھ وقت تو لگا مگر میں نے جیسے تیسے خود کو اُس ماحول میں ڈھال لیا۔

گھر سے ملحق میرے سُسر جی کی کریانہ کی دُکان تھی کیونکہ آس پاس کوئی اور دُکان نہ تھی لہٰذا وہ دُکان خُوب چلتی تھی۔ اَب اس دُکان کو سنبھالنے میں میں اُن کی معاونت کرتا تھا۔ وہ صبح سے دوپہر تک بیٹھتے تھے، دوپہر سے عشاء تک میری ڈیوٹی ہوتی تھی۔ میری آمد سے اُنہیں کافی راحت مل گئی تھی۔ فارغ وقت میں وہ بیٹھک میں اپنے لنگوٹیے یاروں کی محفل جماتے، تاش کھیلتے اور حقّہ گڑگڑاتے تھے۔

فریدہ اپنے والدین کے پیار کی پانچویں اور آخری نشانی تھی۔ سب بیٹیاں تھیں، اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ فریدہ انتہائی حسین و دِلکش تھی۔ میں اُسے پا کر بیحد مسرُور تھا۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ ساس اور سُسر انتہائی شفیق تھے، مجھے سگے بیٹوں کی مانند چاہتے تھے۔ مجھ پر کوئی روک ٹوک نہ تھی، جب چاہتا اکیلا یا فریدہ سمیت اپنے میکے آ جا سکتا تھا۔ کبھی ابا، امّاں اور دادی ہمارے ہاں آ دھمکتے تھے۔ فریدہ اُن کی خوب آؤ بھگت کرتی تھی۔ وہ بھی اسے دُعائیں دیتے نہ تھکتے تھے۔

سُسر جی نے شہر میں ہول سیل کی دُکانوں پر سب سے میری جان پہچان کرادی تھی۔ میں ہفتہ میں ایک دو بار بازار جا کر دُکان کے لئے اکٹھا مال خرید لاتا تھا۔ پھر ٹھاٹھ سے دُکانداری کرتا تھا۔ مزے ہی مزے تھے، عزت ہی عزت تھی مگر مجھ جیسے انسان کو عزت راس کہاں آتی ہے؟

دُکان پر بھانت بھانت کے گاہکوں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ ان ہی میں ایک سرداراں بھی تھی۔ وہ چار بچوں کی ماں تھی۔ اُس کا خاوند گھوڑا تانگا چلاتا تھا۔ میں نے پہلی بار سرداراں کو دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا۔ اُس کی شکل میری محبوبہ دِلنواز شہزادی سے بیحد ملتی تھی، بس عمر پانچ چھ برس زیادہ ہوگی ورنہ میں اُسے شہزادی ہی سمجھا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بچے پپّو کے ہمراہ چائے کی پتی، چینی اور پاپے لینے آئی تھی۔ میں نے اُس کی مطلوبہ اشیاء اُس کے حوالے کیں اور جھونگے میں پپّو کو ڈھیروں ٹافیاں تھمادیں۔ بچے کی ماں کے دل میں جگہ بنانے سے قبل بچے کے دل میں جگہ بنانی ضروری تھی۔

''بھاء جی! پیسے میں دو چار دن بعد لوٹاؤں گی۔'' اُس نے کہا۔

اُدھار دُکاندار اور گاہک کے درمیان ایک انتہائی پیارا تعلق ہوتا ہے۔ اس سے دونوں میں فاصلے مٹتے ہیں، قُربتیں بڑھتی ہیں۔ میں تو کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا اُس سے گھلنے ملنے کا۔

''کوئی بات نہیں---'' میں نے اُسے ندیدے پن سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اُس نے متشکرانہ نظروں سے مجھے دیکھا اور چلی گئی اور میں خوابوں خیالوں کی حسین بُھول بھلیوں میں کھو گیا حالانکہ میری بیوی فریدہ میں کوئی کمی نہ تھی۔ وہ لاکھوں میں نہ سہی، ہزاروں میں ایک ضرور تھی مگر وہ محض بیوی تھی، محبوبہ تو نہیں تھی۔ سرداراں کو دیکھ کر دل میں میٹھا میٹھا سا

دردر ہنے لگا تھا۔

''شاید وہ آج پھر کوئی سودا لینے آئے---'' میں نے اگلا دن اِسی اُمید کے سہارے گزار دیا۔

اس سے اگلے روز میرے صبر کا یارانہ رہا، میں اُس کی کھوج میں اُس کے گھر تک جا پہنچا۔ وہ تو کہیں نظر نہ آئی البتہ پُپّو گلی میں چند بچوں کے ہمراہ کانچ کی گولیاں کھیلتا دکھائی دیا۔ اُس نے بنیان اور کچھا پہنا تھا۔ پاؤں ننگے تھے، بال بکھرے بکھرے تھے۔ وہ دُھول میں اَٹا ہوا تھا۔ مُنہ سے رال ٹپک رہی تھی، ناک بھی بُری طرح سے بہہ رہی تھی۔ میں نے اُسے جھاڑا، پُونچھا، سینے سے لگایا، چُوما، چاٹا۔ چند ٹافیاں اُس کی جیب میں ڈالیں اور چلا آیا۔ پھر اگلے دو روز بھی ایسی ہی کارگزاری میں گزرے۔ جمعہ کے دِن سرداراں کی من موہنی شکل دکھائی دی۔ آج پُپّو ساتھ نہ تھا، وہ اُدھار چُکانے آئی تھی مگر میں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

''یہ رکھ لو بلکہ اور سودا چاہئے تو وہ بھی لے لو---'' میں نے پیسے اُسے واپس کرتے ہوئے فراخ دل سے کہا۔

''مگر کیوں---؟'' اُس کے چاند سے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیل گئے۔

اُس وقت وہ بہت معصوم اور پیاری لگی۔ مجھے اپنا ماضی یاد آگیا۔ مجھے لگا شہزادی میرے رُوبرُو کھڑی ہے۔ میں جذباتی ہوگیا۔

''یہ دُکان تمہاری ہے بلکہ میں بھی تمہارا ہوں---'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''ایں---'' وہ بدک گئی۔

پھر گویا ہوش میں آگئی۔ وہ طیش میں آکر لرزنے لگی۔

''تُف لعنت ہے تجھ پر، ایسی باتیں اپنی ماں اور بہن سے کیا کرو۔''

اُس نے پیسے میرے مُنہ پر دے مارے، اور دُکان سے نکل کر غل مچانے لگی۔ بڑی گھٹیا عورت تھی۔ اُس نے میری ہمدردی، خلوص اور پیار کی ذرا بھی قدر نہیں کی تھی۔ بگڑتے حالات دیکھے تو میری اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے سے خارج ہوگئی۔ میں ہراساں ہو کر دُکان سے برآمد ہوا۔ اُڑان بھرنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے میری ٹانگوں میں اڑنگا لگا دیا۔ میں تیورا کر گرا۔ پھر تو ساری آفتیں یکجا ہو کر مجھ غریب پر ٹوٹ پڑیں۔ سب نے لاتوں اور گھونسوں سے میری خاطر تواضع شروع کر دی۔ وہ میرے ساتھ یُوں سلوک کر رہے تھے گویا میں انسان نہیں بلکہ بھوسے سے بھری بوری ہوں۔ اُس وقت سُسر جی بیٹھک میں اپنے دوستوں کے ہمراہ بیٹھے تاش سے جی بہلا رہے تھے، سرداراں کی چیخ و

بڑی مشکل ہے

افسر آیا گرو گھنٹال، بڑی مشکل ہے
چلنی مشکل ہے یہاں چال، بڑی مشکل ہے
شیخ جی کھاتے رہے، کھاتے رہے، کھاتے رہے
چھوڑ دیں کیسے وہ تر مال، بڑی مشکل ہے
ہاتھ کو روکنا دعوت میں ہے کارے دارد
پیٹ اَب ہو گیا فٹ بال، بڑی مشکل ہے
راستے بھر تو کبابوں کی مہک آتی رہی
گھر جو پہنچے تو ملی دال، بڑی مشکل ہے
کھیر وہ مجھ کو ملی، میں نے چھپائی لیکن
یار ٹپکانے لگا رال، بڑی مشکل ہے
بولا عاشق کہ دَرِ یار پہ جاؤں کیسے
ایک کتا ہے لیا پال، بڑی مشکل ہے
جیب میں پائی نہیں، سردی لگی بیگم کو
لائیں کیسے وہ نئی شال، بڑی مشکل ہے
آج دعوت ہے نہاری کی مگر کیا کہئے
ہم کو آنے لگے اسہال، بڑی مشکل ہے
بیوی تہمینہ بنی اور ہے بیٹا سہراب
باپ رُستم کا ہوا زال، بڑی مشکل ہے
خواب میں مجھ سے سمرقند و بخارا بولے
اپنی قیمت ہے فقط خال، بڑی مشکل ہے
نیند جب آنے لگی، ہم نے یہ سوچا، سو لیں
جوش میں آگیا قوال، بڑی مشکل ہے
شدتِ عشق نے عاشق کو کیا دیوانہ
آگیا حسن کو بھی حال، بڑی مشکل ہے
پھولؔ جی رہتے ہیں گلشن میں، مگر اَے یارو!
یاں ہے کانٹوں نے بنا جال، بڑی مشکل ہے

تنویر پھولؔ
tanwirphool@gmail.com

پکار اور پھر مار دھاڑ کی آوازیں سُنیں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر باہر نکلے۔ اصل ماجرا معلوم ہوا تو بجائے دُشمنوں کے چُنگل سے مجھے چھُڑانے کے وہ بھی مجھ پر پل پڑے۔ ان سب نے مار مار کے میرا حشر نشر کر ڈالا۔ پھر ڈنڈا ڈولی کر کے بستی سے باہر ایک کھیت میں ڈال دیا۔ میں گھٹنوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا بمشکل تمام وائرلیس پُل تک پہنچا۔ ایک گدھا گاڑی والا وہاں سے گزر رہا تھا۔ اُس کی منت سماجت کی۔ وہ کوئی خُدا ترس بندہ تھا۔ اُس نے مجھے گدھا گاڑی پر لادا اور پھر اس زندہ لاش کو (مجھے) میرے والدین کے گھر کے سامنے اُتار دیا۔ دروازہ ابا نے کھولا، جمعہ کے دن اُنہیں کام سے چھُٹی ہوتی تھی۔ مجھے دیکھا تو جھٹ سے جیب سے چونی نکال کر مجھے تھما دی۔

"میں بھکاری نہیں ہوں---" میں نے چونی اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے ایک کمزور سی صدائے احتجاج بُلند کی۔ "بلکہ آپ کا نُورِ نظر، لختِ جگر پھتّو ہوں۔"

اُنہوں نے صافے سے مجھے جھاڑ پُونچھ کر بغور دیکھا تو پہچان گئے۔ پھر گلے سے لگا کر رو پڑے۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، میرے لعل؟" اُنہوں نے روتے روتے پُوچھا۔

"ابا! اُنہوں نے آپ کے لعل کو مار مار کے لال و لال کر دیا ہے۔" میں نے نحیف سی آواز میں شکوہ کیا۔

اُن کا رونا دھونا یکلخت تھم گیا۔ اُنہوں نے مجھے امّاں اور دادی کے حوالے کیا۔ ہاتھ میں ڈانگ لے کر سائیکل پر سوار ہو کر "کھسریاں دی بستی" پر ہلہ بولنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ امّاں اور دادی مجھ سے جونکوں کی مانند چمٹ گئیں اور پھر لگیں آہ و زاری کرنے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ابا بھی لَوٹ آئے۔ آتے ہی مجھے چند ناقابلِ اشاعت گالیوں سے نوازا۔ پھر کہنے لگے۔

"اَب تم بڑے ہو گئے ہو، تمہیں کچھ کہتے شرم آتی ہے ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ آج پھر تمہیں مُرغا بنا کر تمہاری تشریف پر تابڑ توڑ جُوتے برساؤں۔"

بہر حال جو ہونا تھا، ہو گیا تھا۔ میں وِچھوں دی کھوتی، او تھے آن کھلوتی کے مصداق سب کچھ گنوا کر وہیں آ پہنچا تھا۔ فریدہ کے ساتھ گُزرا وقت ایک سُہانا سپنا لگتا تھا۔ خُود کو سنبھالنے میں وقت تو لگا۔ میں پھر سے لیور مِل میں بھرتی ہو گیا اور کنوئیں کے بیل کی طرح چکر پہ چکر لگا کر گھن چکر بن گیا۔

کئی روز بعد سُسر جی تشریف لائے۔ وہ دراصل اپنی بیٹی کا گھر نہیں اُجاڑنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے چلنے کو کہا۔ ابا بھی یہی چاہتے تھے۔

"اَب وہاں بندے کا پُتر بن کے رہنا۔" اُنہوں نے تاکید کی۔

مگر میں اَڑی کر گیا اور کہا۔

"اِن لوگوں نے مار مار کے جو میرا حلیہ بگاڑ دیا تھا، وہ سب میں کیسے فراموش کر دوں؟---میرے بدن سے ابھی تک ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔"

"بیٹا! وہ مار تم نے اپنی کرنی کی کھائی تھی---" سُسر جی نے چمک کر کہا۔ "شرافت سے رہو گے تو کوئی تمہیں اُنگلی بھی نہیں لگائے گا۔"

"میں مَر تا مَر جاؤں گا لیکن اِن ظالموں کی بستی میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

سُسر جی مایوس ہو کر لَوٹ گئے۔ چند روز بعد اُنہوں نے فریدہ کو ہمارے ہاں پہنچا دیا۔ یُوں فریدہ بھی مِل گئی اور گھر دامادی سے بھی چھُٹکارا مل گیا۔ پھر ماہ و سال کی دوڑ جاری ہو گئی۔ وقت کے اس تیز دھارے میں فریدہ کے اور میرے بڑے بُزرگ یکے بعد دیگرے بہہ گئے۔

میری ازدواجی زندگی کا یہ عالم ہے کہ میرے سیاہ کارناموں کے باعث فریدہ ابھی تک مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی ہے اور میں بھی شرمندہ شرمندہ سا۔ ہم ایک دوسرے سے نظر ملانے سے کتراتے ہیں۔ ہم میں گفتگو بھی بس "ہوں---ہاں" تک ہو پاتی ہے---بس اتنی سی کہانی ہے میری۔"

یہ کہہ کر اُنہوں نے چُپ سادھ لی۔

"انکل! آپ کے بچے کتنے ہیں؟" میں نے کُریدا۔

"دس---" اُنہوں نے جھٹ سے جواب دیا "چھ بیٹے اور چار بیٹیاں---دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شادیاں بھی کر چکا ہوں۔ تین بیٹے لیور مِل میں کام کر رہے ہیں، باقی چھوٹے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔"

"مگر تم میں اور آنٹی فریدہ میں تا حال ناراضگی چل رہی ہے، اتنے سارے بچے کیسے بنالئے؟" نُور اسلم خان نے اعتراض کیا۔

"ارے بھئی، ناراضگی اتنی زیادہ بھی نہیں ہے۔"

انکل پھتّو نے مُونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ پھر ہنسنے میں ہم نے بھی اُن کا بھرپُور ساتھ دیا۔

☆☆

بٹ صاحب، فلم اور ہم

☆ سید ابرار بخاری

"ٹھک ٹھک ٹھک---ٹھک ٹھک ٹھک---" ہمارے مکان کا مبلغ ساڑھے تین فٹ کا میں گیٹ مسلسل کوئی بجائے جا رہا تھا۔

"کون ہے بھائی! آ رہا ہوں۔"

ہم نے چھوٹے کاکے کو بازو پر اٹھاتے ہوئے پکارا۔ دروازہ کھولا تو سامنے بٹ صاحب کھڑے تھے۔

"آہا! بٹ جی......!"

"کیہہ حال اے؟" بٹ صاحب ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

"وعلیکم سلام......" ہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بٹ صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید کوئی پیچھے کھڑا ہو جس کے سلام کا جواب ہم نے دیا ہے۔ جب کسی کو دائیں بائیں آگے پیچھے سوائے ہمارے وجود نہ پایا تو کچھ سمجھتے ہوئے بولے۔

"شاہ جی! میں نے تو عرصہ سات سال پہلے جب آپ "جھلمل" بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر "ڈھلمل" سے کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے اور آنے والے مہمانوں سے بھتہ وصول کر رہے تھے، آپ کو سلامی میں ہزار روپیہ دے کر آپ کی سلامتی پر "اناللہ" پڑھ دی تھی---"

"اللہ کا شکر ہے زندگی کی گاڑی بڑی عمدگی اور سبک مزاجی سے چل رہی ہے۔" ہم نے مسکر کر کہا۔

منہ بنا کر بولے۔ "گاڑی اسی لئے سبک مزاجی اور عمدگی سے چل رہی ہے کہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آپ کی بیگم اور سیٹوں پر بچے بیٹھے ہیں اور آپ گاڑی کو دھکا لگانے میں مصروف ہیں۔ اب آپ اپنے زور بازو سے گاڑی کو ایک سو بیس کلومیٹر فی گھنٹہ چلانے سے تو رہے کہ جس میں دھچکے اور ہچکولے لگیں--- کیا زمانے تھے وہ بھی جب ہم بھی جب ہم سارا دن اکٹھے ہلا گلا کرتے موجیں اڑایا کرتے تھے۔ جلسہ کوئی مذہبی ہو یا سیاسی ہمارے بغیر نامکمل ہوتا تھا۔ وہ واقعہ یاد ہے کہ جب میاں نواز شریف کا انتخابی نشان سائیکل اور پی پی کا تیر تھا اور ہم دونوں پکے متوالے تھے۔ جیالوں نے کچھ ایسا نعرہ ایجاد کر لیا تھا کہ کیا جیالے اور کیا متوالے ہر ایک کو یاد ہو گیا تھا کہ "پھڑلو پھڑلو سائیکل چور"--- جواب میں متوالوں نے بھی اسی ٹائپ کے نعرے ایجاد کیے تھے لیکن بقول آپ کے ان میں وہ بات کہاں تھی مولوی مدن کی سی اور جب ہم ایک ریلی میں ٹریکٹر ٹرالی پر سوار ممیاں دے نعرے وجن گے" گلے پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہے تھے کہ پتہ نہیں کس طرح کسی خبیث نے ایکا ایکی نعرہ لگایا کہ "پھڑلو پھڑلو" اور ہم دونوں نے گوبھی چور اور آلو چور (کیونکہ شہری پی پی کا جو امیدوار تھا، اس کا تعلق ارائیں برادری سے تھا) کہنے کے اسی ترنگ میں آ کر کہہ دیا کہ "سائیکل چور" --- اور پھر جس طرح ڈنڈا ڈولی کر کے ہم دونوں کو ٹریکٹر ٹرالی سے نیچے پھینکا گیا، وہ وقت یاد آتا ہے تو نعرہ لگوانے والے کو ڈھونڈ کر اس کی ایسی تیسی کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے---" پھر انہوں نے کچھ سوچا اور دوبارہ ہماری بے عزتی کی لائن پر اپنی زبان کو ڈالتے ہوئے گویا ہوئے۔ "اور ایک آج کا دور ہے۔ ہم جیسے بجن بیلیوں کو آپ بھول چکے ہیں جب دیکھو دائیں طرف کو "زچہ ہے" اور بائیں بغل میں "بچہ" ہے۔"

ہم نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ "بٹ صاحب! شرم کریں، آخر آپ نے اور آپ کی بیگم نے بھی تو "امت" میں اضافہ کا نیک فریضہ اسی دھڑلے سے سرانجام دیا ہے؟"

ہمارے سینے پر اپنی شہادت کی انگلی ٹھونکتے ہوئے بولے۔

"شاہ جی! قسم کروا لیں کہ کبھی آپ جیسی زن مریدی کی حرکتیں کی ہوں۔ گھر والے لے جاتے اور لے آتے ہیں، مجھے تو اس وقت پتہ چلتا ہے جب میں گلی میں داخل ہو کر دیکھتا ہوں کہ ہمارے گھر کے سامنے کھسرے بریک ڈانس کر رہے ہیں۔ پھر میں سوچتا ہوں کہ پترا اعجاز بٹ! لگتا ہے گھر میں کوئی "نیک و بد" ہو گیا ہے---"

ہم نے کہا۔ "بد کے ساتھ نیک کا تو آپ ویسے ہی دُم چھلہ لگا رہے ہیں ورنہ قسم اٹھا کر بتایئے کہ کبھی بٹ برادری میں نیک بھی ہوا

ہے؟''

فرمانے لگے۔ ''ایسی بھی کوئی بات نہیں، کشمیریوں کے خاندان کے خاندان نیک اور شریف ہوئے ہیں۔''

ہم نے پوچھا۔ ''مثلاً ---؟''

مثلاً میاں شریف، نواز شریف، شہباز شریف---''

''بابرہ شریف کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ہم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں--- وہ پیدائشی کی بجائے آزمائشی شریف تھی۔''

''آزمائشی---؟''

''ہاں جی، اصل میں اسے ایک عرب شیخ نے شام سے صبح تک اپنے تبلیغی سائے پر رکھا تھا۔ بیچاری کے سارے بدی کے جراثیم ایک ہی ہلے میں مک مکا گئے۔ اگلی بار شیخ نے دوبارہ تبلیغ کے لئے بلایا تو موصوفہ نے پیغام لے کر آنے والے ہرکارے کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ یا شیخ! اب مزید تبلیغ کی ضرورت نہیں کیونکہ اب بابرہ ''شریف'' ہو چکی ہے۔''

اب تک ہم دونوں میں جو بھی بات چیت ہوئی تھی، وہ جو منہ میں آیا کہہ ڈالا کے مصداق تھی جسے قارئین نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ سر نہ پیر، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ ویسی ہی گفتگو جو بے تکلف دوستوں میں ہوتی ہے۔ اب ہم نے سوچا کہ بٹ صاحب سے اصل بات پوچھی جائے اس لئے ہم نے پوچھا۔

''بٹ صاحب! کیسے تشریف لانا ہوا؟''

''بھئی، اس لئے حاضر ہوا تھا کہ سینما میں ایک بہت مزیدار فلم لگی ہے۔''

''مزیدار'' کے نام پر ہماری آنکھوں میں چمک آ گئی۔ بٹ صاحب نے کچھ سال پہلے ایک پکچر بنام ''جنگل میں منگل'' دکھائی تھی۔ فلم شاید گونگوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ قسم کروالیں جو فلم کے کسی کردار نے ''اوں، آں'' کے سوا کوئی لفظ منہ سے نکالا ہو۔ پوری فلم میں ایک جنگل کجا، ایک ننھا سا پودا تک نہ دکھایا گیا البتہ جس نے بھی اس فلم میں کام کیا تھا، وہ موقعہ اور بے موقعہ ''منگل'' منانے سے ہرگز نہ چوکتا--- ہمارے دلی جذبات شاید منہ پر موجزن ہو گئے تھے کہ بٹ صاحب انہیں بھانپتے ہوئے بولے۔

''اب ایسی باتوں کی آپ کی عمر نہیں رہی۔ سر اور داڑھی میں سفید بال جا بجا کھمبیوں کی طرح اُگ رہے ہیں--- ''مزیدار'' فلم دیکھتے ہوئے دوران چھاپہ آپ چھاپ لئے گئے تو لوگ بھلا کیا کہیں گے؟''

''کیا---؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی ہم پوچھ بیٹھے۔

''یہی کہیں گے کہ---

عمر دیکھو اور کرتوت دیکھو
حوروں کے جھرمٹ میں سور دیکھو''

ہمیں فوراً محسوس ہو گیا کہ یہ تک بندی سے لبریز شعر ابھی ابھی بٹ صاحب کے ذہن کند مہم بذریعہ شیطان وارد ہوا ہے۔ ہم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بٹ جی! ماشاء اللہ ہمارا تعلق ایک اچھے خاندان سے ہے اور ہم نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ خاندانی عزت کو ہماری وجہ سے بٹہ نہ لگے۔''

بٹ صاحب آہ بھر کر بولے۔ ''شاہ جی! سچ پوچھیں تو آپ کو 'شاہ جی' کہہ کر پکارتا ہوں تو اُس میں آپ کی شرافت سے زیادہ آپ کی پیدائشی مجبوری کا ہاتھ ہوتا ہے ورنہ میرا اور آپ کا بچپن کا ساتھ ہے، مجھ سے زیادہ آپ کے لچھنوں اور کرتوتوں سے کون واقف ہوگا؟ قسم پیدا کرنے والے کی (اس سے اُن کی مراد اپنے ابا جی تھے) جب بھی آپ کو شاہ جی کہہ کر پکارتا ہوں، لگتا ہے کہ آپ پر تہمت دھر رہا ہوں۔''

بٹ صاحب مسلسل ہماری عزت پر دانت تیز کیے جا رہے تھے اور یہ ان کی پرانی عادت ہے کہ بندے کی مٹی پلید کرتے ہیں تو جی بھر کر کرتے ہیں اور اچھی بات یہ ہے کہ دوسرے دن ہی جس کی ایسی تیسی کی ہو اُس کے گھر قدم رنجہ فرما کر اس سے جپھی ڈال کر اپنی کردہ ناکردہ غلطیوں اور گستاخیوں کی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ہم سے ڈالی گئی اسی قبیل کی جپھیوں کی تعداد سینکڑوں کی بجائے ہزاروں میں پہنچ چکی ہیں--- ہم نے سوچا کہ مزید ایک جپھی ڈلوانے اور ہڈیاں کڑکڑانے سے بہتر ہے کہ ان سے آنے کی وجہ پوچھ لی جائے اور ہم نے یہی سوچ کر کھنکھارتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا چھوڑیئے ان لایعنی باتوں کو، اصل بات بتایئے؟''

''اصل بات...... ہاں، اصل بات یہ ہے کہ عرصہ ہو گیا کہیں اکٹھے باہر نکلے ہوئے، دل چاہ رہا تھا کہ گزرے وقت کو واپس لایا جائے۔ سوچا کہ شہر کے سینما میں ایک فلم لگی ہے۔ بڑی تعریف سنی ہے اس کی، دل چاہتا ہے کہ دونوں دوست اکٹھے ہلا گلا کر لیں، کیا خیال ہے؟''

بٹ صاحب اگر فوراً پٹڑی پر آ گئے تھے تو ہم کیوں انہیں دوبارہ پٹڑی سے اُتارنے کا موجب بنتے، ہم نے فوراً کہا۔

''بسر و چشم---''

اچھا تو شام ساڑھے چھ بجے تیار رہیے گا، میں آپ کو لینے آ جاؤں گا۔ سات بجے والا شو دیکھیں گے، بھابی کو بھی بتا دیجئے گا۔''

ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو بولے۔

''یہ تو میں نے آپ کی عزت رکھنے کی کوشش کی ہے ورنہ آپ اور بیگم کو نہ بتائیں---'' پھر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ''آپ تو گھر سے قدم نکالنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ بیگم! جاؤں اور گھر قدم ڈالنے سے پہلے پوچھتے ہیں کہ بیگم! آؤں...... ماشاءاللہ مجھ جیسے دس زن مرید بھی اکٹھے ہو جائیں تو آپ کے جوتے کے تکوے کی خاک کو بھی نہیں پہنچتے۔''

ہم نے بیچارگی سے انہیں دیکھا۔ اگر کوئی جوابی وار کرتے تو اندیشہ نقص امن تھا اس لئے خفگی آمیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر کہا تو یہی کہا۔

''بٹ صاحب! آپ ہم کو اتنا بھی بانس پر مت چڑھایئے' دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے میں آپ کے درجات بھی بلند فرمائے--- قبلہ! باتوں باتوں میں پوچھنا ہی یاد نہ رہا کہ بوتل چلے گی یا شربت؟''

''آپ بھول رہے ہیں کہ ٹھنڈا گرم مہمان کو اندر بٹھا کر پوچھتے ہیں۔''

''اوہ--- اصل میں میں اور آپ کی بھابی گھر کی سالانہ صفائی کر رہے ہیں۔ سارا سامان جھاڑ جھنکار کی طرح بکھرا پڑا ہے۔ اگر کچھ چیزیں ایک جگہ پڑی ہیں تو وہ اُن ناکارہ' بیکار اور کھٹارہ چیزوں پر مشتمل ڈھیر ہے جسے آپ کی بھابی گھر سے دیس نکالا دینے جا رہی ہے۔''

''اس ڈھیر سے خود کو الگ ہی رکھئے گا۔'' بٹ صاحب نے کہا۔

''کیوں---؟''

''کیا پتہ بھابی ان ناکارہ اور بے کار چیزوں کے ساتھ آپ کو بھی اٹھا کر باہر پھینک دیں---'' پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''اچھا میں چلتا ہوں' شام کو تیار رہئے گا اور رہی بوتل تو فلم کے درمیان جو ہاف ٹائم ہوتا ہے تب اُس سے لطف اندوز ہو لیں گے۔''

مقررہ وقت پر بٹ صاحب تشریف لے آئے اور پھر ہم دونوں کوئے یار کو چل دیئے۔ راستے میں بٹ صاحب فرمانے لگے۔

''شاہ جی! پیسہ ہاتھوں کی میل ہے لیکن اب ہم دونوں بال بچے دار ہیں' اخراجات اور مہنگائی دونوں آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان حالات میں اپنا بوجھ دوسرے پر ڈالنا زیادتی ہو گی اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ امریکن سسٹم کے تحت فلم اور فلم دیکھنے کے دوران جتنا بھی خرچہ آئے' اسے دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے اپنے اپنے اخراجات خود برداشت کیے جائیں۔''

ہمارے پورے وجود میں سرخوشی کی لہر دوڑ گئی' آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بقائمی ہوش و حواس ہم نے بٹ صاحب کے ساتھ جتنے بھی ہلے گلے کیے تھے' ان میں ہمیشہ بٹ صاحب کے حصے میں ''ہلا'' اور ہمارے حصے میں ''گلا'' آیا اور ہم اختتام پر ان سے اپنی جیبیں ڈھیلی کروا کر لٹکے منہ سے واپس گھر تشریف لے آیا کرتے تھے۔ اب جو انہوں نے یہ تجویز پیش کی تو ہماری خوشی سمجھ میں آتی تھی۔ ہم نے فوراً مسکرا کر اور سر ہلا کر ان کی تجویز کو قبول کر لیا' فوراً اس لئے مبادا انہیں کہیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہو جائے اور پھر وہ کیا ہے کہ ''مکرنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔''

مین روڈ سے ہم نے رکشہ کروایا' دس منٹ بعد ہم سینما گھر کے باہر اُتر رہے تھے۔ بٹ صاحب نے فوراً کرایہ ادا کیا اور بولے۔

''شاہ جی! سارا خرچہ کاغذ پنسل سے لکھتے جایئے' مکمل حساب کتاب آخر میں کر لیں گے۔''

ہم نے فوراً کسی منشی کی طرح سامنے کی پاکٹ سے پنسل اور کاغذ برآمد کیا اور فوراً لکھا کہ ''سینما گھر جانے کا کرایہ پچیس روپے بٹ صاحب نے دیا'' --- ہم لکھ چکے تو بٹ صاحب نے تاکید کی۔

''شاہ جی! ایک ایک آنے کا حساب لکھئے گا۔''

ہم نے سر ہلایا۔ کاغذ پنسل جہاں سے برآمد کیے تھے وہیں درآمد کر دیئے۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے جہازی سائز کے سینما بورڈ پر نگاہ پڑی۔ بورڈ پر دائیں طرف اداکار ''جان'' لاچے قمیص میں ملبوس ایک ہاتھ میں کلاشنکوف دوسرے ہاتھ میں پمپ ایکشن تھامے سوا نو بجاتی مونچھوں کے ساتھ دشمنوں کو گھوریاں ڈال رہا تھا اور اس کی بغل میں گھسی اداکارہ ''قائمہ'' ایک ہاتھ جان کے سینے پر رکھے' دوسرا اس کی کمر کے گرد حائل کیے' بکھرے بالوں اور نیچی قمیص کے ساتھ اُدھر ہی دیکھ رہی تھی' جدھر جان دیکھ رہا تھا۔ موصوفہ نے بھی لاچا زیب تن کیا ہوا تھا۔ لاچے کو ایک خراش تک نہ آئی تھی البتہ محترمہ کی قمیص تین چار جگہ سے پھٹی ہوئی تھی' اس سے تو آشکار تھا کہ وِلن خاصا نابکار' ناہنجار' دریدہ دہن اور دریدہ پیرہن تھا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پہلے جو اور جتنی بھی گزند پہنچتی' لاچے کو پہنچتی کہ اس میں کون سا ناڑا تھا یا بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ اس بات کا ذکر ہم نے بٹ صاحب سے کیا تو وہ فرمانے لگے۔

''شاہ جی! اگر بے لباسی کی شروعات لاچے سے کی جاتی تو یہ قائمہ بی بی بجائے لاچے کے لنگوٹ میں ملبوس ہوتی اور آپ جیسے ٹھرکی بجائے فلم دیکھنے کے صبح سے شام تک بورڈ کے سامنے ہی کھڑے رہتے۔''

''ہمارے ''ٹھرک پنے'' کو تسکین دینے کے لئے وہ بیبیاں کم ہیں جو بورڈ کے نچلے حصے میں بال پریشاں اور سینہ چاک کیے کسی مینڈکی کی طرح بیٹھیں دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں۔'' ہم نے کہا۔

بٹ صاحب نے ایک ایک کا تفصیلی معائنہ کیا' تھوک نگلی' آہ بھری

ملامت اور خفگی بھری نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور بولے۔

"فلم کے ڈریس ڈیزائنر کا گناہ اب ان "نیک" بیبیوں کے سر تو مت منڈھیں۔ اب آپ غور کریں، اِن اللہ کی بندیوں میں سے "جرگس" حج یافتہ ہے اور ساتھ والی "عمرہ یافتہ" ہے۔"

"اور تیسری---؟" ہم نے اُس کے متعلق خود ہی پوچھ لیا۔

ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "یہ حدود آرڈیننس میں "سزا یافتہ" ہے۔"

ٹکٹ گھر کے سامنے شیطان کی آنت سے بھی لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ ہم نے کہا۔

"بٹ صاحب! کیا خیال ہے لائن میں نہ لگ جائیں؟ جس طرح لوگ جوک در جوک سینما تشریف لا رہے ہیں، لگتا یونہی ہے کہ ہمیں کو نامراد جانا پڑے گا۔"

بٹ صاحب نے مضحکہ خیز منہ بنایا اور بولے۔ "اوئے بادشاہو! اِن میں سے ایک تنگ بھی واپس نہیں جائے گا۔ کرسیوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو آنے جانے کے راستوں پر بھی بیٹھنا پڑا تو وہ بیٹھ جائیں گے اور تو اور بعض لوگ پردہ سمتی سے چار فٹ کے فاصلے پر بیٹھ کر بھی فلم دیکھنا گوارا کر لیں گے کہ فلم بہت "مزیدار" ہے اور رہا ٹکٹ حاصل کرنے کا معاملہ تو شاہ جی! یہ جو لمبی سی لائن لگی ہوئی ہے، یہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے ہیں۔ ٹکٹ کھلنے کی گھنٹی بجتے ہی دیکھئے گا کہ کیسے جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب! اگر ایسی بات ہے تو ہم اپنا جوتا آپ کی خدمت اقدس میں پیش کریں گے، آپ دال لے آیئے گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ جب گھمسان کا رن پڑے تو ہم بھی اس میں کارِ خیر کے لئے کود پڑیں؟ اس کا نتیجہ دو صورتوں میں نکلے گا۔ یا تو میرے نیچے آ کر کوئی اللہ لوک جان سے جائے گا اور اگر میرا پاؤں رپٹ گیا تو پھر دوسری ملاقات آپ سے جہنم کے دروازے پر ہوگی۔"

"جہنم کے دروازے پر؟" ہم نے اچنبھے سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، جہنم کے دروازے پر۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ نیک کام سرانجام دلوا کر بھی آپ جنت کے حقدار رہیں گے؟ وہاں جان کے بدلے آپ سے آپ کی نیکیاں ہتھیائیں گے۔"

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب! اگر ایسے ہی لین دین ہوا تو ہماری جھولی میں جہنم کے مین گیٹ تک پہنچتے پہنچتے سوائے گناہوں کے اور کچھ نہیں بچے گا۔"

سر ہلا کر بولے۔ "کوئی بات نہیں، آپ کے گناہ ہی لے لوں گا لیکن---!"

"لیکن---؟"

"لیکن لوں گا ستر گنا کے حساب سے۔"

"آپ ستر گنا کی بات کرتے ہیں، آپ سات ہزار گنا کے حساب سے لے لیجئے گا۔"

"اب میں اتنا بھی گھامڑ ہرگز نہیں ہوں کہ آپ کے سارے گناہ اپنے کھاتے میں لکھوا کر نوٹ بک پر صفحہ اوّل سے آخر تک کاٹے مروا دوں۔ اِدھر میں فرشتوں کے کوڑے اور دھموکے سہتا رہتا ہوں، اُدھر آپ حوروں کے جھرمٹ میں بیٹھے فرداً فرداً ہر ایک کا نام پوچھ رہے ہوں---واہ بھئی واہ---!"

اچانک ٹکٹ گھر کا دروازہ کھول کر دو افراد ٹکٹیں پکڑے اندر داخل ہوئے۔ قطار میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی سی دوڑ گئی۔ بٹ صاحب اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ جب مکمل تلاشی لے چکے تو بولے۔

"شاہ جی! ٹکٹیں لے لیجئے، مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں پیسوں والا پرس تو گھر ہی بھول آیا ہوں۔ سامنے کی جیب میں پچیس ڈالے تھے، بس وہی کل سرمایہ تھا---" پھر ہمارے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔ "آپ پیلے کیوں پڑ گئے ہیں، یوں لگتا ہے کہ آپ کے ہیپا ٹائٹس کے جراثیموں کی تعداد اچانک اَسّی سے بڑھ کر ایک ہزار اَسّی ہو گئی ہے---" پھر ہمیں پکارتے ہوئے بولے۔ "آپ سے امریکن سسٹم کا وعدہ ہوا تھا۔ آپ رقم کا اندراج کرتے جایئے، آدھی رقم کے متعلق بے فکر ہو جایئے---چلئے جلدی کیجئے ورنہ سیڑھیوں پر بیٹھنے کی جگہ نہ ملے گی۔"

ہم نے جیب سے پیسے نکالے، حسرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا، سو کا نوٹ بٹ صاحب کی طرف بڑھایا، یخ بستہ سانس بھری اور کہا۔

"لیجئے، ٹکٹ لے آیئے۔"

بٹ صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولے۔ "پہلے جو عرض آپ کے حضور کی تھی، وہ مذاق ہرگز نہیں تھا۔ آپ دھان پان سے ہیں اور یہی فگر ایسے کاموں میں مناسب رہتی ہے بلکہ میں تو آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں اور مبارک باد کا مستحق جانتا ہوں کہ آپ کو ایسا "ٹکٹی" جسم ملا ہے---شاباش جایئے، میدانِ جنگ میں مردانہ وار کو جایئے۔"

ہم نے میدان کارزار کی طرف دیکھا جہاں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ لائن لگی ہوئی تھی لیکن پہلے سے چوتھائی۔ وہ شاید ہم جیسے تھوڑے دِلوں پر مشتمل تھی۔ کھڑکی کے پاس "خاند کی پگڑی محمود کے سر والی بات تھی"---لوگ یوں کود کود کر ایک دوسرے پر چھلانگیں مار مار کر چڑھ

رہے تھے جیسے فٹ بال کے میچ میں جیتنے والی ٹیم کے جملہ کھلاڑی ایک دوسرے پر اُچھل اُچھل کر گرتے ہیں' بغیر یہ جانے بوجھے کہ نیچے والوں کا کہیں دیہانت تو نہیں ہو گیا۔ جو بھی ٹکٹ کے ہجوم سے باہر نکلتا' اسے پوز مارتا جیسے "کے۔ ٹو" کی چوٹی سر کر کے آیا ہو۔ ایک نوجوان ہم نے ایسا دیکھا کہ سر کے بال بھرے ہوئے' آنکھوں میں وحشت چھائی ہوئی' دامن داغدار۔ جس مٹھی میں ٹکٹ اور بقایا پیسے پکڑے ہوئے تھے' وہ چھلی ہوئی اور زخموں سے خون رستا ہوا لیکن اس نے تمام طرف سے لاتعلق ہو کر باہر نکلتے ہی ایک بڑھک ماری' دو چار دوستوں کو ٹکٹ دیئے اور یونہی حساب کرتا ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"ہمت کرو شاہ جی ---!" بٹ صاحب ہمیں کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے بولے۔

"ہم نے پہلے ٹکٹ گھر کی طرف دیکھا' پھر بٹ صاحب کی طرف بیچارگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بٹ صاحب! یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ دم گھٹنے سے ہم مر مرا گئے تو محلے کا مولوی بھی ہمارا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دے گا کہ یہ کونسا کشمیر کا شہید ہے --- ہمارے تو اہل خانہ بھی ہم پر تھو تھو کریں گے کہ اب وہ پوچھنے والوں کو کیا بتائیں گے کہ ہمارا پیارا بھتیجا' بھانجا' ماموں' چچا سینما میں دوران حصول ٹکٹ سورگباش ہوا ہے؟"

"محلے کے مولوی کا آپ ذکر ہی نہ کریں۔ اسے تو ایک ہزار کا نوٹ دکھا کر میں جنازہ پڑھانے پر آمادہ کر لوں گا اور تو اور وہ اپنی کتابوں سے یہ حدیث بھی کسی کونے کھدرے سے برآمد کرے گا کہ دم گھٹنے سے ہلاک ہونے ہونے والا بھی شہید ہے اور آپ کے گھر والوں کو......"

"براہ مہربانی ٹکٹ لینے کی کیجئے اور میرے بچوں پر رحم کھایئے۔" ہم نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اسی اثناء میں ایک شخص ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔

"باؤ جی! ٹکٹ چاہئے؟" اس نے بٹ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"آہو ---!"

"تو کتنے چاہئیں؟"

"دو ---"

"ستر کی ہے' دو ایک سو چالیس کی۔"

بٹ صاحب نے سو اسے تھمایا اور ہمیں چالیس اور نکالنے کو کہا۔ ہم نے مزید چار دس دس کے نوٹ اُس "مہلکیئے" کی طرف بڑھائے' اس نے ٹکٹیں دیں۔ بٹ صاحب ٹکٹیں ہاتھ میں لے کر بولے۔

"زیادہ مہنگی نہیں پڑیں۔"

ہم نے کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں پہلے سے بھی زیادہ رش پڑا ہوا تھا اور سوچا کہ واقعی ٹکٹیں مہنگی نہیں پڑیں البتہ جب بٹ صاحب کی طرف دیکھا تو نجانے کیوں زبان سے نکل پڑا۔

"مال مفت دل بے رحم ---"

تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے ہال کی بتیاں بجھنے لگیں جو اس بات کا اشارہ تھا کہ "شو سروع ہو گیا ہے" --- ابھی کچھ بتیاں گل ہونی باقی تھیں کہ قومی ترانہ بجنے لگا۔ ہم فوراً احترام کے جذبے سے اٹھ کھڑے ہوئے البتہ بٹ صاحب اطمینان سے بیٹھے ٹانگ پر ٹانگ دھرے اُسے ہلاتے اور کارن پاپ جو آتے ہی انہوں نے لے لئے تھے' کھاتے رہے۔ ترانہ ختم ہوا تو ہم نے کہا۔

"بٹ صاحب! آپ بھی احتراماً اُٹھ جاتے تو آپ کا کیا جاتا؟"

"شاہ جی! مجھے ایسی دکھاوے والی چیزوں سے باز ہی رکھئے۔ مجھے چودہ اگست کے بعد جا بجا قومی پرچم کی جھنڈیاں اُٹھانا گوارا ہے' یہ ہرگز گوارا نہیں کہ جھنڈے کی تعظیم و تکریم کے لئے تو اُٹھ کھڑا ہوں لیکن وہی جھنڈا چھت پہ انٹینا پر لگاؤں تو اس وقت تک نہ اتاروں جب تک اس کا رنگ نہ اُڑ جائے اور اس کی دھجیاں نہ ہو جائیں اور یہ جو آپ بابا جی کی سکرین کی آمد پر تالیاں بجا رہے تھے تو مجھے وہ بزرگ یاد آ گئے جو انتہائی عاقل' بالغ تھے۔ ایسی ایسی سمجھداری اور دانائی کی باتیں کرتے تھے کہ حیرانی ہوتی تھی اور جانتے ہیں کہ جس محفل میں وہ بزرگ قدم رنجہ فرماتے تھے' اسی محفل کے چند افراد نے ایک دوسرے کو آنکھیں مارنی شروع کر دیں۔ مذاق اُڑایا جانے لگا اور پھر ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ انہی لوگوں کی شرارت سے ایک دن بابا جی آگے آگے جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے پانچ سات بچوں کی ٹولی تالیاں پیٹتی "بابا میٹر' بابا میٹر" کہتی جا رہی تھی۔ جب آپ تالیاں پیٹ رہے تھے تو مجھے لگا جیسے آپ انہی بچوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے کبھی بچپن میں ایک قبل عزت و احترام ہستی کا تالیاں پیٹ پیٹ کر مذاق اڑایا تھا۔"

ہم نے شرمندگی سے سر جھکا لیا کہ واقعی آج ہم جھنڈے لگاتے ہیں' بچوں کے لئے ان کی تفریح کے لئے' عزت و احترام کے جذبے سے یکسر خالی ہو کر۔ تالیاں پیٹتے ہیں اس لئے کہ دوسرے بھی یہی عمل کر رہے ہوتے ہیں۔ کاش! ہم سب یہ چاہے نہ کریں لیکن قائد کے فرمان ایمان' یقین' اتحاد' تنظیم کے سنہری اصولوں پر عمل کریں تو یہی پاکستان کے جھنڈے کو سلامی ہو گی اور قائد کے حضور پاسداری۔

ترانے کے فوراً بعد رہی سہی بتیاں بھی بجھ گئیں اور سکرین پر قلم میں

کام کرنے والے ہنر مندوں اور فنکاروں کے نام آنے لگے۔ نمبر ختم ہوئے تو ایک گاؤں کا منظر نظر آیا۔ کھیتوں میں مزدور کام کر رہے تھے اچانک بیک گراؤنڈ سے ''ٹھشم'' کی آواز آئی جو ظاہر کرتی تھی کسی کو گھونسا رسید ہوا ہے۔ اُدھر آواز ختم ہوئی' اِدھر اداکار ''چان'' لڑھکتا ہوا سکرین پر آ گرا۔ ابھی وہ منہ سے کھیت کی مٹی صاف کر رہا تھا کہ اچانک ایک ٹانگ ایک کونے سے رسید ہوئی۔

''چان'' قلابازیاں کھاتا سکرین کے دوسرے کونے پر جا گرا۔ اسی کے ساتھ ٹانگ والا بھی سکرین والا بھی نمودار ہوا گیا۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ ''چان'' سکرین کے دوسرے سرے پر کیوں جا کر تھما تھا۔ اصل میں ہمارے نامی گرامی ''ولن'' کو اپنے جثے کے رونمائی کے لئے پوری سکرین کی ضرورت تھی--- آہستہ آہستہ اردگرد کے لوگ بھی آ کھڑے ہوئے' ولن ان کی طرف رُخ کر کے بولا۔

''اوئے کمیو! جنوں جنوں جیدے آنگر اپنا حق چائیدا اے اُو اگے آئے' اوئے!'' (اوئے ہمارے کام کرنے والو! جس جس کو جیدے کی طرح اپنا حق چاہئے' وہ آگے آئے)--- جملہ کمی کمین بجائے آگے آنے کے دو دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ولن نے آہستہ آہستہ گردن کو موڑ کر جیدے کو دیکھا اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''اوئے اجے وی اپنا حق چاہیدا ای؟'' (ابھی اپنا حق چاہئے)

جیدے نے آہستہ آہستہ اپنا چہرہ اوپر اٹھایا' باچھوں سے نکلتے خون کی دھار کو اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور بولا۔

''مائی باپ! ایناں کھیتاں تے میرے دادے نے محنت کیتی' میرے باپ نے ہل جوئے' چوہدری جی! نکیاں ہوندیاں تو میں اپنے باپ نال ایناں کھیتاں نوں پانی دیندا رہیا (ان کھیتوں پر میرے دادا' باپ اور میں نے بچپن سے محنت کی ہے) ایناں فصلاں نوں اسان پانی دی جگہ اپنا خون پسینہ پیایا اے' ہوں اک نکی جئی گل نوں بنیاد بنا کے تسی مینوں ایتھوں بے دخل کرنا چاہندے او؟ اے ظلم اے (ان فصلوں کو ہم نے پانی کی جگہ خون پسینہ پلایا ہے' اب ایک چھوٹی سی بات کو بنیاد بنا کر مجھے یہاں سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں' یہ ظلم ہے)

ولن جو گاؤں کا چوہدری تھا' پہلے ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ''اوئے' اے ظلم اے---؟'' پھر اس نے مجمع کی طرف نگاہ کی' شیطانی انداز میں ''ہاہاہا'' کی اور بولا۔ ''اے ظلم اے---؟'' پھر اچانک چپ ہو کر بولا۔ ''اوئے (چمچوں کڑچھوں سے مخاطب ہو کر) اینوں دسو دائے' ظلم کی ہوندا اے۔''

''بٹ صاحب بولے۔ ''شاہ جی! مجھے تو لگتا ہے' پندرہ منٹ فلم چلنے کے بعد یہ چوہدری اپنے جیدے کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچ جائے گا۔''

ہم نے ''اچھا'' کہا اور دوبارہ فلم دیکھنے لگے۔ محترم جیدا صاحب چوہدری کے مسٹنڈوں کے درمیان فٹ بال بنے ہوئے تھے۔ موصوف جب مار کھا کھا کر اوندھے منہ گر پڑے تو انہوں نے چھوڑا۔ اگلے سین میں جیدا سر سے پاؤں تک داغدار' بے حال' لاچار دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو اُس کی ماں اور بہن بھاگی بھاگی آئیں۔

''وے جیدے پتر---!'' ماں پکاری۔

''بھیا---!'' بہن جو برتن دھو رہی تھی' انہیں چھوڑتے ہوئے قریب آ کر بولی۔

''پتر جیدے! تیرا اے حال کنّے کیتا اے؟'' ماں اپنے چادر کے پلو سے اُس کا گرد آلود اور خون آلود چہرہ پونچھتے ہوئے بولی۔

بہن پہلے ''ویرا'' (بھیا) کہہ کر اس کی بغل میں گھسی ٹھسکتی رہی' پھر اس کو سہارا دیتی ہوئی چارپائی کی طرف لے گئی--- از قصہ مختصر جیدے کے اوّل سے آخر تک بات سنانے پر ماں بولی۔

''میں اجے جانی آں وڈے چوہدری ہوراں کول'' (میں ابھی بڑے چوہدری صاحب کے پاس جاتی ہوں)

اِدھر اس نے جانے کے لئے چادر اوڑھی' اُدھر جیدے نے بھی اس کے پیچھے پیچھے جانے کے لئے جوتی پہن لی۔ بٹ صاحب منمنائے۔

''شاہ جی! اب دیکھئے گا' یہ مائی جا تو اپنے قدموں پر رہی ہے' آئے گی دوسروں کے قدموں پر۔''

اب یہاں ہم ایک وضاحت کر دیں کہ اس پیشگوئی کے پورا ہونے کے بعد بٹ صاحب مسلسل اپنے خیالات' احساسات اور محسوسات کا اظہار کرتے رہے اس لئے ہم آپ کو اب ایک آدھ نمونے کا پنجابی مکالمہ ہی پڑھا سکیں گے۔ پہلے لکھے گئے مکالموں کو ہی غنیمت جانئے' جنہیں زیادہ تکلیف ہو وہ خود شہر کے سینما پر جا کر جیدے کو ملنگ بنتے اور بڑھکیں لگاتے دیکھ لیں اور مکالمہ بازی کا ٹھرک پورا کر لیں--- خیر' جیدے کی ماں چوہدریوں کی حویلی پہنچی' چوہدری کے ساتھ اونچی آواز میں دو چار مکالمے بولے۔ غصے میں آ کر چوہدری نے مائی جی کو دھکا دیا' مائی صاحبہ دھکے کی زد میں آ کر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرائیں۔ ماتھے پر ضرب شدید آئی' جیدے نے بڑھ کر ہاتھوں میں تھاما۔ ماں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔

''میرے سوہنیا رہا! غریباں نوں کیوں پیدا کیتا ای؟'' (میرے

اللہ غریبوں کو کیوں پیدا کیا ہے؟)

''چوہدریاں دی مار کھان لئی۔'' ہال سے آواز آئی۔

جیسا کہ بٹ صاحب نے فرمایا تھا کہ بڑھیا کا فلم میں دانہ پانی ختم ہوتا لگتا ہے' ویسا ہی ہوا۔ بڑھیا نے ایک جھٹکے سے گردن ڈال دی۔ ہمیں اس کے یوں اچانک بیت جانے پر پتہ چل کہ عزیزم ملک الموت اپنے پیشے میں نمایاں مشاق ہیں--- جیدا اتنے زور سے ''ماں---'' پکارا کہ ''مری ہوئی ماں'' کی لاش کو ہم نے خود ہلکی سی جھرجھری لیتے ہوئے دیکھا۔ پھر جیدے نے آہستہ آہستہ ماں کی لاش کو فرش پر رکھا' اپنے ہاتھوں پر لگے ہوئے ماں کے خون کو دیکھ کر ایسے ایسے ڈائیلاگ بولے جن سے وضاحت ہوتی تھی کہ اب ہر طرف مظلوموں کا بول بالا اور ظالموں کا منہ کالا ہوگا--- اچانک ہر طرف سے چوہدری کے پالے ہوئے غنڈے نکلنے لگے۔ دیوار کی اوٹ سے' پردے کے پیچھے سے' دروازے کے پیچھے سے' سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اور تو اور ایک ''چھچھ'' لیٹرین سے نکلتا ہوا دکھایا گیا جس کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ شاید اسے بھی احساس تھا کہ لوٹا کوئی بہتر ہتھیار نہیں اس لئے اس نے لوٹا پھینک کر ڈانگ اُٹھالی۔ ہمیں حیرانی اور پریشانی تب ہوئی جب دو عدد ٹٹ پونجیئے خود چوہدری صاحب کے بیڈروم سے برآمد ہوئے لیکن قربان جایئے چوہدری صاحب کے' موصوف کے چہرے پر ملال رمق اور چہرے پر غیرت کی ذرّک تک نہ آئی۔ جب تعداد پوری ہوگئی تو چوہدری پکارا۔

''پھڑلواوہنوں۔'' (پکڑلو اِسے)

بس جی پھر کیا تھا' ڈانگ سوٹے چلنے لگے۔ جیدے کی ماں کیا مری کہ جیدے کے ازل سے بھنگ پی کر سوئے ہوئے غیرت اور جواں مردی کے جراثیم ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لڑائی حویلی سے ہوتے ہوئے' گاؤں کی گلیوں اور کھیتوں سے ہوتی ہوئی' قبرستان کے احاطے میں جا پہنچی۔ بٹ صاحب ہمارے کان میں منمنائے (اصل میں چلائے تھے' سینما کے شور میں منمنائے ہی سمجھئے)

''شاہ جی! جانتے ہیں' قبرستان دکھانے کا کیا مقصد ہے؟''

ہم نے گردن نفی میں ہلائی تو بولے۔ ''اصل میں ڈائریکٹر دکھا رہا ہے کہ اب گاؤں کا قبرستان ترقی کی منازل انتہائی تیزی سے طے کرے گا جس کی بدولت گورکن کا شمار گاؤں کے امیر ترین افراد میں ہوگا۔''

ایک پیچے کا 'بھشم' یعنی گھونسا کھا کر جیدا ملنگوں کی منڈلی میں جا گرا جو مزے سے ''دوری'' میں جہازی سائز کا ڈنڈا گھما گھما کر بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ جیدے نے چند لمحے ڈنڈے' دوری اور ملنگوں کو دیکھا' پھر ڈنڈا اٹھالیا۔ اَب ڈنڈا تھا اور اس کے کمالات۔ تھوڑی دیر بعد چوہدریوں کی 'لیبر' قبرستان میں جا بجا سر پھڑوا اور 'گھنے کھلوا'' کر بیہوش اور نیم بیہوش پڑی تھی۔ چوہدری نے جو یہ ماجرا دیکھا تو اُلٹے پاؤں گاؤں کی طرف بھاگا۔ جیدے نے اُبلتی آنکھوں سے ایک جھٹکے سے اس کی گردن موڑی اور ڈنڈا اس کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔

''اوئے' جھوٹھے چوہدریا---!'' (اوئے چھوٹے چوہدری)

ڈنڈا اُڑتا ہوا چوہدری کی کمر پر لگا اور موصوف وہیں مٹی چاٹنے لگے۔ اس کے بعد ''جیدا دے اور چوہدری لے'' والا معاملہ تھا۔ جیدے نے کچھ اس طرح بذریعہ ''ڈنڈا شریف'' چوہدری کی گوشمالی کی کہ چوہدری کو مشرق' مغرب' شمال' جنوب کی بھی سدھ بدھ نہ رہی۔ جیدے نے چوہدری کو کچھ ایسا جھٹکا' پھٹکا کہ چوہدری کے تمام اعضاء' بشمول گوڈے گٹے جواب دے گئے۔ جیدے نے آخری ڈنڈا چوہدری کی تھوڑی کے نیچے ''ارسال'' کیا۔ چوہدری ہوا میں اُڑتا ہوا ایک تازہ کھدی ہوئی قبر میں جا پڑا۔ یعنی ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا''--- جیدے نے چند لمحے اسے دیکھا' چوہدری نے فوراً گھبرا کر اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کردی۔ جیدے نے آہستہ آہستہ گردن موڑی' کمر کے سامنے ایک پوز دیا' بازو اوپر اُٹھائے اور گردن' جسم اور جبڑوں کو بل پہ بل اور ایکشن پہ ایکشن دیتا ہوا دھاڑا۔

''اوئے' اج توں بعد جیدا' جیدا نہیں' جیدا ملنگ اے۔'' (آج کے بعد جیدا جیدا نہیں جیدا ملنگ ہے)

اسی کے ساتھ سکرین پر نمبر آئے۔ ''چان'' بطور جیدا ملنگ''

یعنی اس کا مطلب تھا کہ جو کچھ ہم نے پہلے دیکھا تھا' وہ ٹریلر تھا' اصل فلم کا آغاز تو اب ہوگا۔ نمبر ختم ہوئے تو جیدے کو ہتھکڑی لگی تھی اور ایک مریل سے ان فٹ سپاہی نے اسے تھاما ہوا تھا جو مسلسل اس کوشش میں تھا کہ جلد از جلد جیدے کو جیل کی سیر کروادے لیکن جیدا روتی ہوئی بہن کو چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس کے سر پر دوپٹہ اور سر پر پیر دیتے ہوئے بولا۔

''اچھا' پینا! رَبّ را کھا'' (اچھا بہنا رَب کی حفاظت میں)

سسکیاں لیتی بہن کو گاؤں کی ایک اور الہڑ مٹیار نے تھام لیا جو ظاہر ہے کہ ابھی ابھی جیدے کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی جس نے جیدے سے نگاہیں ملا کر نگاہوں ہی نگاہوں میں پوچھا تھا۔

''جیدے ویکھیں! لما وچھوڑا نہ پاویں'' (جیدے لمبی جدائی نہ ڈالنا)

بٹ صاحب نے فوراً ہمارے کان میں منہ گھسیڑ کر کہا۔

''شاہ جی! جیسی سچوایشن اور چھیل چھبیلی نار بطور ''بہن'' فلم میں ڈالی گئی ہے' مجھے تو جیدے کی بہن کی عزت اور جان دونوں خطرے میں لگتی ہیں۔''

ہم فوراً سنبھل کر بیٹھ گئے' کیونکہ بٹ صاحب کوئی بات منہ سے نکالیں اور وہ پوری نہ ہو ''ایسے تو حالات نہیں'' --- ہم نے دل ہی دل میں دُعا مانگی' وہ بھی سچے دل سے کہ یا اللہ! بھلے موصوفہ کی عزت چلی جائے' اس کی جان کی حفاظت کرنا کہ کسی کی دردناک اور المناک وفات حسرت آیات کو دیکھنے کا ہمارا یارا نہیں۔

خیر' اُدھر جیدے کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا گیا' اِدھر چوہدری کے بیٹے اور فلم کے اصلی وِلن نے (جو اس تمام عرصے میں شہر گیا ہوا تھا) اپنے جملہ حواریوں کے ساتھ جیدے کے گھر شب خون مار دیا۔ پہلے مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی اور پھر اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے جیدے کی بہن کاندھے پر اُٹھائی۔ اگلے سین میں اس نے جیدے کی بہن کو ''ٹھاہ'' کر کے پلنگ پر پٹخا اور اس سے بھی زیادہ زور سے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اب سارے کمرے میں ''لکن میٹی'' کھیلی جانے لگی۔ پورے ہال میں اِک ہو کا عالم طاری تھا' یقین واثق ہے کہ ہمارے ساتھ ساتھ پورا ہال اللہ کے حضور دُعا گو تھا کہ یا اللہ! جیدے کی بہن کی جان پر کوئی حرف نہ آئے' بھلے عزت پر آ جائے --- وہ کیا کہتے ہیں کہ ''جیدے کی بہن کب تک خیر منائے گی' کبھی تو پکڑی جائے گی'' کے مصداق اندھے کے ہاتھ کے بٹیرا لگ ہی گیا۔ وِلن کے ہاتھ میں اُس کی کلائی آ گئی۔ کلائی کیا سمجھئے' خود پوری کی پوری آ گئی۔ اچانک وہ چلائی۔

''جیدے ---!''

فلم کے دِلفریب مناظر میں کھوئے ہوئے ناظرین کے ساتھ ساتھ جیل کی سنگی دیواروں کے پیچھے سویا ہوا جیدا بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو اس نے گواچی گاں کی طرح اِدھر اُدھر بے سود ٹانگیں ماریں' پھر فلم کے ''شیر'' نے دروازے کی آہنی سلاخوں کو پکڑ کر یوں موڑ ڈالا جیسے وہ فولاد کی بجائے ربڑ کی بنی ہوں۔ اِدھر جیدے نے قدم ٹوٹے دروازے سے باہر رکھا' اُدھر ایک سپاہی نے اُسے دیکھ کر سیٹی بجا دی۔ سائرن بجتے رہے' سپاہی راستہ روکتے رہے لیکن جیدا غیرت میں سرشار' سب کو روندتا پھلانگتا جیل کی سب سے اونچی دیوار سے بھی ''علی مولا'' کا نعرہ لگاتے کود گیا۔ وہ شعر شاید قبلہ جیدا جی کے لئے ہی کوئی کہہ گیا تھا کہ ---

ارادے جن کے پختہ ہوں' نظر جن کی بہن پر ہو
وہ جیل کی دیواروں اور سپاہیوں سے گھبرایا نہیں کرتے

سڑک پر آتے ہی جیدے نے گاؤں کی طرف منہ کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ اب ایک بار یہ دکھایا جاتا کہ جیدا بہن کی عزت بچانے کے لئے دیوانہ وار گاؤں کا رُخ کیے بھاگ رہا ہے اور ساتھ ہی دوسرے سین میں اُس کی بہن کو اپنی عزت کی حفاظت کے لئے ''بھاگ دوڑ'' کرتے دکھایا جاتا۔ ہال میں ایک بار پھر موت کی سی خاموشی طاری تھی' ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ دیکھئے اب کیا ماجرا ظہور پذیر ہوتا ہے --- ایک سین میں جب دوبارہ جیدے کی بہن وِلن کے بازوؤں سے تڑپ' پھڑک اور مچل کر نکل گئی تو ایک ہم جیسے تماشائی سے برداشت نہ ہو سکا' سیٹ سے کھڑا ہو کر ولن سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اوئے' جلدی کر' ٹائم گھٹ تے کم زیادہ ای۔''

اسی بات کو پلے باندھ کر ولن نے بھرپور حملہ کیا۔ اب سچوایشن کچھ یوں تھی کہ اب یا تو آگے بڑھ کر جیدے کی بہن وِلن کو اپنی عزت کا نذرانہ پیش کر دیتی یا پھر پیچھے ہٹ کر کھلی کھڑکی سے کود کر اپنی جان کا نذرانہ۔ نامراد نے ایک بار اپنے دشمن کو ڈبڈبائی نظروں سے دیکھا' پھر ایک چیخ ماری اور کھڑکی سے کود گئی۔ اِسی اثناء میں محترم جیدا صاحب بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے فوراً بہن کو جھولی میں بھر لیا۔ ماتھے سے خون پونچھا' سینے سے لگایا' پیار سے بالوں کو بوسہ دیا اور اس سے پہلے کہ جیدا جی کچھ اور پیار بھری حرکتیں کرتے' اس نے خون کی اُلٹی کی' بازو کھڑکی کی طرف اُٹھایا' آخری ہچکی لی اور اللہ کو پیاری ہو گئی۔ جیدے نے آہستہ آہستہ بہن کو زمین پر لٹایا' گردن کو اوپر اُٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں وِلن کھڑا خباثت بھری ہنسی ہنس رہا تھا۔ اس کی ہنسی میں کچھ ایسی کھنکی بھری ہوئی تھی کہ خود ہمارا جی بھی چاہا کہ پردہ سکرین پر جا کر اُسے دو جوتے ٹھونک آئیں لیکن جب حساب سود وزیاں کیا تو زیاں ہی زیاں نظر آیا تو باقی کی تمام عملی کارروائی جیدے ملنگ کے سپرد کر کے ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو رہے --- اچانک جیدے کا چہرہ پوری سکرین پر اُبھرا' اُس کا رُخ ہال کی طرف تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ اُوپر اٹھائے اور چیخا۔

''اوئے' بے غیرتا ---!''

پورے ہال میں ایک کونے سے لے کر بوکھیں لگیں اور دھالیں پڑنے لگیں حالانکہ حق تو یہ بنتا تھا کہ ہم تو حمایتی ہیں' جب بھی گالیاں وِلن کے حضور پیش کرنی ہوتی ہیں' آپ اپنا تھوبڑا مبارک ہم جملہ ناظرین کی طرف کیوں کر لیتے ہیں --- جب فلم کے دوران پانچویں ساتویں بار یہی سلسلہ چلا تو ہم سے نہ رہا گیا' ہم نے بٹ صاحب کو جو بڑے آرام سے فلم دیکھ رہے تھے' کہا۔

''بٹ صاحب! آخر گالیاں دیتے وقت ولن یا ہیرو حاضرین کی طرف رُخ کیوں کر لیتے ہیں' گالیاں دینے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں؟''

''یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔''

بٹ صاحب اطمینان سے فلم دیکھتے ہوئے بولے۔ بٹ صاحب کا یہ جواب بالصواب سننے کے بعد باقی فلم میں پڑنے والی گالیاں یہ سوچ کر برداشت کرتے رہے کہ بیچاروں کو گالیاں دینے کا اس سے آسان طریقہ نہیں آتا---اچھا آگے سنئے۔''اوئے بے غیرتا!'' کہنے کے بعد جیدا ملنگ اور ولن کے چمچوں کے درمیان ''ٹھشم ٹھشم ٹھاہ'' ہونے لگی۔ جیدا مار دھاڑ کرتا ولن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جیدے نے ولن اور ولن نے جیدے کو پوز بنا بنا کر دیکھا' آخر جیدا بولا۔

''اوئے میری پین دا دوپٹہ واپس کراوئے۔'' (میری بہن کا دوپٹہ واپس کراوئے)

ہمارا منہ بن گیا' ہم نے بٹ صاحب کے کان میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

''بٹ صاحب! عجب گدھا ہے' بجائے بہن مانگنے کے اُس کا دوپٹہ مانگ رہا ہے۔''

جواب میں بٹ صاحب نے ہمارے کان میں ''بلند آہنگ'' میں سرگوشی کی۔

''شاہ جی! اصل میں گدھے تو آپ ہیں' جیدا تو دوپٹہ اس لئے مانگ رہا ہے کہ اُسے بہن کی عزت کی نشانی سمجھ کر آنکھوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو سکے اور بعد میں اُسے کفن کی شکل دے کر بہن کو سپردِ خاک کر سکے اور بہن اس لئے نہیں مانگ رہا کہ اس نے تو وہ خود ہی گھاپڑی چھوڑ کر آیا ہے۔ جب چاہے گا' کاندھے پر اُٹھا کر لے جائے گا۔ دونوں صاحبان نے پہلے تو ایک دوسرے کو زبانی کلامی بذریعہ ڈائیلاگ ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی' بعد ازاں کچھ ایسے جی جان سے لڑے کہ دونوں کے ناک منہ سے خون چھوٹ پڑا۔ آخر غیر تمندی نے بے غیرتی پر فتح مبین پائی لیکن اس سے پہلے کہ ہاتھ آئی کلہاڑی سے جیدا بے لمبڑ (ولن) کی گردن اڑاتا' پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی حویلی کے باہر آموجود ہوئیں۔ جیدے نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی' دشمن اور بہن کی لاش کو وہیں چھوڑ کر فرار ہوتے ہوئے بولا۔

''اوئے لمبڑ! زندگی رہی تے اے میدان فیر لگے گا۔'' (زندگی رہی تو پھر تمہیں دیکھوں گا)

ہم نے فرار ہوتے ہوئے جیدے کو دیکھا اور بٹ صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

''بٹ صاحب! ہماری پولیس تو تب پہنچتی ہے جب لڑائی خود ہی مخالف کی فوتگی پر اختتام پذیر ہو جاتی ہے' یہ فلمی پولیس تو بلا کی فرض شناس ہے' عین موقع پر ''وقت'' سے پہلے ہی پہنچ گئی۔''

بٹ صاحب بولے۔''قربان جایئے' آپ کا مطلب ہے کہ جیدے یا بلے میں کوئی پر لوک سدھار جاتا تو پہنچتی؟ شاہ جی! اگر دونوں میں سے کوئی ایک مر جاتا تو باقی فلم کیسے چلتی اور بقیہ بچنے والے پونے دو گھنٹے شائقین گائے سوپ کے اشتہار دیکھتے؟''

''چونکہ ''بلالمبڑ'' دھرتی اور غریبوں کی چھاتی پر مونگ دلنے کے لئے زندہ تھا اس لئے مجبوراً جیدا سچ مچ دھرتی کا ملنگ بن گیا۔ یعنی عرف عام میں اشتہاری ہو گیا۔ ایک عدد کلاشنکوف اور ایک عدد رقیب روسیاہ سے بھی زیادہ سیاہی مائل گھوڑا بھی اُس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ کلاشنکوف کی خوبی یہ تھی کہ اس میں سے گولیاں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں' دشمن خود ہی تھک ہار کر ختم ہو جاتے تھے اور رہا گھوڑا تو وہ افضل الحیوان پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر جو ہنہناتا تو ہنہناتا ہی جاتا۔ کئی بار جب اس منہ پوری سکرین پر چھا جاتا تو اس کے بند منہ سے بھی ''چیں ایں' چیں ایں'' ہوتی رہتی۔ واللہ اعلم' خود جیدا جی ''چیں ایں' چیں آں'' کر کے ہنہنانے کا شوق فرماتے ہوں---جہاں بھی ظلم ہوتا' جیدا جی بن بلائے مہمان کی طرح جا دھمکتے۔ غریبوں کے چہرے پرائے دیکھتے ہی ست رنگی شفق چھا جاتی اور ظالموں' جاگیرداروں کے چہروں پر مایوسی' افسردگی اور زردی چھا جاتی۔ جیدے کا خوف اِن پر کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ اب عیاش جاگیردار' عیاشی کے لئے کسی کی بہو بیٹی کو بُری نیت سے اُٹھا لاتا یا اُٹھوا لاتا تو ساری رات کمرے کی بجائے چھت پر بندوق تھامے خوف سے تھر تھر کانپتے گزار دیتا کہ کہیں جیدا تو نہیں آ رہا اور تو اور غلط مخبری کے نتیجے میں جیدا ایک رات ایسی جگہ جا پہنچا جہاں ظالم جاگیردار اپنی منکوحہ حد سے ''حجاب من وتو'' اُٹھانے میں مصروف تھا۔ جیدے نے کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور کلاشنکوف جاگیردار کی طرف اُٹھاتے ہوئے دھاڑا۔

''اوئے اے ظلم نئیں ہوسکدا۔'' (یہ ظلم نہیں ہوسکتا)

جیدے کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر جاگیردار اتنا گھبرایا' تھرتھرایا کہ بیچارے کے ہوش وحواس کے تمام قمقمے ایکا ایکی بجھ گئے تھے۔ جیدے کے قدموں میں گرتے ہوئے کانپتے اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں بولا۔

''جیدے! پاویں اینوں پچھ لے' اے میری سکی پین اے۔'' (جیدے چاہے اِس سے پوچھ لو یہ میری سگی بہن ہے)

جیدے! کی ان تمام کوششوں کے باوجود پوری فلم میں پاکدامن

بیبیوں کی عزتوں اور عصمتوں پر اتنے حملے ہوئے کہ ان کی بدولت کمرہ عدالت سے، فلمساز اور ڈائریکٹر سمیت فلم میں کام کرنے والے ہر چھوٹے بڑے اداکار، اداکارہ کے حصے میں دو دو پھانسیاں آنا تو معمولی سی بات تھی۔

یوں تو ساری فلم ہی ایکشن اور سسپنس سے بھرپور تھی لیکن ہم نے اس بات کو محسوس کیا کہ اکثر واقعات کے کلائمکس پر پروجیکٹر سے آنے والی روشنی آف ہو جاتی۔ ایسا ہوتے ہی ہال میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا۔ ایسے ایسے سنگل پسلی افراد بھی کیمرہ آپریٹر کو ماں بہن کی گالیاں دینے لگتے جنہوں نے کبھی اکیلے میں اپنے آپ کو بھی گالی دینے کی جرأت نہ کی ہوگی۔ کچھ لوگ اپنی سیٹوں سے اُٹھ کر اپنے ہاتھوں سے انہیں زور زور سے بجانے لگتے اور کچھ ہم جیسے تصوّر کی آنکھ سے دیکھتے رہے کہ اب فلم میں کیا ہو رہا ہوگا۔ ادھر روشنی آتی، ادھر ہال میں خاموشی چھا جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایسے ہی وقفے کے دورانیے میں ہم نے بٹ صاحب سے کہا۔

''بٹ جی! کیمرہ آپریٹر کی نوکری تو بہت بڑی آزمائش کا کام ہے۔ چند ٹکوں کے لئے کیسی کیسی گالیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اوپر سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا؟''

بٹ صاحب نے ہمارے کاندھے پر تھپکی دی اور بولے۔

''بھولے بادشاہو! کیمرہ آپریٹر کا حال اُس واپڈا اہلکار جیسا ہے جس کے ذمے ''بجلی آف'' کرنے کی ذمہ داری ہے۔ وہ بھی سوئچ آف کرنے سے پہلے کہتا ہے کہ ''جو بھی مجھے گالیاں نکالے اس کی بھی---- یہی حال فلم چلانے والے کا ہے۔ وہ فلم چلانے سے پہلے ہی جملہ حاضرین و ناظرین کو گالیوں کے گھٹر بنا کر ارسال کر دیتا ہے۔

فلم اور گانوں کے بغیر مکمل ہو جائے، ناممکن ہے۔ جیدا ملنگ میں بھی پانچ سات گانے ڈالے گئے تھے۔ ''ڈالے گئے'' اس لئے کہا ہے کہ فلم میں شاید اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ اتنے وقت کے بعد گانا ہونا چاہیے، سچوایشن کوئی بھی ہو۔ مثلاً ایک سین میں دکھایا گیا کہ جیدا اپنے قریبی عزیز کی ''بلے لمبڑ'' کے ہاتھوں ''زبردستی فوتگی'' کے بعد اس کے جنازے میں شرکت کرنے جا رہا ہوتا ہے کہ ہیروئن کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور ہیروئن اپنے پیار کے نشے میں چور یہ جانے اور سوچے بنا کہ جیدا کتنا دکھی اور رنجور ہے، گانے لگتی ہے۔

ماہیا آ، آ، آ ماہیا وے، میں مرگئی آں، آں، آں، آں''

اسی کے ساتھ پورے ہال میں لڈیاں اور بھنگڑے شروع ہو گئے۔ ہال کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ''آ'' آ'' آ'' اور ''آں' آں' آں'' ہونے لگی۔ بعض منچلے تو پردہ سکرین کے سامنے، یعنی سٹیج پر پہنچ کر اداکارہ ''قائمہ'' کو رقص کے میدان میں دعوت دینے لگے۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ جب بھی کوئی گانا شروع ہونے لگتا، فوراً گھنگور گھٹائیں چھا جاتیں، بارش شروع ہوتی تو اس وقت تھمتی جب گانا ختم ہوتا البتہ اس کی بدولت ''انگ رنگ پھڑ کے میرا'' کی قبیل کے گانے میں اداکارہ ''نرجس'' کو انگ انگ پھڑکانے اور تماشائیوں کو تڑپانے میں نہایت سہولت رہتی لیکن قربان جایئے جیدے کے جو ''مرغ پلاؤ'' سامنے ہونے کے باوجود ہاتھ بڑھانے کو مردانگی کے خلاف جانتا تھا۔ قائمہ یا نرجس اس کے اردگرد ٹھمکے لگا لگا کر ہلکان ہو جاتیں لیکن وہ اللہ کا بندہ کلاشنکوف کو ہاتھ میں لے کر کبھی دائیں ہو جاتا اور کبھی بائیں۔ کبھی مونچھوں کو بل دینے لگتا اور کبھی مسکرا کر ہاتھ سے وھت تیرے کی کا اشارہ کرتا اور آخر میں گھوڑے پر سوار ہو کر موقعہ واردات سے فرار ہو جاتا اور گانا گا کر رجھانے والی کسی درخت کے تنے سے ماتھا لگا کر ٹسوے بہانے لگتی۔ جیدے کو یوں آگے پیچھے ہونے کے متعلق ہم نے بٹ صاحب کچھ نہیں پوچھا، خود ہی فرمانے لگے۔

''شاہ جی! جانتے ہیں کہ جیدا ملنگ اپنی ملنگنی سے کیوں دور دور رہتا ہے؟'' ہم نے نفی میں سر ہلایا جو اندھیرے میں شاید ہی بٹ صاحب دیکھ سکے ہوں۔ بٹ صاحب خود ہی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔ ''جیدے نے شاید کسی ''خلیفہ جی'' کی بات پلے باندھ لی ہے۔ اکثر خلیفہ حضرات اپنے شاگردوں کو دوران تربیت تلقین کرتے ہیں کہ عورت ذات سے دور رہنا ورنہ ''گھریلو کشتی'' کے قابل ہی رہ جاؤ گے---اب اگر جیدا ہیروئن کے جھانسے میں آ جائے تو بچوں کی لائن تو شاید لگا لے، دشمنوں کی لاشوں سے خاک میدان لگائے گا۔''

بٹ صاحب کے تبصروں سے ہم تو خاصے محظوظ ہو رہے تھے لیکن اردگرد کے تماشائی ہماری کھسر پھسر سے خاصے نالاں اور چیں بہ چیں نظر آتے تھے۔ ایک آدھ نے تو خاموشی سے فلم دیکھنے کی استدعا بھی کی جسے ہم نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جب وہ ہر پانچ منٹ بعد اپنی سیٹ سے اُٹھ اُٹھ کر بڑھکیں لگاتا ہے تو ہم نے تو اسے منع نہیں کیا---اسی طرح ایک موقع پر جب جملہ تماشائی حضرات کو لڑائی بھڑائی اور ٹھکائی دیکھتے ہوئے بیس پچیس منٹ ہو چکے تھے ان کی تفریح کے لئے ادارہ ''نرجس'' کو انتہائی مختصر لباس میں اداکار ''چان'' کے سامنے لا کھڑا کیا گیا۔ نرجس کی تو لاٹری نکل آئی اور جملہ تماشائیوں کی اُمید بر آئی۔ دُور دُور تک آسمان صاف شفاف تھا، بادل کہیں دُور بحیرہ عرب پر گرج برس رہے تھے لیکن چونکہ نرجس کا ناچ گا کر یار کو منانے کو موڈ تھا اس لئے بادلوں

کے فرشتے فی الفور انہیں مارتے پیٹتے وہاں لے آئے جہاں اداکارہ نرجس زبردستی جیدا جی کو اپنے دو نمبر محبت کے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی (کیونکہ سیکنڈ ہیروئن تھی، فسٹ ہیروئن اداکار قائمہ تھی۔ ظاہر ہے، اُس کا حق کہیں زیادہ تھا)--- گانا شروع ہوا، بارش برسنے لگی۔ گانا کچھ ایسا ہی تھا۔

"ہبلو پا، پا، پا---ہبلو پا آ......"

گانا شروع ہوتے ہی ہال میں موجود نوجوانان وطن لڈیاں، دھمالیں اور بھنگڑے ڈالنے لگے۔ ایک بار تو ہمارے سرد جسم میں بھی گرمی کی برقی رو دوڑ گئی جب موصوفہ نے ایک واہیات پوز دے کر اپنی کمر کو چک پھیریاں اور گھمن گھیریاں دیں اور اوپر سے یہ ظلم کیا کہ بدن سے چپکے لباس کو ایک ایک کر کے اُتارنا شروع کر دیا۔ کچھ موسم کی گرمی، کچھ ہیروئن کی بے شرمی کی بدولت ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چپ لگ چکی تھی۔ ہر بندے کی خواہش تھی کہ کاش! نرجس پردہ سکیں کی بجائے اُن کے سامنے ہوتی تو وہ تارک لباس ہونے میں اس کی مدد کر کے ثواب دارین کماتے--- اس سے پہلے کہ نرجس جذبات میں آ کر کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی، اداکار "جان" نے اُسے زور سے دھکا دیا۔ نرجس کیچڑ میں جا پڑی اور اسی کے ساتھ گانا ختم ہو گیا۔ یعنی کھیل ختم پیسہ ہضم۔

فلم چونکہ ایکشن اور سسپنس پر مبنی تھی اس لئے ہر دس منٹ بعد لڑائی کا ڈول ڈالا جاتا اور جب اینڈ ہونے لگتا تو سسپنس ڈال کر اُس لڑائی کو آئندہ پر ٹال دیا جاتا۔ کبھی بلکہ اکثر پولیس پہنچ جاتی (کیونکہ لڑائی کو ٹالنے کا یہ آسان نسخہ تھا) کبھی درمیان میں قائمہ (جان کی ہیروئن) اور نرجس "بلے لمبڑ کی بہن" آ جاتی اور دونوں کو سمجھاتی ہوئی بازو سے پکڑ کر لے جاتیں کہ "چلو مٹی پاؤ"--- ایک دو بار زخمی وِلن کو اس کے ساتھی اُٹھا کر لے گئے، ایک بار جب لڑتے لڑتے دونوں میدانی علاقے سے پہاڑی علاقے (ڈائریکٹر کی مرضی) میں جا نکلے۔ پہاڑ کی چوٹی پر لڑائی ہو رہی تھی، نیچے دریا بہہ رہا تھا، دُور دُور تک پولیس، قائمہ، نرجس اور چچوں کا نشان تک نہ تھا۔ مجبوراً ڈائریکٹر نے بلے لمبڑ کو دریا میں چھلانگ لگوا دی۔ جیدے ملنگ نے فتحیابی کی بڑھک لگائی ہاتھ جھاڑے، آنکھوں میں خوشی کی چمک لئے گھر واپسی کی راہ لی لیکن "جسے ڈائریکٹر رکھے اُسے کون چکھے"--- اگلے دن بلا لمبڑ بجائے قبر میں لیٹا ہونے کے، ہسپتال کے بستر پر لیٹا ننھی منی پریوں سے "ٹریٹمنٹ" لے رہا تھا۔

فلم نام مکالمہ نویسی کا۔ جس فلم کے مکالمے جاندار ہوں، اس کے ہٹ ہونے کے چانسز سو فیصد بڑھ جاتے ہیں۔ اس فلم کے مکالمہ نویس کی جودت طبع کی داد نہ دینا زیادتی ہو گی ایسے ایسے نادر الوجود قسم کے مکالمے لکھے تھے کہ کئی دفعہ ہم انہیں سن کر بھونچکے رہ گئے تھے۔ زیادہ نہیں صرف ایک سین کے مکالمے آپ کی تفریح طبع آپ کو سنا دیتے ہیں ---سین کچھ یوں تھا کہ جیدا اور بلا دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں اپنی درگت بنوا کر ہسپتال کے ایک ہی کمرے میں خون کی بوتلیں چڑھوائے پڑے ہیں۔ دونوں کو اکٹھے ہی ہوش آتی ہے۔ آہستہ آہستہ گردنیں موڑ کر وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، پھر دونوں ایک دوسرے پر غراتے ہوئے یہ خیال کئے بنا کہ وہ اس وقت انہیں جا اور بے جا ئی جگہوں پر سوئیاں لگی ہوئی ہیں، اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قائمہ اور جیدے کے دو چار حواریوں نے جیدے کو پکڑا اور نرجس نے بلے کو تھام لیا۔ اب مکالمے سنئے اور سر دھنیے۔

بلا لمبڑ: اوئے، ڈاکٹرا! (ڈاکٹر صاحب کی ٹانگیں واضح طور پر کانپتی ہوئی ہم نے دیکھیں) تینوں پتہ نئیں سی، ایتھے بلا لمبڑ داخل ہویا اے، اوہدے دشمن نوں اوہدے نال پا کے اپنے آپ تے ظلم کیتا ای، ظلم کیتا ای۔

جیدا: اوئے، قضاء تینوں میرے سامنے جے فیر لے ای آئی اے--- اوئے، میں تینوں ایسی طراں ماراں گا کہ ہسپتال دی کوئی بوتل تے کوئی ٹیکہ وی تینوں نئیں بچا سکے گا (اگر موت تمہیں میرے سامنے لے ہی آئی ہے تو میں تمہیں اس طرح ماروں گا کہ ہسپتال کی کوئی بوتل اور ٹیکہ بھی تمہیں نہیں بچا سکے گا)

بلا لمبڑ: اوئے، اجے اُو ماں جمی ای نئیں، جیہڑی بلے لمبڑ نوں مارن آلا پتر جم سکے۔ (ابھی وہ ماں پیدا ہی نہیں ہوئی جو بلے لمبڑ کو مارنے والا بیٹا پیدا کر سکے)

جیدا ملنگ: اوئے، اُو ماں جمی وی سی، تے اوہنے پتر وی جمیا سی جیدا ناں ای، جیدا ملنگ، جیدا ملنگ (ماں بھی پیدا ہوئی تھی اور اس کے بیٹے کا نام ہے جیدا ملنگ)

بلا لمبڑ: اوئے، کدی چڑی دے ہتھوں باز وی مریا اے؟ (کبھی چڑیا کے ہاتھوں باز بھی مرا ہے؟)

سوال و جواب

"حوا غزل کا شعر ہے اور مرد نثر پارہ۔ نثر پارہ جیسا ہوتا ہے ویسا ہی رہتا ہے مگر شعری مطلب تو ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا پڑھنے والا لے۔ ویسے ہمارے ہاں دو غزلے سہ غزلے اور چہار غزلے کی قانونی اجازت ہے مگر کوئی دو مضمونہ، سہ افسانہ یا چہار افسانہ بننے میں نہیں آیا۔ چوری چھپے کی بات اور ہے۔"

(ڈاکٹر یونس بٹ کی "شناخت پریڈ" سے اڑایا گیا)

شکیل عادل، ملتان

جیدا ملنگ: اوئے' اَج ایس چوتھے باز نوں اے چڑی ضرور مارے گی۔ اوئے' میں ہسپتال دیاں چھریاں تے بغدیاں نال تیریاں بوٹیاں کر دیاں گا تے اونہاں بوٹیاں وچوں آواز آئے گی' جیدا ملنگ' جیدا ملنگ---اوئے جیدا ملنگ---!'' (آج جھوٹے باز کو یہ چڑیا ضرور مارے گی' میں ہسپتال کے بغدوں اور چھریوں سے تمہاری بوٹیاں کردوں گا۔ ہر بوٹی سے آواز آئے گی' جیدا ملنگ' جیدا ملنگ)

بلا لمبڑ: ''اوئے' میں وی تیریاں بوٹیاں کردیاں گا تے اونہاں بوٹیاں نوں کتیاں اَگے پا دیاں گا تے اُو اونہاں نوں کھا کے کرن گے---(میں بھی تمہاری بوٹیاں کر کے کتوں کو ڈال دوں گا وہ ان کو کھا کے کریں گے) ہمارے ساتھ ساتھ خود جیدا جی بھی منہ اٹھا کر بلے لمبڑ کو دیکھنے لگا کہ میرے لذیذ گوشت سے فیضیاب ہونے بعد جملہ کتا حضرات میں کیا تبدیلی رونما ہوگی۔ بڑے عرصے بعد بٹ صاحب کو بولنے کا موقعہ ملا' کان میں بولے۔

''شاہ جی! اس تبدیلی کے سوا کیا ہوگا کہ کتے جیدے ملک کے گوشت سے انصاف کرنے کے بعد اور کتے ہو جائیں گے۔''

لیکن قربان جایئے مکالمہ نگار صاحب کے کہ انہوں نے ایسا مکالمہ لکھا کہ جو ہمارے وہم وگمان میں بھی تھا اور ہم حیرت سے اُنگلیاں منہ میں ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بلا لمبڑ بولا۔

بلا لمبڑ: ''اوئے' تیریاں بوٹیاں کھا کے' تے ہڈیاں کچر مچر کر کے اُو دی کرن گے۔ واوٗ' واوٗ' واوٗ۔''

ہمارا منہ بن گیا۔ بھلا کوئی مکالمہ نویس صاحب سے پوچھے کہ پہلے کیا سگ حضرات عربی' فارسی بولتے تھے؟---از قصہ مختصر' جب فلم دو گھنٹہ پندرہ منٹ چل چکی تو اسی کے ساتھ جملہ تمام اداکاروں کی قضا بھی آسمان سے چل پڑی۔ آخری لڑائی میں پہلے تو پیادے عرف عام میں چچوں کا انتقال پر ملال ہوا۔ بلے لمبڑ نے جیدے پر گولی چلائی تو اس کی بہن نرجس نے جیدے کے سامنے آ کر خود کو اس پر قربان کر دیا۔ ظاہر ہے' قائمہ بی بی پیچھے کیوں رہتی' وہ بھی جیدے پر انا للہ ہو گئی۔ اب میدان میں دو ہاتھی رہ گئے۔ باقی پندرہ منٹ وہ ایک دوسرے کو رگیدتے رہے' آخر فلم کے اختتام سے تین منٹ پہلے جیدے نے بلے لمبڑ کو نیچے گرا ہی لیا اور ابھی اس کے سینے پر چڑھ کر خنجر اس کے سینے پر کھونپنا ہی چاہتا تھا کہ پولیس پہنچ گئی لیکن اب پولیس بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ فلم ختم ہونے میں دو منٹ رہ گئے تھے۔ اِدھر جیدے نے خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھایا' اُدھر تھانیدار پکارا۔

''جیدے! اپنے آپ نوں قانون دے حوالے کردے۔''

لیکن جیدے نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کی بجائے' بلے لمبڑ کو اللہ کے حوالے کرنا بہتر سمجھا۔ پانچ خنجر اس کے سینے پر جمائے اور تھانیدار سے پانچ اپنے جسم پر کھائے۔ پھر اس کے سینے سے اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے قائمہ کی طرف چل دیا' آخر ساری فلم میں وہ اس کے آگے پیچھے ٹھمکے لگاتی اور اپنے سچے پیار کا یقین دلواتی رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا۔ اس کا سر اُٹھا کر گود میں رکھا' ماتھے کا بوسہ لیا اور اسی کے ساتھ لڑھک گیا۔ اسی کے ساتھ ہال کی بتیاں جل اُٹھیں اور پردے پر ''ختم شد'' کا سلوگن آ گیا۔

سیالکوٹی دروازے سے تکوں کبابوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بٹ صاحب بولے۔

''شاہ جی! بڑی مزیدار فلم تھی۔'' ساتھ ہی لیگ پیس کو دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالا۔

ہم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں جی---''

''بڑی ترقی کر لی ہے' پاکستانی فلم انڈسٹری نے۔'' پورا کباب روغنی نان کے ایک نوالے کے ساتھ منہ میں ٹھونستے ہوئے بولے۔

''ہاں بڑی ترقی کر لی ہے۔ عالم شباب میں ہم نے ایک پنجابی فلم دیکھی تھی۔''

''تو کیا فرق محسوس کیا؟'' بٹ صاحب مسلسل منہ چلاتے ہوئے بولے۔

''وہ ''کالی'' تھی' یہ رنگین ہے۔'' ہم نے منہ بنا کر کہا۔

ہم نے کھانے کا بل ادا کیا اور کاغذ پر اس کا اندراج کر کے ٹوٹل بٹ صاحب کو بتایا کہ مبلغ پانچ سو روپیہ سکہ رائج الوقت ہمارے خرچ ہو چکے ہیں۔ بٹ صاحب نے ایک تجاہل عارفانہ سے ہمیں دیکھا اور بولے۔

''آپ وہ کیا فقرہ بولا کرتے ہیں' حساب دوستاں والا؟''

''حساب دوستاں دَر دِل است۔'' ہم نے کہا۔

''تو دوستوں میں کیسا حساب کتاب؟ یہ امریکن سسٹم امریکیوں کو ہی مبارک ہو' مشرقیوں کو مغربی انداز راس نہیں آتے---'' پھر ہمارے بجھتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بولے۔ ''فکر نہ کریں' اگلی فلم میں آپ کو دکھا دوں گا۔''

دوستو! ہماری طرف سے آپ ہی سفارش کر دیں بٹ صاحب سے کہ وہ فلم دکھانے کی بجائے امریکن سسٹم کے تحت ہمیں ڈھائی سو روپے کی رقم نقد ادا کر دیں' دُعائیں دیں گے۔

☆☆

☆ خادم حسین مجاہد

از نوابی تا قصابی

محترم ڈائریکٹر صاحب! آداب!

آپ کو انتہائی رازداری سے مطلع کیا جاتا ہے کہ مابدولت نے چند دن قبل ایم اے کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے کلیئر کرلیا ہے۔ اس اہم خبر کو ہم نے اب تک پریس سے چھپا رکھا ہے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ اس راز کے آؤٹ ہوتے ہی ہمارے پاس چھوٹے چھوٹے محکموں کے سربراہان کی بھیڑ لگ جائے جو ہمیں مجبور کریں کہ ہم ان کے ہاں خدمات سرانجام دیں۔ دراصل ہم اپنی اعلیٰ صلاحیتیں چھوٹے چھوٹے محکموں میں ضائع نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ ہمارے ٹیلنٹ سے ملک کے کسی بڑے ادارہ کو فیض پہنچے سو آپ خوش نصیب ہیں کہ اس کے لئے ہم نے آپ کے ادارے کو منتخب کیا ہے۔ برائے مہربانی اپوائنٹمنٹ لیٹر جلد از جلد بھجوا دیجئے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر کوئی اور ادارہ ہمیں لے اڑے۔

خیراندیش

مغرور فخری ایم اے

مغرور فخری نے اس مضمون کے خط کی چار کاپیاں تیار کیں اور ملک کے چار اعلیٰ اداروں کے ڈائریکٹرز کے ایڈریس لکھ کر پوسٹ کر دیں اور یہ فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا کہ کس ادارے کی قسمت میں اس جیسے جینئیس (Gentus) کی سرپرستی قبول کر کے ترقی کی معراج پر پہنچنا لکھا ہے---خط پوسٹ کرنے کے بعد جب وہ باوقار انداز میں چلتے ہوئے کم تعلیم یافتہ پبلک کے پاس سے گزرا تو ان غیر مہذب لوگوں نے اپنی ناشائستگی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

"یہ مغرور نے گردن میں سریا فٹ کرالیا ہے؟" ایک بولا۔

"تمہیں نہیں پتہ، یہ ماسٹر ہو گیا ہے۔" دوسرے نے معلومات بہم پہنچائی۔

"ارے، کس سکول میں---کیا تعلیم بالغاں میں---؟"

"ابے نہیں، وہ والا ماسٹر نہیں، ایم اے والا ماسٹر آف آرٹس---!"

"اچھا، اچھا---تبھی میں کہوں پہلے تو اس کا قد اتنا اونچا نہ تھا۔" اس نے شرانگیزی کی کوشش کی۔

مغرور فخری اچھی طرح جانتا تھا کہ جب سے اس نے اپنے محلے کے پہلے ایم اے پاس نوجوان کا اعزاز حاصل کیا تھا، اس کے حاسدوں کی تعداد اس کے دوستوں کی تعداد سے کئی گنا بڑھ گئی تھی لیکن اس نے ان غیر مہذب اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے منہ لگنے سے احتراز کیا کہ یہ ہرگز اس کے شایان شان نہ تھا اس لئے وہ ان پر نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا باوقار انداز میں آگے نکلتا چلا گیا۔

دو ماہ تک مغرور نے گردن کے پٹھوں کو "اضافی ورزش" پر مامور رکھا مگر جب اتنے دن گزرنے کے بعد بھی اسے کسی ڈائریکٹر کا جواب موصول نہ ہوا تو گردن کی اونچائی میں آہستہ آہستہ کمی ہونے لگی۔ بہرحال، اس نے سوچا کہ ان اداروں میں اس کے شایان شان کوئی عہدہ نہ ہونے کے باعث انہوں نے شرمندگی میں جواب نہ دیا ہوگا لہٰذا انتقاماً اس نے اخبار سے اشتہار دیکھ کر لاتعداد محکموں کو درخواستیں داغ دیں۔

کسی ادارے کو مغرور جیسے ہیرے کی شاید قدر معلوم ہو گئی تھی لہٰذا اس کو انٹرویو لیٹر بھجوا دیا۔ مغرور کا خیال تھا کہ انٹرویو لیٹر تو محض رسمی کارروائی ہے ورنہ اس کی اعلیٰ تعلیم کو دیکھتے ہوئے اس کی سلیکشن تو ہو چکی ہوگی۔ ظاہر ہے، مغرور ہی ان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہوگا لہٰذا مغرور بن ٹھن کر اور گردن کو نئے سرے سے "کلف" لگا کر انٹرویو کال لیٹر کو اپائنٹمنٹ لیٹر سمجھتے ہوئے متعلقہ دفتر پہنچا مگر وہاں پہنچ کر اسے "بادشاہی" ڈولتی محسوس ہوئی کیونکہ وہاں ایم اے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جبکہ ایک دو پی ایچ ڈی بھی تھے۔ مغرور کو یونیورسٹی پر غصہ

آنے لگا جس نے ایک دم اتنے سارے لڑکوں کو ڈگریاں دے دیں تھیں بھلا یہ کیا بات ہوئی --- خیر، غصہ ڈرنک (Drink) کرنے کے بعد وہ انٹرویو کے لئے اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔

امیدوار ایک ایک کر کے اندر جاتے اور واپس آتے رہے، فرق صرف یہ تھا کہ اندر جاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں امید کی ٹیوب لائٹیں روشن ہوتیں اور واپسی میں ان کے پورے چہرے پر لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہوتی۔ نجانے اندر کیسے ''واپڈا صفت'' لوگ بیٹھے تھے؟

چپڑاسی نے ایک امیدوار کو اندر بھیج کر سگریٹ نکالی تو مغرور فوراً اٹھا اور لائٹر سے سگریٹ لگانے کے بہانے اسے ایک سرخ نوٹ کی جھلک دکھا کر سرگوشی کی۔

''یار! تم تو محرم راز درون خانہ ہو، اس ظالم انٹرویو میں کامیابی کا کوئی گر تو بتاؤ؟''

''دس نیلے نوٹ اکٹھے کر دیا کوئی سفارش پیدا کرو---'' اس نے جوابی سرگوشی کی۔

''میں کیسے سفارش پیدا کر سکتا ہوں، میری تو ابھی شدی ہی نہیں ہوئی۔''

''ارے بھئی، اسمبلی ہال چلے جاؤ اور کوئی سفارش گود لے لو، وہی سفارشوں کا میٹرنٹی ہوم ہے۔''

''یار! میرٹ بھی تو کوئی چیز ہے؟''

''ہاں، بہت اچھی چیز ہے۔ صاحب ناشتہ اسی سے کرتے ہیں۔''

''کک --- کیا مطلب؟'' اسے اپنے کسی قطعہ جسم کے بال جلنے کی بو آئی۔

''مجھے تم شریف آدمی لگتے ہو --- سنو، جس نوکری کے لئے تم لوگ انٹرویو دینے آئے ہو، اس کے اپائنٹمنٹ لیٹر دس دن پہلے جاری ہو چکے ہیں۔ میری مانو، وقت ضائع نہ کرو۔''

''ہمارے پاس ایک وقت ہی تو ہے ضائع کرنے کو --- خیر، اگر تم درست کہہ رہے ہو تو ہماری درخواستیں کیوں لی گئیں، ہمیں انٹرویو کے لئے کیوں بلایا گیا؟''

''دراصل ہمارے صاحب کو ڈراموں کا بہت شوق ہوتا تھا بچپن میں، اداکار تو نہ بن سکے مگر نوجوانوں کے ساتھ ڈرامے کرتے رہتے ہیں۔''

''مگر اس سے ان کو فائدہ ---؟''

''شاید گھاس ہی کھودتے رہے ہو تم یونیورسٹی میں --- ارے، منوں وزنی تمہاری درخواستوں کی ردی اور پھر درخواست کے ساتھ پوسٹل آرڈر، کیسی خوبصورت اوپر کی آمدنی ہے۔ سال میں دو ایسے ''ڈرامے'' ہوتے رہیں تو ہمارا گزارہ تنخواہ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔''

''نہیں، یہ سب ڈس انفاریشن ہے ---'' مغرور چلایا۔ ''تم دراصل مجھے گر نہیں بتانا چاہتے --- بہر حال، مجھے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔''

چپڑاسی نے مغرور کی عقل ماتمی صف بچھانے کا ارادہ کیا مگر اسی وقت صاحب نے بیل بجا دیا اور اس نے مغرور کو اندر جانے کا اشارہ کیا کہ اب اسی کی باری تھی۔

مغرور نے کپڑے پھر درست کئے اور ''باوقار'' انداز میں ''سربلند'' کئے ہوئے اندرونی دفتر کی طرف بڑھا۔ دروازے کی اونچائی صاحب نے بونے قد کے حساب سے رکھی تھی چنانچہ اندر داخل ہونے کی کوشش میں مغرور کو ستاروں کا رمبا سمبا، ٹوسٹ، راک اینڈ رول وغیرہ دیکھنا پڑا۔ سر سہلاتے ہوئے اس نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ سربلند رکھنے کی صورت میں وہ صرف بغیر سر کے ہی اندر داخل ہو سکتا ہے لہٰذا مجبور اس نے کچھ ''عاجزی'' اختیار کی اور اندر داخل ہوا اندر بچھے قالین کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اس کی سرخی دراصل ناکام امیدواروں کے ارمانوں کے خون کی مرہون منت ہے۔

''آؤ، بیٹھو---'' ایک آواز گونجی۔

اس نے سر اٹھایا تو اسے سامنے کرسیوں پر تین خوفناک بلائیں نظر آئیں جس کے پنجے اور منہ خون آلود تھے۔ مغرور نے خوف سے لرزتے ہوئے سر جھٹکا تو ان کی خوفناکی کچھ کم ہوئی اور وہاں اسے تین افراد بیٹھے نظر آئے جو خاصی قابل رشک صحت کے مالک تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی کرسیاں بھی وقفے وقفے سے صدائے احتجاج بلند کر رہی تھیں یا شاید بددعائیں دے رہی تھیں جبکہ تیسرے عینک بردار شخص کی صحت اتنی اچھی تھی کہ اس کے ساتھ مغرور بھی بیٹھ جاتا تو کرسی پر کچھ جگہ بچ رہتی۔ وہ شاید ماہر نفسیات تھا۔ مغرور آگے بڑھ کر کرسی پر قابض ہو گیا۔

''مغرور فخری صاحب! آپ کو غرور کس بات پر ہے؟'' مسٹر تنکا نے اس پر حملہ کیا۔

''اجی، اس بات پر کہ مجھے آپ سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔'' مغرور نے جل کر کہا۔

''آپ نوکری کیوں کرنا چاہتے ہیں؟'' اس بار ایک موٹے نے پوچھا۔

میری درخواست کے پیراگراف نمبر تین میں اس کی تفصیل موجود ہے --- خلاصہ جس کا یہ ہے کہ میں اپنی صلاحیتوں سے ملک و قوم کی

خدمت کرنا چاہتا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔"
"بہت خوب ---تو کہیں بغیر تنخواہ کے کام کیوں نہیں کرتے، زیادہ ثواب ملے گا؟" ماہر نفسیات نے پھر شرانگیزی کی۔
"---اور ابا جو ورثے میں اپنی لمبی چوڑی اولاد میرے لئے چھوڑ گئے ہیں، اس کو آپ پالیں گے؟" مغرور نے پھنکارتے ہوئے کہا۔
"آپ کی سہولت کے لئے حکومت نے یتیم خانے کافی تعداد میں کھول رکھے ہیں، آپ چاہیں تو خود بھی وہاں پل سکتے ہیں۔" مسٹر تنکا راہ راست پر آنے پر آمادہ نہ تھا۔
"آپ کی "صحت" سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بھی وہیں پلے تھے۔" مغرور بولا۔
"آپ یہ بتایئے کہ اگر کوئی کام کرانے کے لئے آپ کو رشوت پیش کی جائے تو کیا کریں گے؟" موٹے نے پوچھا۔
"لے کر جیب میں ڈال لوں گا۔" مغرور نے اطمینان سے کہا۔
"اپنے افسر کو حصہ نہیں دو گے؟" موٹے نے حسرت سے کہا۔
"محنت جب ہماری ہوگی تو اسے کس بات کا حصہ دیں؟"
"اگر کوئی بہت بڑی سفارش آجائے تو کام کر دیں گے؟"
"ہاں، مقررہ ریٹ میں سے پچاس فیصد رعایت کر دوں گا۔"
"ایماندار کولیگ کے ساتھ آپ رویہ کیسا رکھیں گے؟"
"میں تو اسے منہ بھی نہیں لگاؤں گا اور کوئی کیس بنوا کر اس سے دفتر پاک کرنے کی کوشش کروں گا۔ بھلا ایماندار کولیگ کیساتھ گزارہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مغرور اپنے زعم میں ہر جواب چالاکی سے دے رہا تھا۔
"اچھا، سروس کا کوئی تجربہ---؟"
"جی ہاں، پڑھائی کے دوران ایک بار رزلٹ کی "درست لسٹیں" بنانے پر ہم نے اپنے آفس کے کلرکوں کو بے دخل کر دیا تھا اور چار دن تک ہم کئی لڑکے ترمیم شدہ لسٹیں تیار کرتے رہے کہ سارا کام میری نگرانی اور راہنمائی میں ہوا۔"
مغرور نے مزید اکڑنے کی کوشش کی۔ موٹے نے پہلے دوسرے موٹے کی طرف اور پھر مسٹر تنکا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مسٹر تنکا اشارہ پاتے ہی پھر آن ہو گئے۔
"مسٹر مغرور! آپ کے خیالات وعزائم سے آپ کی ساری نفسیات انڈر ویئر اتار کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ جس کے مطابق اس سیٹ کے لئے جتنی رعونت کی ضرورت ہے، آپ میں اس کی مقدار دس گنا زیادہ ہے۔ چالاکی کی مقدار پانچ گنا، موقع پرستی اور جعل سازی کی مقدار بیس گنا زائد ہے۔ آپ کو نوکری دینے کی صورت میں باقی سارے دفتر بشمول افسران بالا کے پیٹ پر لات پڑنے کا خدشہ ہے سو اکثریت کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ شکل آؤٹ کریں اور اگلے امیدوار کو ہمیں محفوظ کرنے کا موقع دیں۔"
مغرور نے ایک قہر آلود نظر جس میں تابکاری شعاعوں کا تناسب ساٹھ فیصد تھا، ان تینوں پر ڈالی اور کسی چھوڑ کر واپسی کے لئے مڑا۔ اس وقت اسے اپنے آباؤ اجداد پر غصہ آرہا تھا جنہوں نے انگریزوں کی مدد نہ کی تھی ورنہ آج وہ خود نوکریاں بانٹ رہا ہوتا۔
"اور ہاں---" ابھی مغرور دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ مسٹر تنکا نے ارشاد کیا۔ "اخبار بھی پڑھتے رہا کریں تاکہ آپ کو علم ہو جائے کہ جس ڈگری پر آپ مغرور ہیں، وہ آپ کو چپراسی کی پوسٹ بھی نہیں دلا سکتی۔"
مغرور باآسانی اس وقت تین سو دو کا ارتکاب کر جاتا، اگر اس کے

چوکے

سرکاری حج

واہ! "سرکاری حج" کا کیا کہنا
وفد میں آئیں "اُن" کی سسٹر بھی
یہ تماشا بھی ہم نے دیکھ لیا
ساتھ ملا تھے اور مسٹر بھی

گالیاں

آئے تھے ایسے لوگ بھی حج کرنے' اے ظریف
کرتے تھے وہ کمائی بجا کر جو تالیاں
عادت جو پڑ گئی ہے تو اِس کا ہے کیا علاج
دورانِ حج بھی دیتے تھے وہ خوب گالیاں

اِک ٹکٹ دو مزے

بھائی "حاجی" تھے لائے سونا خوب
اصل مقصد تو کچھ کمانا تھا
اِک ٹکٹ میں ملے مزے دوُ دو
حج تو بس اُن کا اِک بہانا تھا

پروفیسر محمد ظریف خان
5-A/19 کارنش کمفرٹس' گلستان جوہر' بلاک نمبر 13 کراچی
ہاتف: 0321-2125603

پاس کوئی چھوٹا موٹا پستول ہوتا--- بہر حال، اس نے نظروں میں تابکاری کا تناسب سو فیصد بڑھا کر انہیں جلا کر راکھ کرنے کی کوشش کی مگر ماہر نفسیات کے سر پر موجود چند بالوں میں سے ایک بھی بال تک بیکا نہ ہوا بلکہ وہ پوری طاقت سے مسکراتا بھی رہا۔

چبھتے ہوئے چوکے

پری

بیٹا بیاہ لایا تھا انگلینڈ کی پری
دل سے تو وہ پتی کی ، نہ ہندوستاں کی تھی
لے کر طلاق انڈیا سے لندن چلی گئی
''آخر وہیں پہنچ گئی ، مٹی جہاں کی تھی''

آرام

ڈوبا ہوا ہے کوئی جوئے میں ، شراب میں
کوئی پھنسا ہوا ہے حساب و کتاب میں
شوہر پریشاں بیوی سے ، مالک سے ہے غلام
''آرام سے ہے کون ، جہانِ خراب میں''

آہ وزاریاں

دیورانی اور جٹھانی نے ، اک دوجے سے کہا
اس سے تو لاکھ اچھا تھا جب تھیں کنواریاں
شوہر ستائے مجھ کو ، تجھ کو ستائے ساس
''آ عندلیب! مل کے کریں آہ و زاریاں''

دل

جو بھی ہے وہ غلط جگہ پر ہے
منہ سر میں ، تو تلووں میں تل ہے
عقل تو آپ کی ہے گھٹنوں میں
''پاؤں کے نیچے آپ کا دل ہے''

بلبلہ

انتظار ہے بہو کو برسوں سے
فاتحہ اور قرآن خوانی کا
ساس مرتی نہیں ہے ، کہتے ہیں
''آدمی بلبلہ ہے پانی کا''

شبنم کاروار

مغرور نے دروازے سے نکلتے ہوئے ایک بار پھر زخم کی تجدید کرائی اور دفتر سے باہر موجود ٹی سٹال پر اس سے پہلے والے اکثر ناکام امیدوار بھی وہاں چائے اور گپ شپ میں مشغول تھے۔ باہمی تبادلہ خیالات سے اسے معلوم ہوا کہ کسی کو ایمانداری، کسی کو وفاداری، کسی کو سچائی، کسی کو فرض شناسی اور کسی کو باقاعدگی کی زیادہ مقدار پائے جانے کی وجہ سے نااہل قرار دیا گیا تھا۔ مغرور کو چپڑاسی کی بات کچھ کچھ سچ معلوم ہونے لگی۔ بہر حال، ان سب نے ٹی سٹال کو ہائیڈ پارک سمجھ کر ماہر نفسیات کے بارے میں تمام پوشیدہ جذبات کا اظہار با آواز بلند کیا اور پرسکون ہو کر اٹھ گئے۔

آئندہ چند ماہ کے دوران مغرور کی اکثر دفتروں کے چکروں کے دوران جوتے کے تلوں کی طرح رخصت ہوگئی۔ ایک دن ایک محکمے کے ڈائریکٹر کے ساتھ ''ناکام مذاکرات'' کے بعد ایک ریڑھی سے ''لنچ'' کرتے ہوئے مغرور نے ازراہ تفنن ریڑھی کے پروپرائٹر سے پوچھا۔

''ارے بھئی، کتنا کما لیتے ہو تم---؟''

''اللہ کا بڑا کرم ہے جی، پچاس روپے کارپوریشن کو جگا دینے کے بعد ڈیڑھ دو سو روزانہ کی بچت ہو ہی جاتی ہے۔''

مغرور نے حساب لگایا تو اس کی آمدنی گریڈ افسروں کی تنخواہوں سے بغل گیر ہو رہی تھی۔ اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی نوالہ اس کے حلق میں پھنس گیا۔ بہر حال، جیسے تیسے کر کے اس نے کھانا ختم کیا اور باقی سارا دن مختلف اقسام کے پھٹے، کھوکے اور ریڑھی والوں کے انٹرویو لیتے گزرا۔

وہ دن اس کی زندگی کا نہایت اہم دن ثابت ہوا۔ جس نے اس کی زندگی، سوچ، عقل اور حالات کا ہینڈل موڑ کر رکھ دیا۔ پوری رات نہایت غور و فکر کے بعد اس نے اپنے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا اور دوسرے دن معمولی کپڑے پہن کر محلے میں گوشت کے واحد تقسیم کار، قصاب کے پاس پہنچ گیا۔ اتفاق سے کوئی گاہک موجود نہ تھا۔

''ہاں، مغرور میاں! تمہارا کتنا گوشت کاٹوں؟'' جلاد نے ٹوکہ لہراتے ہوئے کہا۔

''چاچا! میرے اوپر تو پہلے ہی گوشت ہڈیوں سے منہ چھپا رہا ہے۔ تم نے کاٹ لیا تو بچے گا کیا؟''

''میرا مطلب ہے، تمہارے لئے کتنا گوشت کاٹوں؟! ایک تو میں تم پڑھے لکھوں سے بہت تنگ ہوں، فوراً بال کی کھال اتارنا شروع کر دیتے ہو۔''

''نہیں، چاچا! آج میں گوشت لینے نہیں بلکہ تمہاری شاگردی

اختیار کرنے آیا ہوں۔''

''کک---کیا کہہ رہے ہو تم؟---ایم اے پاس، میری شاگردی کرو گے؟''

''خدا کے لئے، چاچا! بھول جاؤ کہ میں ایم اے ہوں۔ ان پڑھ سمجھ کر مجھے اپنی فرزندی---سوری، شاگردی میں لے لو۔''

''پر اپنی والدہ سے پوچھ کر آئے ہو کہ نہیں، وہ تو میری کھال کھینچ دیں گی؟''

''ان کی فکر نہ کرو، چاچا! ان کو میں خود سمجھا لوں گا۔ گھر کی ریل گاڑی بھی تو چلانی ہے کہ نہیں؟''

تھوڑی سی بحث کے بعد جلاد نے مغرور کو شاگردی میں لے لیا۔ مغرور سارا دن جلاد کو اسٹ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے طریقہ ہائے واردات کو بھی سٹڈی کرتا رہا۔ شام تک وہ قصائی کی الف ب سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی مزدوری نقد کی بجائے جنس کی صورت میں تھیلے میں رکھ لی تھی۔

اس کے گھر پہنچنے سے قبل اس کے اس انتہائی قدم کی خبر پہنچ چکی تھی جس کے نتیجے میں اس کے گھر پر دور نزدیک کے تمام رشتہ داروں پر مشتمل ایک ہنگامی میٹنگ جاری تھی۔ مغرور کے گھر میں قدم رکھتے ہی پہلے سے منظور شدہ لعنت ملامت کی گئی۔ کئی ایک قراردادیں اس کے منہ پر ماری گئیں۔ خاندان کے ایک بزرگ نے غم و غصے کے عالم میں تحریک استحقاق پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کے یوں قصاب بن جانے سے خاندان بھر کا استحقاق مجروح ہوا ہے اور پوری برادری میں ناک کٹ جانے کی وجہ سے وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس ناک کے جڑنے کی ان کے خیال میں اب ایک ہی صورت تھی کہ مغرور کو گھر سے نکال دیا جاتا---جواب میں مغرور نے تحریک التواء پیش کرتے ہوئے تھیلے کا منہ کھول دیا۔ اس میں سری پائیوں، کلیجی اور گردوں کو جھانکتے دیکھ کر میٹنگ کے شرکاء کا جوش ایک دم ٹھنڈا ہو گیا اور مغرور کے گھر والوں کی ناک پھر سے جڑ گئی۔

آہستہ آہستہ وہ اپنے اس فن میں ماہر ہوتا چلا گیا کہ کہاں سے کسے گوشت کاٹ کر دینا ہے، کیسے باسی گوشت تازہ گوشت میں مکس کرنا ہے کہ کسی گاہک کو پتہ بھی نہ چلے---ایک دن ایک غیر ملکی لڑکی اس کی دوکان پر آئی اور جاتے جاتے اس کا دل بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی۔

جولیا ایک غیر ملکی انجینئر کی لڑکی تھی جو وہاں ایک تعمیراتی پراجیکٹ کے سلسلے میں مقیم تھا۔ اب جولیا کے ساتھ ساتھ اس پراجیکٹ پر کام کرنے والے دوسرے لوگ بھی مستقل جلاد سے گوشت خریدنے لگے۔ مغرور اپنی تعلیم اور Dealing کی بدولت ان میں جنٹلمین بوچر کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اور کاروبار کے ساتھ ساتھ اس کی محبت بھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی---بزنس کی یوں ترقی پر جلاد قصاب بہت خوش تھا۔ ''کام پیارا کہ چام'' کے مصداق اس نے مغرور کو دکان کے سلسلے میں بہت سے صوابدیدی اختیارات بخش دیئے جن کی مدد سے مغرور نے دکان پر مندرجہ ذیل اصلاحات نافذ کیں۔

☆ قصاب کے روایتی لباس دھوتی بنیان کی جگہ سیاہ رنگ کے ٹریک سوٹ کا بطور وردی اجراء جس کی قمیض کے سینے پر چھری ٹوکے کا مونو گرام تھا۔

☆ تمام طبقوں کی شکایات کے ازالے کے لئے گوشت کی تین درجوں

چوکے

گریباں چاک لے کر آ گئے ہیں
وہاں سے خاک لے کر آ گئے ہیں
گئے تھے بخشوانے قرض اپنا
یہ ٹوٹی ناک لے کر آ گئے ہیں

☆

مل ملا کر آؤ اک دھندہ کریں
دوسروں کے کام کو مندا کریں
سب ہی کرتے ہیں تو ہم بھی آج سے
مسجدوں کے نام پر چندہ کریں

☆

اپنے حلقے میں بانٹ کر پیسے
ووٹ دیں جو عوام پیدا کر
عین ممکن، وزیر بن جائے
جی حضوری میں نام پیدا کر

☆

جو بیگمات ستم شوہروں پہ کرتی ہیں
سنا جو حال کسی سے بھی، وہ سنا نہ گیا
میاں بہت سے تو بس چوٹ کھا کے بیٹھ گئے
''بس اک فراز تھا، ظالم سے چپ رہا نہ گیا''

سید فہیم الدین، دوحہ قطر
sfd24@hotmail.com

میں تقسیم۔

☆ ڈبل ریٹ پر ہڈیوں سے پاک سپیشل گوشت کی سہولت۔

☆ باسی گوشت اور ہڈیاں کٹ پرائس پر۔

☆ ایک ایک کلوگرام وزن کی خصوصی پولی تھین کے لفافوں میں پیکنگ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق۔

☆ تھوک کے حساب سے گوشت خریدنے پر مختلف تحائف کا سلسلہ، جیسے کھانا پکانے کی تراکیب کی کتاب وغیرہ۔

☆ آؤٹ ڈور ذبح کی سہولت۔

ان انقلابی اصلاحات نے جلاد قصاب کے کاروبار کو نئی جست دی، جلد ہی اس نے آمدنی کی بدولت قیمے کی مشین اور ڈیپ فریزر بھی خریدلیا۔ جلاد جانتا تھا کہ یہ سب کمال مغرور کا ہے لہٰذا اس نے اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اس کو ''جلاد جونیئر'' کا خطاب دیا اور مغرور کی سفارش پر اس کے کئی تعلیم یافتہ بے روزگار دوستوں کو اپنے حلقہ میں داخل کرلیا---''جلاد جونیئر'' کا خطاب اس بات کی علامت تھا کہ مغرور نے فن قصابی کی تھیوری اور بزنس مینجمنٹ پر مکمل عبور حاصل کرلیا ہے لیکن ''ڈگری یافتہ'' قصاب ہونے یا ذاتی دکان کھولنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی جانور کو دوسرے قصاب کی مدد کے بغیر آپریٹ کرتا۔ چنانچہ اب جلاد نے مغرور کو پریکٹیکل کی ٹریننگ دینا شروع کردی۔ اس نے جانوروں کو ذبح کرنے کے دوران مغرور کو ساتھ رکھا، کبھی جانور کی گردن، کبھی سر اور کبھی دم پکڑائی اور ان کے آپریشن کی تکنیک سکھائی۔

عیدالضحیٰ سے قبل ہی مغرور اس قابل ہوگیا کہ پریکٹیکل دے سکے۔ عیدالضحیٰ کے دن جب اچانک قصابوں کا قحط پڑا تو استاد جلاد نے اپنے سب شاگردوں بشمول مغرور شہر میں نکل جانے کو کہا تاکہ قصابوں کا کچھ قحط دور ہو۔ یوں آمدنی کے ساتھ ساتھ سب شاگردوں کی ٹریننگ بھی مکمل ہوجاتی۔

''آلات قتل'' سے مسلح ہوکر اور وردی بدل کر مغرور نے استاد سے آشیرباد حاصل کی اور پریکٹیکل کے لئے روانہ ہوگیا۔ اس کی وردی اور آلات قتل کو کئی لوگوں نے مشکوک انداز میں گھورا۔ ایک چوک پر پولیس میں نے اسے روک لیا۔

''عید کے دن سرعام دہشت گردی؟---تم ضرور ''ٹوکہ گروپ'' سے تعلق رکھتے ہو، باقی ساتھی کہاں ہیں تمہارے---؟''

''جی، میں تو مسکین سا قصاب ہوں۔ خدمت خلق کے لئے نکلا ہوں۔'' مغرور نے اپنی تنظیم قصاب ایسوسی ایشن کا کارڈ اسے دکھایا۔

''ہوں---تمہیں میرے ساتھ میرے گھر تک چلنا پڑے گا۔''

''جی، م---مگر کیوں---؟'' مغرور گھبرا گیا۔

''اوئے، تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں؟---ایک جانور ذبح کرانا ہے، صبح سے کوئی قصاب ہی نہیں پھنس رہا تھا، اب تک آگئے ہو تو چلو۔''

''پہلا گاہک ہی ''مفت خورا''---جی چاہتا ہے، جانور کی بجائے اسی کو ذبح کردوں۔''

مغرور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا سپاہی کے پیچھے چل دیا جو چوک کو ''لاوارث'' چھوڑ کر جارہا تھا۔

مغرور جب سپاہی کے گھر میں داخل ہوا تو اہل خانہ کے علاوہ چند گھڑیوں کے مہمان ایک ہیوی ویٹ سانڈ نے بھی اسے خاصی مشکوک نظروں سے گھورا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ بھیڑ یا بکری ہوگی---'' مغرور نے مایوی

ٹوٹکے

چکوران چاند کے لئے ٹوٹکے حاضر ہیں۔

☆ بعض حضرات کو سوتے وقت بہت ہی ڈراؤنے خواب نظر آتے ہیں ان حضرات کو چاہئے کہ وہ آنکھیں کھول کر سویا کریں۔

☆ اگر آپ اپنے دوست یا عزیز کا ٹیلی فون نمبر بھول گئے ہیں تو آپ فوراً فون کر کے ان سے معلوم کرسکتے ہیں۔

☆ یہ ٹوٹکہ صرف شادی شدہ حضرات کے لئے ہے خاص طور پر ان شوہروں کے لئے جن کی بیویاں خطرناک حد تک غصیلی ہوتی ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ جب شوہر حضرات دیر سے گھر آتے ہیں تو دروازہ اندر سے بند ہوتا ہے تو بھائی میاؤں اس کا حل یہ ہے کہ جب دروازہ بند پائیں تو دیوار کے ذریعے گھر کے اندر داخل ہوجائیں اور دروازے کی چٹخنی کھول کر واپس دیوار سے باہر آجائیں اور اب آپ آرام سے گھر میں داخل ہوسکتے ہیں۔

☆ ہمارے ہاں چھتریاں زیادہ سے زیادہ اتنی دیر تک چلتی ہے جتنی دیر حکومت یعنی پانچ سال اور اس کے بعد استعمال کے قابل نہیں رہتی لہٰذا اگر چھتری کو بارش اور دھوپ سے بچایا جائے تو چھتری کافی عرصہ تک چل سکتی ہے۔

☆ بعض اوقات ہم جب ماچس استعمال کرتے ہیں تو کچھ تیلیاں جلنے سے انکار کردیتی ہیں کیونکہ ان میں نمی ہوتی ہے یا کوئی اور وجہ ہوتی ہے اور اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ماچس خریدنے کے بعد تمام تیلیاں دکاندار کے سامنے جلا کر اچھی طرح تسلی کرلیں اور پھر استعمال کریں۔

☆ بعض افراد زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنا چاہتے ہیں لیکن ان حضرات کو کوئی بھی مشورہ نہیں دیتا، آیئے ہم آپ کو مشورہ دیتے ہیں۔ اگر آپ خودکشی کرنا چاہتے ہیں تو ریلوے سٹیشن سے کسی بھی گاڑی کا وقت معلوم کریں اور جب گاڑی کے آنے کا وقت ہو تو آپ پٹڑی پر لیٹ جائیں حسب معمول گاڑی لیٹ آئے گی تو آپ خودکشی سے بےزار ہوچکے ہوں گے اور ویسے بھی خودکشی حرام ہے۔ خودکشی سے بہتر ہے کہ انسان اپنے آپ کو گولی مارلے۔

محمد طلحہ۔ مظفر گڑھ

سے سپاہی سے کہا۔

''دراصل چھاپے میں برآمد بھی ہوا تھا---'' سپاہی نے وجہ تسمیہ بیان کی۔

ناچار مغرور نے سانڈ کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے آلات قتل وردی کی اسپیشل جیبوں میں گم کئے اور آنکھوں میں محبت کے دیئے روشن کر کے سانڈ کے پاس جا کر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا تاکہ کچھ دوستانہ فضا پیدا ہو جائے۔ سانڈ آداب سے واقف تھا، اس نے بذریعہ دم محبت کا جواب دینا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں مغرور کے جسم پر خارش ہونے لگی۔ جب ماحول مناسب حد تک سازگار ہو گیا تو مغرور نے اہل خانہ میں سے چار افراد کو مدد کے لئے بلایا۔ ان کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پہلے تو رسے سے سانڈ کی دو اگلی ٹانگیں جکڑیں، پھر اسی رسے کے باقی حصے سے پچھلی ٹانگیں جکڑ کر رسہ دو ساتھیوں کو قابو کرنے کے لئے دیا۔ پھر دم کو پچھلی ٹانگوں میں سے بل دے کر گزارنے کے بعد تیسرے صاحب کے حوالے کر دی۔

''دیکھیں، چاہے دم اکھڑ جائے، آپ اس کو ہرگز نہ چھوڑیں کیونکہ اگر آپ نے ایسا کیا تو سبھی کے پائے ثبات میں لغزش آجائے گی---'' مغرور نے دم ہولڈر کو الرٹ کرتے ہوئے تنبیہ کی۔

''---اور آپ، جناب! سانڈ کے گرنے کے بعد اس کے گلے کو درست لائن اور لینتھ (Line & Lenght) میں رکھیں گے تاکہ مجھے چھری پھیرنے میں آسانی ہو۔'' مغرور نے چوتھے ساتھی کو اس کو ڈیوٹی سمجھائی۔

مغرور نے ایک بار پھر سب پوزیشنوں کا جائزہ لیا اور ایک جھٹکے سے سانڈ کو ''فائنل پنچ'' دے کر گرایا اور فاتحانہ انداز میں چھری نکال کر اس کے گلے کی طرف بڑھائی جسے چوتھا ساتھی ذبح کی پوزیشن میں کئے ہوئے تھا۔ تکبیر پڑھتے ہوئے چھری پھیرنے ہی والا تھا کہ وہ کچھ ہوا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ سانڈ نے ایک دم خطرہ بھانپتے ہوئے پچاس ہارس پاور کا جھٹکا مارا۔ دم ہولڈر دس فٹ دور جا گرا، رسیوں والے صاحب اوندھے ہو گئے، گردن کی ڈیوٹی والے صاحب سانڈ کے نیچے جا گرے اور مغرور کو جو اس نے کمر کے نیچے لت جمائی ہے تو وہ چھری سمیت فضا میں پرواز کر گیا۔ گرتے ہوئے ہاتھ لہراتے ہوئے وہ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نادیدہ شیطان کو قتل کر رہا ہو۔

جب مغرور کو ہوش آیا تو سانڈ صحن کی بجائے چھت پر موجود تھا اور زور زور سے ''ہاں ہاں'' کرتے ہوئے شاید اپنی مادری و فادری زبان میں انسانوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ مغرور کی بے ہوشی کے دوران سانڈ کو چھت سے اتارنے کی کوشش میں دو آدمی سانڈ کی اشتعال انگیزی کا شکار ہو کر چھت سے گر کر ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ جب مغرور کو اس کا علم ہوا تو اس کی ٹانگیں راک اینڈ رول کرنے لگیں۔

''گھاس لاؤ---''

اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا تو سپاہی کے اہل خانہ رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انگلی کو سر کے گرد چکر دینے لگے۔

''بیوقوفو! مجھے کوئی دماغی چوٹ نہیں آئی، گھاس سانڈ کے لئے منگوائی ہے۔'' مغرور غصے سے دھاڑا۔

مغرور نے رسیوں کے پھندے دو آدمیوں کو دے کر سیڑھیوں کے دونوں طرف متعین کر دیا اور خود اوپر چڑھتے ہوئے تھوڑی تھوڑی گھاس سیڑھیوں پر رکھنا شروع کر دی۔ اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر زور بازو کی مدد سے تین پونڈ گھاس اس نے اپنے اور سانڈ کے درمیان حائل فاصلے میں پھینکی اور مزید آگے جائے بغیر نیچے اتر آیا---توقع کے مطابق جلد ہی سانڈ کا دل للچایا اور اس نے گھاس کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ جب وہ اوپر والی سیڑھی پر پہنچا تو مغرور کا دل بکریوں

چیچ رے دار غزل

مرے یار! تیرا بڑا کرّو فر ہے
قبا تیری رنگیں ہے، پتلی کمر ہے
ہے اُلٹے توے جیسا معشوق اُن کا
مگر اُن کی نظروں میں رشکِ قمر ہے
سمجھتا ہوں کوزِ شتر اُس کو یارو!
رقیبوں کے لب پر نئی اِک خبر ہے
یہ ہے مرچ کالی یا تخم پپیتہ
ملاوٹ کا اَب کاروبار اَوج پر ہے
شکم سیٹھ جی کا ہے تربوز دیکھو
اُگا نفع خوری سے ہی یہ ثمر ہے
جو تو کہہ رہا ہے، وہ کرتا نہیں تو
تری بات واعظ! بڑی بے اثر ہے
سخن پھول کا نرم پتی ہے، لیکن
کٹا اِس سے ہیرے کا اکثر جگر ہے

تنویر پھول، نیویارک
tanwirphool@gmail.com

اچھلنے کا لگا لیکن اس کے ارمانوں پر اس وقت ٹوکہ چل گیا جب سانڈ نے بروقت سازش کا ادراک کرتے ہوئے واپس روانگی اختیار کر لی۔ اس وقت تک اہل خانہ کے علاوہ اہل محلہ بھی اس تماشے میں شریک ہو چکے تھے جو بھانت بھانت کی بولیوں کے ساتھ ساتھ مغرور کی قصابی کے بارے میں بھی ناقابل تحریر ریمارکس پاس کر رہے تھے۔

"آپ سانڈ کو کلوروفارم کیوں نہیں سونگھاتے---" ایک بزرگ نے گویا سارے مسئلے کا حل پیش کر دیا۔

"محترم! بلی کے گلے میں یہ گھنٹی آپ باندھیں گے؟--- سچ، میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔"

مغرور نے جل کر کہا، بزرگ جھینپنے لگے۔

"یار! سانڈ کے پیروں میں آتش بازی چھوڑو، ڈر کر نیچے اتر آئے گا۔" ایک اور صاحب نے نادر نسخہ تجویز کیا۔

"تاکہ سانڈ پاگل ہاتھی کا رول ادا کرتے ہوئے چھت بھی گرادے اور زخمی ہو کر قربانی کے قابل بھی نہ رہے--- ویسے آپ کہیں مستری تو نہیں؟ مغرور نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"سنتری بادشاہو! پاس پڑوس سے ذرا دیر کے لئے گائے لے آئیں۔" مغرور نے جانوروں کی نفسیات پر غور کرتے ہوئے سپاہی سے کہا۔

"پر وہ کس لئے---؟"

"تمہارے سانڈ سے اس کا نکاح پڑھواؤں گا---" مغرور جل کر بولا۔ "ارے، سانڈ کا خوف ختم کرنے کے لئے، اپنے ہم جنس کو دیکھ کر شاید اتر آئے۔"

یہ چھوٹی سی بات سپاہی کی کھوپڑی میں خوش قسمتی سے سما گئی اور وہ اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی ایک عدد گائے لے آیا۔ مغرور کی ہدایت پر اسے صحن میں ایسی جگہ باندھ دیا گیا جہاں سے سانڈ اسے ڈائریکٹ فوکس کر سکے۔

گائے کو دیکھتے ہی سانڈ کی آنکھوں میں محبت کے ڈیپ جل اٹھے۔ اس نے گائے کو سگنل دیا، گائے کے سگنل کے بعد سانڈ نے اس پر قطعاً غور نہ کیا کہ لائن کلیئر ہے یا نہیں، وہ سماج کی رکاوٹوں کی پرواہ کئے بغیر خیال یار میں دیوانہ وار اترا اور گائے سے حال احوال دریافت کرنے لگا۔ اسے خبر تک نہ تھی کہ اسے جذباتی طور پر بلیک میل کیا گیا ہے۔

سانڈ کو ایک بار پھر جکڑ لیا گیا۔ اس بار امدادی ارکان کی تعداد دس تھی۔ انہوں نے مغرور کے چھری پھیرنے کے بعد بھی اسے کافی دیر مضبوطی سے جکڑے رکھا کیونکہ ایک صاحب نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ ایک جانور شہ رگ کٹنے کے بعد ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اور بڑی دیر بعد جا کر گرا تھا سو وہ اب کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہ تھے۔ اس کارروائی کے دوران گائے کا طرز عمل انسان کی مونث جیسا ہی تھا، وہ بجائے غمگین ہونے کے خوش تھی شاید اس پر کہ کیسا بیوقوف بنایا۔

سپاہی کے گھر سے مغرور کو حق خدمت تو کیا ملتا، یہی بہت تھا کہ وہ ہاتھ پاؤں ضائع کئے بغیر پریکٹیکل میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شام تک اس نے کئی دنبے بکرے وغیرہ ذبح کئے، یوں اس کا ہاتھ رواں ہونے کے ساتھ ساتھ جیب بھی خاصی گرم ہو گئی اور اس کے لگژری سائز تھیلے میں دل، کلیجی، سری اور پائے بھی قابل ٹیکس تعداد جمع ہو گئے تھے۔

استاد جلاد نے مغرور کو بخوشی فارغ التحصیل قرار دے کر ذاتی قصاب شاپ کھولنے کی اجازت دے دی۔ ایک سال بعد جلاد جونیئر مغرور فخری نے عالیشان گھر بنایا۔ گاڑی خریدی اور باسانی اپنی انگریز محبوبہ جولیا کو بیاہ لایا۔ یوں اس نے ثابت کر دیا کہ محبت حاصل کی جا سکتی ہے، اگر بندہ برسر روزگار ہو۔

آج پلوں کے نیچے سے کافی پانی بہہ چکا ہے۔ جلاد جونیئر مغرور کی ذاتی قصاب مارکیٹ ہے۔ بیسویں گریڈ کے کئی افسر اس کے مقروض ہیں، خود وہ پرسکون ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہے کیونکہ اس کا ایک بیٹا کسٹم، دوسرا پولیس میں اور بیٹی ڈاکٹر ہے۔ یوں اس کی اولاد جدید بنیادوں پر اس کے پیشے کو آگے بڑھانے میں معروف ہے۔

☆☆

بیگم کا بھائی

وہ جو اچانک آتا ہے
دودھ کا سارا مٹکا پی جاتا ہے
پھر خشک دودھ سے
چائے بنانی پڑتی ہے
سوچتا ہوں
کسی دن اُس کو پکڑ کر
مرغا بناؤں
لیکن وہ کمبخت
بیگم کا بھائی بھاگ جاتا ہے!

عادل چودھری، 0332-4776113

ہو کے بدنام

☆ عرفان اللہ قریشی

''بھاء! ایک بات بولوں، برا تو نہیں مانو گے؟'' ایک ہیرونچی دوکان میں آکر بولا۔

''ابے، ہم برا مان جاتے ہیں، دفع ہو یہاں سے ---'' ارشد تپتے ہوئے بولا۔'' کمایا ہے نہیں ان کو دو--- ابے، اٹھ جا نیستی---!'' اس نے میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''دھندا وغیرہ کر لے۔''

''گاہک آئیں گے تو دھندا بھی کریں گے--- خوامخواہ جگا دیا، سارے حسین خواب چکنا چور کر دیئے۔''

''ابے، غریبوں کے خواب تو ہوتے ہی چکنا چور ہونے کے لئے ہیں اور یہ ''سارے خواب'' سے تیرا کیا مقصد ہے، تو ایک وقت میں کتنے خواب دیکھتا ہے؟'' ارشد بولا۔

''ایسے ہی--- اگر میں فالتو ہوتا ہوں تو یکے بعد دیگرے مختلف خواب دیکھتا ہی رہتا ہوں۔ اب خوابوں پر کوئی ٹیکس وغیرہ تو ہے نہیں۔'' میں جمائی لیتا ہوا بولا۔

''ویسے مجھے لگتا ہے، یار! لوگوں کی نوادرات سے دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ پتہ نہیں کس باؤلے نے آئیڈیا دیا تھا۔'' ارشد بولا۔

''تو نے---'' میں ایک اور جمائی لیتا ہوا بولا۔

''تو کیا میں باؤلا ہوں؟'' ارشد چیخا۔

''ابھی آپ نے خود اقرار کیا ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں بولا۔

''ہم یہ دھندا کر کے اپنا کوئی نقصان نہیں کر رہے۔ ہم نے کونسا اس کام میں ہزاروں کا سرمایہ پھنسایا ہوا ہے، صرف یہ دوکان تو کرائے پر لی ہے اور یہ قیمتی نوادرات کی حقیقت تو مجھے پتہ ہی ہے۔ پرانا کاٹھ کباڑ ہے اور ویسے بھی یہ اپنا پارٹ ٹائم بزنس ہے، شروع شروع میں کم از کم اس جگہ کا کرایہ تو نکل ہی جایا کرے گا۔'' میں بولا۔

''اس کے علاوہ تاریخ سے واقفیت بھی لازمی ہے۔'' ارشد بولا۔

''---اور تاریخ کے بارے میں اپنی نالج صفر ہے اس لئے گاہک تو تو ہی ڈیل کرے گا۔''

''مجھے کونسا تاریخ سے خاص واقفیت ہے، میں بھی تمہاری طرح ہوں۔'' ارشد بولا۔

''تو پھر گاہکوں کو ڈیل کون کرے گا اور نمبر دو، اگر تمہیں تاریخ سے اتنی واقفیت نہیں تھی تو پھر تم نے اس قسم کا کاروبار کرنے کی کیوں سوچی؟'' میں غصے میں بولا۔

''ویسے آج کل میں تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کر تو رہا ہوں۔'' ارشد مرے سے انداز میں بولا۔

''شاباش آپ کی ذہانت کو---'' میں طنزیہ لہجے میں بولا۔

اتنے میں ایک فیشن ایبل قسم کی خاتون دوکان میں داخل ہوئی، ہم ایک دم اٹینشن ہو گئے۔ وہ خاتون کاٹھ کباڑ پر نظر ڈالتی ہوئی ایک مٹی کے پیالے پر آکر رک گئی جو ہمارے پڑوسی کا تھا جس میں وہ اپنے پالتو کتے کو دودھ پلاتا تھا اور جسے ارشد چرا کر ادھر لے آیا تھا۔

''یہ پیالہ کیسا ہے؟'' وہ اسے ہاتھ میں اٹھا کر ہمیں دکھاتی ہوئی بولی۔

''اس پیالے کی مت پوچھیں تو اچھا ہے--- بڑا قاتل پیالہ ہے یہ تو۔'' میں بولا۔

''اس پیالے کو دیکھتے ہی ایک کرب ناک منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔'' ارشد بولا۔

''پھر بھی آخر اس پیالے کی کچھ تاریخ تو پتہ چلے؟'' وہ خاتون بولیں۔

''اس پیالے کی تاریخ ویسے تو بڑی خطرناک ہے---'' میں ارشد کی طرف منہ کر کے طنزیہ لہجے میں بولا اور ارشد نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''لیکن آپ پوچھ رہی ہیں تو بتانا ہی پڑے گی۔ یہ وہ تاریخی پیالہ ہے جس میں چنگیز خان لوگوں کا خون پیا کرتا تھا اور دو تین پیالے غٹا غٹ پینے کے بعد جشن منانے کا حکم دیا کرتا تھا۔''

''بڑی لمبی چھوڑی ہے، بھئی---!'' ارشد آہستہ سے بولا۔

''لیکن اس میں تو دودھ کی بو آرہی ہے؟'' وہ پیالہ سونگھتی ہوئی بولی۔

''وہ در--- دراصل---'' میں گڑبڑا گیا۔

''ہوسکتا ہے، چنگیز خان خون پینے کے بعد منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے دودھ کا استعمال کرتا ہو۔'' ارشد بات سنبھالتا ہوا بولا۔

''کتنے کا ہے یہ---؟'' وہ پیالے کو غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''فری کا---'' میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔

''کیا مطلب---؟''

وہ حیران ہوکر بولی میں ایکبار پھر گڑبڑا گیا۔

''م--- مطلب یہ کہ آپ جیسے قدر دانوں کے لئے تو یہ تقریباً فری کا ہے، یعنی مبلغ پانچ سو روپے سکہ رائج الوقت---!'' ارشد بات سنبھالتے ہوئے بولا۔

''اتنا مہنگا---؟'' وہ خاتون بولیں۔

''خاتون! آپ اس کی تاریخ ملاحظہ فرمائیں''

''---اور یہ انگیٹھی کیسی ہے---؟'' خاتون بولیں۔

''یہ وہ قیمتی انگیٹھی ہے---''

''جو پڑوس سے چرائی گئی ہے۔'' میں نے دل میں کہا۔

''جس پر سوہنی مہینوال کے لئے چائے بنایا کرتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ اس کی قیمت صرف اور صرف پانچ ہزار روپے ہے۔'' ارشد لمبی چھوڑتا ہوا بولا۔

''---اور یہ پھونکنی جو اس کے برابر میں رکھی ہوئی ہے؟'' خاتون تجسس سے بولیں۔

''یہ وہ نایاب پھونکنی ہے۔ جس سے سوہنی کی ماں اس کے باپ کو پیٹا کرتی تھی۔'' وہ بولا۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا---؟'' وہ خاتون بولیں۔

''مجھے طارق سے پتہ چلا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ اپنی اردو ٹھیک کرلیں۔ یہ لفظ تاریخ ہے، طارق نہیں ہے۔'' وہ بولیں۔

''میری اردو بالکل صحیح ہے، مجھے واقعی طارق سے پتہ چلا ہے۔''

''یہ طارق کون ہے؟''

ارشد اور خاتون کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''یہ اپنا طارق نہیں ہے جو نکڑ پر پکوڑے بیچتا ہے، وہ اپنے پکوڑوں کے لئے ردی لایا تھا۔ اس میں سے تاریخ کی ایک کتاب نکلی تھی، اس نے یہ بات پڑھی جس کے نتیجے میں یہ پھونکنی وجود میں آئی۔'' میں ایک سانس میں بولا۔

''وجود میں آئی سے'' کیا مقصد---؟'' وہ حیرت سے بولیں۔

''وجود میں آنے سے مطلب یہ کہ پھر اس کی تلاش شروع ہوئی۔'' ارشد بولا۔

''اور پھر یہ آپ کو مل گئی--- بائی دا وے، یہ چیزیں آپ کو ملتی کہاں سے ہیں؟'' خاتون ہمیں گھورتی ہوئی بولیں۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بھی، آج کل دور بڑا ترقی یافتہ دور ہے۔ یورپ والے چاند تک پہنچ رہے ہیں، ہم کیا پھونکنی تک بھی نہیں پہنچ سکتے؟'' ارشد بولا۔

''مجھے تو یہ سب کچھ فراڈ لگ رہا ہے۔ مجھے آپ کی کسی بات پر اعتبار نہیں آرہا۔''

وہ خاتون بے دلی سے بولیں اور بقایا چیزوں پر اچٹتی سی نظر ڈالتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

تھوڑی دیر بعد ایک لمبا تڑنگا انگریز دوکان میں داخل ہوا اور ہم دونوں کو ایسا لگا کہ ایک تگڑا مرغا ہمارے جال میں پھنسنے ہی والا ہو۔

''میں ہم نے سنا ہے تم لوگ نوادرات وغیرہ بیچتا ہے؟'' وہ انگریز اپنے مخصوص اسٹائل میں بولا۔

''جی ہاں، آپ کو شک ہے کیا---؟'' ارشد کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔

''کیا بولا---؟'' انگریز بولا۔

''یہ آپ اپنا ہیٹ کانوں سے اوپر کریں گے تو آپ کو کچھ سنائی دے گا۔'' میں اس کے ہیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہ، یس یس---'' اس نے اپنا ہیٹ سر سے اتار کر گلے میں لٹکایا۔

''وٹ از یور نیم؟'' ارشد بولا۔

''مائی نیم از ڈگلس رابرٹ---!'' وہ بولا۔

''تو، ڈگلس بھائی! آپ صحیح جگہ پہنچ چکے ہیں۔'' میں بولا۔

''تو ہمیں اولڈ چیزیں دکھاؤ۔''

''آپ خود دیکھیں اور چوائس کریں اور جس چیز کے بارے میں بھی آپ کو انفارمیشن چاہئے، آپ ہم سے معلوم کریں۔

''او، مین! یہ چشمہ کیسا ہے؟'' ڈگلس ایک ٹوٹا ہوا چشمہ اٹھاتے ہوئے بولا۔

''واہ واہ، سبحان اللہ! کیا چوائس ہے آپ کی، جواب نہیں۔'' ارشد

مسکہ لگاتے ہوئے بولا۔

''واہ کیا تاریخی چشمہ ہے--- کہاں سے مارا؟'' میں ارشد کے کان میں بولا۔

''چپ کر، یار! دھندا کرنے دے---'' ارشد تپ کر بولا۔ ''تو، ڈگلس بھائی! یہ چشمہ تاریخ کے مشہور سائنس دان نیوٹن کا ہے اور بہت قیمتی چشمہ ہے۔''

''او، کیا واقعی یہ چشمہ نیوٹن کا ہے؟'' ڈگلس حیران ہو کر بولا۔

''یس یس---'' ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔

''مگر یہ ٹوٹا ہوا کیوں ہے؟'' ڈگلس بولا۔

''یار، ڈگلس بھائی! کیسی باتیں کرتے ہو آپ بھی--- ٹوٹے گا کیسے نہیں، اتنی اوپر سے اس پر سیب گرا تھا---'' میں لمبی چھوڑتا ہوا بولا۔

''او، نو---'' ڈگلس حیران ہو کر بولا۔

''او، یس---'' ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔

''نیوٹن کی غربت کا تو آپ کو پتہ ہی ہے، بڑی مشکلوں سے اس نے بھیک مانگ مانگ کے---''

''یہ کیا بکواس ہے---'' میں ارشد پر چیخا۔ ''اسے بھیک مانگنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ روزانہ اپنے باپ کی جیب سے سوڈالر چراتا تھا؟''

''ہم کو اتنا ہسٹری معلوم نہیں ہے مگر ہم نے سنا ہے کہ اس کا فادر نہیں تھا؟'' ڈگلس بولا۔

''یعنی کہ اس کا باپ نہیں تھا۔'' میں چیخا۔

''یہ تو طے ہے کہ سب کا ایک باپ ہوتا ہے، یقیناً آپ کا بھی ہو گا'' ارشد بولا۔

''یس یس---'' وہ گھبراتے ہوئے بولا۔

''اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، یہ تو سبھی کا ہوتا ہے۔''

''مین! ہسٹری کو چھوڑیں، کوئی دوسری بات کریں۔'' ڈگلس چڑتا ہوا بولا۔

''انتہائی بے وقوف ہو تم---'' میں ارشد پر چیخا۔ ''اگر ایک آدمی باپ کے ذکر پر شرمندہ ہو جاتا ہے تو کیا ضرورت ہے اس قصے کو چھیڑنے کی--- ٹھیک ہے، کچھ لوگوں کے ساتھ ٹریجڈی ہو جاتی ہے (یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا منہ ڈگلس کی طرف کر لیا) لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا مذاق اڑائے--- کیوں، ڈگلس بھائی---!'' میں بولا۔

''یس یس---''

اس کی ''یس یس'' پر مجھے ہنسی کا اتنا شدید دورہ پڑنے لگا کہ جس کی کوئی انتہا نہیں مگر میں نے بڑی مشکلوں سے قابو پایا لیکن ارشد دوسری طرف منہ کر کے ہنسنے لگا۔

''اب، ڈگلس بھائی! میں آپ کو نیوٹن کے حوالے سے ایک ایسی چیز دکھاؤں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔'' میں بولا۔

''وہ کیا---؟'' ڈگلس حیران ہو کر بولا۔

''وہ سیب جو نیوٹن کے چشمہ پر آ کر گرا تھا---''

میں نے دراز سے سیب باہر نکالتے ہوئے کہا، یہ سیب میں نے راہ چلتے ہوئے ایک ٹھیلے سے چرایا تھا۔

''اوہ نو، یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ سیب ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔

''آج کے دور میں سب کچھ ممکن ہے۔'' ارشد بولا۔

''اس لئے کہ اس نے یہ تاریخی سیب اہرام مصر میں رکھوا دیا تھا۔'' ارشد بولا۔

''وہ کیسے---؟'' ڈگلس مزید حیران ہو کر بولا۔

''اس میں حیران ہونے کی کونسی بات ہے؟ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اہرام مصر میں کوئی چیز نہ تو سڑتی ہے اور نہ ہی خراب ہوتی ہے اور نیوٹن کی ذہانت سے تو آپ انکار کر ہی نہیں سکتے اس لئے اس نے اپنی ذہانت سے سیب محفوظ کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اسے اہرام مصر میں رکھوا دیا--- واقعی نیوٹن ایک عظیم سائنس دان تھا۔'' میں بولا۔

ڈگلس بے یقینی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

''اچھا، اب تم لوگ مجھے کوئی ہارر چیز دکھاؤ جس کی ہسٹری خوفناک ہو، تھرل اور ہارر سے بھرپور--- سمجھ گئے؟''

جوتا

بش پہ بغداد میں پڑا جوتا — اُس کے منہ سے بھی تھا بڑا جوتا
منتظر، منتظر تھا مدت سے — اُس کے ہاتھوں میں تھا کڑا جوتا
مارنا چاہتا تھا غاصب کو — لے کے ہاتھوں میں تھا کھڑا جوتا
جس جگہ فیل ہو گئے میزائل — اِس جگہ پر بھی ہے لڑا جوتا
اَرضِ مسلم سے نکلے غاصب اَب — اِس موقف پہ ہے اَڑا جوتا
بش ہے ہر اک جگہ پہ خائف اَب — اُس کے چہرے پہ ہے گڑا جوتا
بش پہ راضی ہے کافروں کا دھڑا — اپنا ہے دوستو دھڑا جوتا
منتظر بن گیا ہے ہیرو ریاض — اُس نے جب بش پہ ہے جڑا جوتا

ریاض احمد قادری، فیصل آباد

''یہ تھرل ہارر تو انگریزی فلموں میں ہوتا ہے۔'' ارشد بولا۔

''چلو ایسا کرتے ہیں کہ آپ کو چنگیز خان کی دونوں کھوپڑیاں دکھا دیتے ہیں۔'' میں بولا۔

''دونوں کھوپڑیاں---'' وہ حیران ہو کر بولا۔

''ہاں، دو کھوپڑیاں---ایک بچپن کی، ایک جوانی کی---!''

''او، نو---''

''ابوالہول کی وگ دیکھ لو جو اس نے گنجا ہونے کے بعد لگانا شروع کی تھی۔'' ارشد بولا۔

''سلطان راہی کو دیکھ لو، وہ بھی ہماری فلمی ہارر ہسٹری ہے۔'' میں بولا۔

''او، نو--- کچھ اور---؟'' وہ بیزار ہوتا ہوا بولا۔

''تو پھر ایسا کریں کہ سامنے ایک آئینہ رکھا ہے، اس میں آپ دیکھیں۔ آپ کو ایک ہارر چیز نظر آئے گی۔ اس کو غور سے دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔'' میں بولا۔

وہ سامنے ایک قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس میں غور سے دیکھنے لگا۔

''کچھ نظر آیا---؟'' ارشد ہنستے ہوئے بولا۔

''او، نو---اس میں تو کچھ نہیں ہے۔'' ڈگلس حیران ہو کر بولا۔

''کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہو رہا آئینہ دیکھتے ہوئے؟'' میں بولا۔

''حیرت ہے، ہمیں تو خوف محسوس ہوتا ہے۔'' ارشد بولا۔

''یہ عادی ہو چکا ہے بھئی، اس کو کچھ نہیں ہوگا---ادھر واپس آجائیے پلیز، آئینہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔'' میں بولا۔

''اب آپ بتائیں کہ آپ کو کچھ پسند آیا تاکہ آپ کو اس چیز کی پرائس بتائیں۔'' ارشد بولا۔

''مین! ہم کو صرف نیوٹن کا چشمہ پسند آیا ہے۔'' ڈگلس بولا۔

''واقعی، آپ جیسا قدردان ایسی ہی چیز پسند کر سکتا ہے---اور وہ ہے بھی بہت سستا، یعنی صرف دو سو ڈالر کا---!''

''وہ کتنے کا بھی ہو، ہمیں بہت پسند ہے۔'' ڈگلس بولا۔

''تو پھر اس کو پیک کر دیا جائے؟'' ارشد بولا۔

''او، نو---'' ڈگلس بولا۔

''کیا مطلب---؟'' ارشد حیران ہو کر بولا۔

''مطلب یہ کہ وہ پیک کرائے بغیر ہی اس کو لیجائیں گے۔'' میں بولا۔

''آپ لوگوں کا بہت بہت تھینکس کہ آپ لوگوں نے مجھے اتنی ہسٹری کے متعلق انفارمیشن دی---''

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے، یہ تو ہمارا کام ہے۔'' میں ڈگلس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''دراصل میری فلائٹ دو گھنٹے لیٹ تھی تو میں نے سوچا کہ یہ وقت کہاں گزارا جائے۔ پھر مجھے کسی نے آپ کی شاپ کے متعلق بتایا اور میں یہاں چلا آیا---ویل، بہت اچھا ٹائم گزرا آپ لوگوں کے ساتھ، آپ کا بہت بہت تھینکس---!'' وہ بولا۔

''مطلب یہ کہ تم چشمہ نہیں لے رہے؟'' ارشد تپتے ہوئے بولا۔

''نو مائی ڈیئر---!'' ڈگلس نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی ارشد بھاگتا ہوا اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوا اور بولا۔

''آپ نے ہمارا انتہائی قیمتی وقت ضائع کیا ہے، آپ کو یہ چشمہ خریدنا ہی پڑے گا۔''

''میں ضرور لیتا مگر اس وقت میرے پاس منی نہیں ہے۔'' ڈگلس ڈرتا ہوا بولا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں، بس آپ کو لینا ہی پڑے گا۔'' ارشد انتہائی ذلالت پر اتر آیا تھا۔

''میرے پاس اس وقت صرف پاکستانی دو سو روپے ہیں۔'' ڈگلس پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، دو سو روپے ہی نکالو۔'' ارشد ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہاں، یار! دو سو ہی لے مر، کیا فائدہ گند کرنے کا---'' میں بولا۔

☆☆

فلیٹ میں جیسے ہی داخل ہوئے، شریف سراپا احتجاج بنا ہوا تھا۔

''میرا چشمہ کہاں ہے؟''

''تو وہ چشمہ آپ کا تھا؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''یہ کیا بکواس ہے، عمران---؟'' ارشد دھاڑا۔

''تم کونسے چشمے کی بات کر رہے ہو، عمران---!'' شریف بولا۔

''وہ میں نے صبح ارشد کے کے پاس دیکھا تھا۔'' بالآخر مجھے سچ بولنا پڑا۔

''بات یہ ہے کہ اس چشمہ کا شیشہ مجھ سے ٹوٹ گیا تھا تو وہ میں بنوانے کے لئے ایک عینک ساز کو دے کر آیا ہوں۔'' ارشد مجھے گھورتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے مگر آئندہ میری کسی بھی چیز کو ہاتھ نہ لگانا، سمجھے تم---؟'' ہمارا روم میٹ شریف بولا۔

شریف کے باہر جاتے ہی ارشد مجھ پر گرم ہو گیا۔

''یہ کیا بکواس تھی؟''

''یار! وہ بس اچانک ہی منہ سے نکل گیا۔'' میں بولا۔

''اپنے منہ جیسی غیر معتزز چیز سے بات نکالنے سے پہلے یہ تو سوچ لیتے کہ منافع آدھا تم نے بھی ہضم کیا ہے---'' ارشد دھاڑا۔

''بہر حال، نقصان تو تمہارا ابھی ہوا۔''

''مطلب یہ کہ چشمے کی آدھی ادائیگی میرے شیئر میں سے بھی ہو گی۔'' میں بولا۔

''بالکل/ اس میں کیا شک ہے۔'' ارشد ڈھٹائی سے بولا۔

''ہمیں کیا برا تھا مرنا گر ایک بار ہوتا۔'' میں یہ کہتے ہوئے صوفے پر گر پڑا۔

☆☆

''یار، عمران! آج تو مزہ آ گیا۔'' ارشد کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''یعنی کہ آج آپ بقایا پیسے دوستوں میں اڑا کر آ رہے ہیں؟''

''نہیں تو کیا تیری طرح بچا بچا کر رکھتا---ویسے تو نے پیسوں کا کیا کیا؟''

''میں نے تو پچاس روپے کا انعامی ٹکٹ لے لیا ہے۔ ہو سکتا ہے، پندرہ ہزار کا بمپر پرائز میرا ہی نکل آئے۔'' میں بولا۔

''دل کے بہلانے کو غالب خیال اچھا ہے۔'' ارشد ہنستے ہوئے بولا۔

''یار! اس کا نمبر بڑا لکی ہے۔ یعنی 786786 دو بار مبارک نمبرز کی تکرار---!'' میں بولا۔

''بہر حال، قرعہ اندازی کب ہے؟'' ارشد نے بے دلی سے پوچھا۔

''کل شام ٹی وی پر دکھائی جائے گی اور بذریعہ کمپیوٹر ہو گی۔''

''کل تمہارا نصیب بھی دیکھ لیں گے. خدا نہ کرے کہ کہیں تمہارا نصیب بھی تمہارے منہ---''

میں نے ارشد کو گھورا تو اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

☆☆

''اب آپ تمام ناظرین دل تھام کر بیٹھیں، پندرہ ہزار کے دس انعامات آپ کے منتظر ہیں۔''

کمپیئر نے یہ جملہ کہا تو میں نے واقعی دل کو تھام لیا۔

''یار، ارشد! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' میں بولا۔

''بیٹا! تو ٹی وی دیکھ رہا ہے، آئینہ نہیں اس لئے خاموش رہ۔''

''ناظرین! پہلا پندرہ ہزار کا جو انعام نکلا ہے، اس کا نمبر ہے سات آٹھ چھ سات آٹھ چھ یعنی 786786---!''

''مبارک ہو، عمران---!''

شریف اور ارشد بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے لیکن میرا دل اتنی خوشی برداشت نہ کرنے کی وجہ سے ڈوبا جا رہا تھا۔ میرے منہ سے فقط اتنا ہی نکل سکا۔

''پانی---پانی---!''

''ارشد! جلدی کر پانی لا---''

شریف بولا اور ارشد دوڑ کر پانی لے آیا۔ پانی پینے کے بعد میرے حواس بحال ہوئے اور زندگی یکدم مجھے اپنے حسین چہرے کی طرح حسین نظر آنے لگی۔

''وہ ٹکٹ کہاں رکھا ہے۔'' ارشد بولا۔ ''بس اس کو سنبھال کر

ندائے ہاتف المتحرکتہ

نہ کال آئی، نہ کوئی میسج آیا
مرا موبائل آیا زیرِ سایا
جو گھر کے فون کی بابت بتاؤں
ہر اک ''بل'' پر میں رویا، بلبلایا
نہ آیا اور نہ آ پاؤں گا ''نیٹ'' پر
کہ لائن میں ہمیشہ شور پایا
ہر اک ''مس'' نے مجھے ''مس کال'' ٹھوکی
جواباً میں نے اک ''میسج'' دوڑایا
سمجھ کر ''شی'' جو میں نے ''لوڈ'' بھیجا
وہ ''ہی'' نکلا، مجھے پھر رونا آیا
جسے چھیڑا تھا میں نے لڑکی بن کر
مری آواز سن کر ہڑبڑایا
''انا میکا'' سے عرفی دل لگا جب
لٹا کر ہوش مجھ کو ہوش آیا

سیّد عرفان عرفی
موبائل: 0302-5871746

رکھو۔"

"بس، بس اب زیادہ منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ مجھ سے پرے پرے ہو کر بیٹھو، تمہارے جسموں سے اتنی سڑاند اٹھ رہی ہے کہ توبہ--- پتہ نہیں تم لوگ نہانے سے اتنے الرجک کیوں ہو؟"

میں منہ بناتا ہوا بولا۔ بلاشبہ میں اس وقت اکڑنے اور پھولنے کی پوزیشن میں تھا۔

"کیا کہا، ہم نہانے سے الرجک ہیں؟"

ارشد بے یقینی کی کیفیت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ نہانے سے الرجک وہ نہیں، میں ہوں۔

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی بھرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

شریف نے میری طرف دیکھتے ہوئے شعر پڑھا۔

"اللہ جسے چاہتا ہے، عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے---"

"اب ہم عمران صاحب سے شاندار ٹریٹ لیں گے۔" ارشد بولا۔

"دفع کرو، یار! تو نے وہ ٹکٹ کہاں رکھا ہے، وہ دکھا تو دے؟" شریف بولا۔

"جا، ارشد! اندر کھونٹی میں میری جینز کی پینٹ رکھی ہوئی ہے، اس کی جیب میں ٹکٹ ہے، لے آ۔" میں بولا۔

"کیا کہا---تو نے ٹکٹ جینز کی جیب میں رکھا تھا؟" ارشد دھاڑا۔

"ہاں، تو اس میں چیخنے کی کونسی بات ہے، تمہارے ڈر سے میں نے ایسا کیا۔" میں بولا۔

"اف، میرے خدا---!" ارشد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"ابے، کچھ بتائے گا بھی کیا ہوا؟" میں پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

"وہ پپ--- پینٹ تو میں نے دھوبی کو دھونے کے لئے کل ہی دی ہے۔" ارشد ڈرتے ڈرتے بولا۔

"لعنت تیری شکل پر---" میں دھاڑا۔ "ابے، منحوس! جینز کی پینٹ بھی دھلتی ہیں؟" میں زور سے دھاڑا۔

"کیا---؟" ارشد بولا۔

"تیرا بیڑہ غرق---"

"پھر---" وہ مری سی آواز میں بولا۔

"صبر کر، عمران! اللہ کو یہی منظور تھا۔" شریف بولا۔

"یہ تو کیا جنازے میں آیا ہے؟" میں تپتے ہوئے بولا۔

"نہیں تو---"

"تو پھر یہ موت والی تعزیت کس لئے---؟"

"حوصلہ دینا ہے تو اس طرح دو کہ، عمران! صبر کر، ابھی تیرا دوست زندہ ہے۔ تیرا نقصان ہم پورا کریں گے؟" میں بولا۔

"لیکن، عمران یار! میری بات---"

"نہیں، بھئی! اس بات کا حوصلہ، دلاسہ میں قبول نہیں کروں گا۔" میں بولا۔ "ابے، کیا پاگل ہو گیا ہے؟"

شریف دھاڑا۔ "کم از کم اس دھوبی کے پاس جاؤ، اس سے معلوم کرو۔ کیا پتہ ٹکٹ مل جائے۔"

"ہاں، یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں---" ارشد بولا۔ "چل، عمران! دونوں چلتے ہیں۔"

"میں اس دھوبی کے بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں غصے سے بولا۔

میں اور ارشد جب دھوبی کے گھر کے دروازے کے قریب پہنچے تو ہمارا غصہ دو چند ہو گیا اور ہم دروازہ کھول کر ڈائریکٹ اندر داخل ہو گئے اور یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے کہ وہ میرے لاٹری کے ٹکٹ کو آنکھوں سے لگا رہا تھا اور بار بار چوم رہا تھا۔ ہم جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے، وہ یکدم چونک گیا اور لاٹری کا ٹکٹ فوراً جیب میں ڈال لیا۔

"کیا بات ہے، تم کس بیہودگی سے اندر داخل ہوئے؟" وہ ڈر اور غصے کے ملے جلے لہجے میں بولا۔

"ٹکٹ سیدھی طرح نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دے۔" میں دھاڑا۔

"اگر نہ رکھوں تو---؟" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کیوں، کیا ٹکٹ تمہارے باپ کا ہے؟" ارشد چیخا۔

"نہیں، تو کیا تمہارے باپ کا ہے؟" دھوبی بھی جواباً چیخا۔

"باپ تک نہیں پہنچ ورنہ---" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا، کیا کرلے گا تو---؟" دھوبی پھر چیخا۔

"تیری بیوی کو بیوہ کر دوں گا۔" میں اچانک ہی غصے میں کہہ گیا۔

"کون کرے گا بیوہ---؟"

انتہا سے زیادہ موٹی اس کی دھوبن بیگم کمرے کے دروازے سے بمشکل باہر آتے ہوئے بولی۔ بارہ من کی دھوبن والی مثال اس پر سو فیصد

فٹ بیٹھتی تھی۔ اس کو دیکھ کر میری تو میری ارشد کی بھی ہوا کھسک گئی۔

''یہ---یہ کرے گا تجھے بیوہ---!'' ارشد نے ڈرتے ہوئے جلدی جلدی میری طرف اشارہ کیا۔

''جج---جھوٹ ہے افواہ ہے---میں نے نہیں کہا۔'' میں نے یکدم ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''پھر کیا کہا تھا---؟'' وہ قریب آ کر آستین چڑھاتی ہوئی بولی۔

''میں نے کہا تھا کہ آپ کی بیوی کو بتائیں گے کہ آپ ناجائز ہیں---''

''مجھے تم بتاؤ گے---؟'' وہ میری بات کاٹ کر آنکھیں نکالتی ہوئی بولی۔

''نن---نہیں جی، ہم آپ کو کیا بتائیں گے، بتانے کی پوزیشن میں تو آپ ہیں۔'' میں اس کی جسامت دیکھتے ہوئے بولا۔

''بیگم! ان کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ ڈاکو ہیں، مجھ سے ٹکٹ چھین رہے تھے۔'' دھوبی منمنایا۔

''ان کو تو میں ابھی سیدھا کرتی ہوں---''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سینے پر اس زور سے مارا کہ میں لڑھکتا ہوا دروازے کے قریب دھڑام سے جا کر پڑا۔

''بیوٹی فل شارٹ---فوررنز---''

باہر سے ریڈیو کی کمنٹری کی آواز میرے کان سے ٹکرائی، کمبخت موقع پر بالکل صحیح فٹ ہوئی تھی۔ اتنے میں ارشد تقریباً اڑتا ہوا میرے قریب آ کر گرا۔

''ہائے، بڑا ظالم ہاتھ تھا۔ پورے آٹھ طبق روشن ہو گئے۔'' ارشد کراہتے ہوئے بولا۔

''ابے، صرف آٹھ طبق---؟'' میں حیرت سے بولا۔

''ہاں، یار! باقی چھ زیادہ پاور ملنے کی وجہ سے فیوز ہو گئے۔'' ارشد بولا۔

''ارشد! بھاگ---''

میں یکدم چیخا کیونکہ بارہ من کی دھوبن ہماری طرف ہی بڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے گھر سے باہر نکلے۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے ہم دونوں کی کمروں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی اور سینے کی تکلیف اس کے علاوہ تھی۔ ہم دونوں اپنی کمروں پر ہاتھ رکھے، بڑی تیزی سے چل رہے تھے کہ کمبخت ایک سموسے والا ہماری جان کو اٹکنے لگا۔

''روپے کا ایک باؤ جی، روپے کا ایک---''

سموسوں کا تھال ہمارے ساتھ مسلسل چلنے لگا۔

''ابے، چاہئے سموسہ بھرا ہوا؟'' میں چیخا۔

''باؤ جی! ایک ہی کھا لیں۔'' وہ پھر بولا۔

''ابے، کھا کر تو آئے ہیں---ہائے---'' ارشد چلتے چلتے رک کر بولا۔

''باؤ جی! کھا لیں---'' سموسے والا بولا۔

''نہیں---''

میں چیخا اور ایک ہاتھ گھما کر اسے رسید کیا۔ سموسے والا ٹوکرے سمیت دور جا گرا۔ سموسے والا کب جان چھوڑنے والا تھا، اس نے فوراً چیخنا شروع کر دیا۔

''غریب کو مار دیا---ارے، لوگو! دیکھو، غریب کو مارا۔''

ہم دونوں یکدم گھبرا گئے۔

''کس نے مارا ہے تجھے؟'' جراحی کی دوکان سے ایک پہلوان باہر نکلتے ہوئے بولا۔

''انہوں نے مارا ہے۔'' سموسے والے نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

''فیکا پہلوان! ان کو ایسا سبق سکھاؤ کہ یہ دوبارہ کسی غریب پر ہاتھ نہ اٹھائیں۔''

ایک بوڑھا اپنی بلغم زدہ آواز میں بولا اور فیکا پہلوان ہماری طرف بڑھنے لگا۔

تین تین اقسام

☆ پگڑیاں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک پگڑی اُچھالی جاتی ہے' ایک پگڑی رہن رکھوائی جاتی ہے۔ ایک پگڑی سر پر باندھی جاتی ہے۔

نشے: ایک نشہ سر سے اُتارا جاتا ہے' ایک نشے کی لت لگائی جاتی ہے اور ایک نشہ آنکھوں میں ہوتا ہے۔

تیر: ایک تیر کمان سے چھوٹتا ہے جو واپس نہیں آتا ہے' دوسرا تیر طنز کا ہوتا ہے جو برسایا جاتا ہے' تیسرا تیر نظروں کا ہوتا ہے جو دل کے پار ہو جاتا ہے۔

☆ انسان بھی تین قسموں کے ہوتے ہیں مرد' عورت' ہیجڑے۔

☆ دُنیا کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ہم تیسری دُنیا میں بستے ہیں' پہلی دُنیا سپر پاورز کی ہے اور دوسری دُنیا آئل پاورز کی ہے۔

☆ چاند کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک آسمان کا چاند دوسرا صحافت کا چاند جو ہنساتا ہے' تیسرا حسن کا چاند جو (عشق میں) رُلاتا ہے۔

☆ چکوران چاند بھی تین قسم پر مبنی ہیں ایک لمبی لمبی چھوڑنے والے (طویل ترین تحریروں والے) دوسرے لڑانے والے اور بڑکیں مارنے والے' تیسرے صرف نام چھپوا کر تماشا دیکھنے والے۔

حسین شبیہ غریب آبادی

''پہلوان بھائی! میں نے تو اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔'' میں منمنایا۔

''اوئے، تو پھر کس نے مارا؟'' وہ دھاڑا۔

''اس نے مارا ہے۔''

میں نے ارشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا دھوبن والا بدلہ چکایا۔

''وہ---وہ تو، پہلوان جی! میں نے پیار میں مارا تھا، یہ تو میرے بھائیوں جیسا ہے۔'' ارشد بولا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے، پہلوان جی! اس کا کوئی بھائی بھی سموسے والا اجیسا نہیں ہے۔'' میں بولا۔

تو تو نے اسے پیار میں مارا ہے؟'' پہلوان دھاڑا۔

''جی ہاں، اس میں کیا شک ہے۔'' ارشد بولا۔

''تو ٹھیک ہے، باؤجی! کچھ پیار محبت کا اظہار اپنے درمیان بھی ہو جائے۔''

''جی، جی کیوں نہیں---''

ارشد کپکپاتے ہوئے بولا اور پہلوان جی نے اپنا وزنی ہاتھ اس زور سے مارا کہ ارشد وہیں ڈھیر ہو گیا اور میں پہلوان جی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے گنتی گننے لگا۔

''ایک، دو، تین، چار، پانچ---''

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ہزار تک بھی گنو تو ارشد اب نہیں اٹھے گا مگر مجھے تو پہلوان جی کی چمچہ گیری مطلوب تھی---میں نے پہلوان جی کا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

''واقعی، فیکا پہلوان صاحب! آپ بہت بڑے پہلوان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔'' میں مسکا لگاتے ہوئے بولا۔

''مسکا لگانے سے کام نہیں چلے گا، تم بھی تو اسی کے ساتھ تھے؟'' بلغم زدہ منحوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہاں جی، پہلوان صاحب! یہ بزرگ صحیح کہہ رہے ہیں۔''

سموسے والا اپنی نحوست میں ڈوبی ہوئی آواز میں گویا ہوا اور پہلوان میری طرف بڑھنے لگا۔

''پپ--- پہلوان جی! پہلوان رہیں، چنگیز خان نہ بنیں--- رحم کریں۔ دیکھیں، میں یتیم باپ کی اولاد ہوں، بہت ہی غم زدہ شخص ہوں۔ اب تو محلے والے بھی مجھے ''غم کا آنسو'' کے نام سے پکارتے ہیں۔''

''---اور اب میں تجھے ''عبرت کا آنسو'' بنا کر دم لوں گا۔''

پہلوان نے کہ کہتے ہوئے میری گردن پکڑ کر مجھے مجمع میں اتنا اونچا کر دیا کہ جتنا میں معاشرے میں اونچا ہونا چاہتا تھا اور پھر مجھے پہلوان جی نے وہیں چھوڑ کر اپنا ہاتھ نیچے کر لیا اور میں دھڑام سے سڑک پر گر پڑا۔ پھر کانوں میں وہ ہی بلغم زدہ منحوس آواز آنے لگی۔

''ایک، دو، تین، چار---''

پھر مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو شریف ہم پر جھکا ہوا تھا۔

''ابے، کیا ہوا تھا تمہیں--- یہ پہلوان جی نے تمہارا تھوبڑا کیوں بگاڑا ہے، اس سے کیوں لڑ پڑے تم---؟''

''نہ چھیڑ ملنگاں نوں---'' ارشد کراہتے ہوئے بولا۔

''اس ٹکٹ کا کیا ہوا؟'' شریف بولا۔

''اس ٹکٹ کو کیا ہونا تھا؟ جو کچھ ہوا، ہمیں ہی ہوا ہے۔'' میں بولا۔

''ہڈیاں توڑ دیں ان ظالموں نے، ہائے---'' ارشد چیخا۔

''---اور میرے تو دونوں کندھے اُتر گئے ہیں۔'' میں درد سے چیخا۔

''تو پھر میں کسی پہلوان کا بندوبست کرتا ہوں۔'' شریف بولا۔

''کک---کون سے پہلوان کو لینے جا رہے ہو؟'' میں چیخا۔

''اپنے علاقے میں تو ایک ہی پہلوان ہے۔'' شریف بولا۔

''کون سا---''

میرے اور ارشد کے منہ سے ایک ساتھ یہ جملہ نکلا۔

''فیکا پہلوان اور کون---؟'' شریف اطمینان سے بولا۔

ارشد کا تو نہیں معلوم مگر میں یہ نام سنتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

☆☆

دھماکہ

ایک رات میں اپنے ایک دوست کے گھر گیا۔ وہ اسی دن اپنی بیوی کو اس کے میکے سے لے کر آئے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھے ایک ناول ''بیوی'' دینے کا وعدہ کیا تھا جو انہیں لائبریری سے لانا تھا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔

''سناؤ بھئی! بیوی لے آئے یا نہیں؟''

کہنے لگے۔ ''ہاں لے آیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آج رات کے لئے مجھے دے دو۔''

انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''کرایہ لگے گا۔''

میں نے کہا۔ ''منظور ہے۔''

یہ کہہ کر وہ ناول لانے کے لئے کمرے میں گھسے اور جیسے ہی اندر پہنچے ایک بم سا پھٹا۔ میرے دوست کی بیوی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔

''کیا اسی لئے مجھے بیاہ کر لائے تھے۔''

تنویر اینڈ شبیر دلاوری، جہلم

ہمارے شیخ چلی

☆ سلمہ یاسمین نجمی

اِدھر سولہواں سال لگا' اُدھر پیغامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

نہ لوگوں کو والدین کے گھر میں ہمارا قیام بھلا لگا اور نہ امی جان ہی اس بات کی قائل نظر آتی تھیں کہ لڑکیاں ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھیں۔ انہیں پیغامات میں سے ایک ان حضرت کا بھی تھا جن کو آگے چل کر ہمارے مجازی خدا بننے کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ بات چیت چل رہی تھی بلکہ یوں سمجھئے کہ رینگ رہی تھی۔ ہم ابھی ایف اے میں تھے اور ہمارا ذاتی خیال پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ ''مسز'' کے دُم چھلے سے زیادہ نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ لگانے کی تمنا تھی--- ہم اپنی تمنا کی تکمیل میں محو تھے اور لوگ اپنی ریشہ دوانیوں میں۔ ویسے بھی یہ صاحب سات سمندر پار تشریف رکھتے تھے لہٰذا فوراً آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہماری امی جان نے بن دیکھے تقویٰ اور پرہیز گاری کی بنیاد پر اور لوگوں کی باتوں پر اعتبار کر کے ان کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا اور جواب میں ایک عدد بڑی جناتی قسم کی انگوٹھی عطا ہوئی جس میں ہماری کوئی انگلی سمانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی البتہ اگر ہم اسے زیب گلو کرنے کا قصد کرتے تو وہ دوسری بات تھی۔ ہماری چھوٹی ہمشیرہ نے پوری ایک عدد دھاگے کی نلکی بڑے استقلال اور صبر سے استعمال کی تب کہیں جا کر وہ محترمہ ہماری ایک نحیف انگلی میں چند لمحوں کے لیے ٹک سکیں۔ چونکہ زیور کپڑے سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لہٰذا اس کے عظیم الجثہ ہونے کا افسوس بھی نہ ہوا۔

منگنی کے بعد ہمارے بہن بھائیوں نے بڑی ضد کی کہ یہ کیا ہوا کہ بھائی جان ہم سے ملے' نہ ہم نے انہیں دیکھا' ایک بار پاکستان تشریف لائے بھی تو کانوں کان خبر نہ ہونے دی اور چپکے سے کھسک گئے۔ اب کم از کم تصویر ہی منگوا دیجئے' کچھ آئیڈیا تو ہو کہ حضرت ہیں کس قبیل کے اور آخر ہم انہیں پہچانیں گے کیسے؟

''پہچاننے کی بھی خوب رہی' جب وقت آئے گا تو خود بخود پہچان لو گے۔''

''کیا وہ گلے میں تختی لٹکائے آئیں گے کہ ہم دولہا ہیں۔ ہم ہر ایک سے غلط توقعات باندھتے رہیں اور اس کے گلے کا ہار ہوتے رہیں۔ آخر تصویر منگوانے میں کیا حرج ہے' اب اتنے متقی بھی نہ ہوں گے کہ ہم سے ہی پردہ کرنے بیٹھ جائیں؟'' ہمارے برادر خورد بولے۔

مجبور ہو کر امی جان نے ان کی بہن کو کئی خط لکھے کہ بھئی' تصویر بھیج دو' سب دیکھنے کے شوقین ہیں مگر وہ صاحب بھی بلا کے شرمیلے تھے اور اوپر سے پابند شریعت بھی' ٹس سے مس نہ ہوئے۔ انہیں یاد کرایا گیا کہ پاسپورٹ کے لیے تو ضرور تصویر کھنچوائی ہوگی' وہاں تو پردہ نشینی سے کام نہ چلا ہوگا' وہی بھجوا دیں۔ معلوم ہوا کہ اتنی ہی تصویریں اتروائیں تھیں جن کی ضرورت تھی' اب پاسپورٹ پر سے تو تصویر اتار کر نہیں بھیجی جا سکتی۔

میرے بھائی بہن تو اس پر رضا مند تھے کہ کوئی بچپن کی انگوٹھا چوستی تصویر ہی بھجوا دیں' بنیاد سے عمارت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر لیں گے--- ہماری ہونے والی نند کو کچھ رحم آ گیا۔ انہوں نے اپنے جملہ کاغذات کھنگال ڈالے اور ایک در نایاب ڈھونڈ نکالا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ' جھٹ بھجوا دیا۔ یہ تصویر اس زمانے کی تھی جب لڑکپن جوانی سے ملنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں والدہ کو حج کرانے کی سعادت حاصل کر چکی تھیں لہٰذا سر منڈاتے ہی پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ اپنی من موہنی صورت کی ایک تصویر بطور یادگار کھنچوائی۔ اولے وہاں پڑتے نہیں تھے اس لیے پگڑی ٹوپی کا تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی سر صحرائے عرب کی طرح چٹیل پڑا تھا۔ یقیناً بال تو ضرور رہے ہوں گے مگر تصویر میں ایسے کوئی آثار نہ تھے۔ دھان پان سے پہلے ہی وارد ہوئے تھے' غلطی سے بھی ایک چھٹانک وزن کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ حج کی محنت و صعوبت سے اور یجنل وزن بھی بیس پونڈ کم ہو چکا تھا چنانچہ اچھا بھلا سوٹ جھلنگا لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی سے مانگ کر پہنا ہے' پہنا کیا ہے بانس پر لٹکا دیا ہے--- وزن کی کمی کے باعث لمبی ناک مزید لمبی نظر آ رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں عینک میں کچھ اور اندر دھنس لگ رہی تھیں

آدمی شرع پر چلتا ہوا اور داڑھی نہ رکھے' چنانچہ اس سنت پر بھی عمل کیا گیا تھا۔

امی جان نے تو تصویر دیکھتے ہی فوراً چھپانے میں عافیت سمجھی۔ خواہ مخواہ بچوں کے ہاتھ میں ایسی نیک صورت اور بابرکت تصویر دینے سے بے حرمتی کا شدید خطرہ تھا مگر ادھر بھی سب کو سن گن مل چکی تھی کہ تصویر آگئی ہے۔ چونکہ امی ٹال مٹول کر رہی تھیں لہٰذا بہن بھائیوں نے خود ہی چھاپہ مارنے کا فیصلہ کیا۔

ایک روز جب وہ گھر پر نہیں تھیں' انہوں نے مل کر ان کا سارا بکس کھونڈ ڈالا۔ ہم اپنے کمرے میں کچھ پڑھ رہے تھے' یکلخت ہماری سماعت سے اپنے برادر خورد کا ایک چیخ نما نعرہ ٹکرایا۔ ہم لرز کر رہ گئے' پھر بہن کے رونے کی آواز سن کر کتاب' دوپٹہ اور چپل چھوڑ کر امی کے کمرے کی طرف دوڑے۔ ان دونوں کی حالت دیکھ کر ہم پر بھی سکتہ طاری ہو گیا' بمشکل کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

بھائی نے ہمارے کانپتے ہاتھوں میں تصویر تھما دی۔ پہلی نگاہ کے ساتھ ہی مارے خوف کے ایک دلدوز چیخ ہمارے حلق سے برآمد ہوئی اور ہم بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئے۔ اب عالم یہ تھا کہ ہم تینوں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹے رو رہے تھے۔ تصویر پر دوسری نظر ڈالے بغیر کہ ایک ہی کافی تھی' جوں کی توں وہیں چھپا دی گئی۔

''ہائے' میری آپا کی قسمت پھوٹ گئی۔ اب کیا ہوگا' ان شیخ چلی کو کون دولہا بھائی کہہ کر پکارنے کی ہمت کرے گا؟'' چھوٹی ہمشیرہ نے بین کیا۔

روتے روتے ہمیں بے اختیار ہنسی آگئی۔ بھائی صاحب بولے۔

''شیخ چلی سے زیادہ تو چچا چھکن جونیئر لگ رہے تھے۔''

''شیخ چلی ہوں یا چچا چھکن' تم یہ بتاؤ کہ اب کیا کیا جائے؟'' ہم نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے' صاف انکار کر دو کہ میں ان چچا چھکن سے شادی نہیں کروں گی۔''

''واہ جی واہ! مجھے کیا تیس مار خان سمجھ کر رکھا ہے' میں کیسے کر سکتی ہوں انکار؟''

''تو نہ کرو' رو کیوں رہی ہو' مزے سے شادی کر لو۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ تمہیں چچی چھکنی بننے کا اتنا شوق ہے۔''

''کیا ہو گیا ہے تمہیں آپا! آخر تم کیسے ان جیسے شیخ چلی سے شادی کر سکتی ہو؟ حد ہو گئی' کیا کہیں گی تمہاری سہیلیاں اور پروفیسرز؟ کیا انہیں شادی میں نہیں بلاؤ گی اور وہ تمہاری مسرت باجی وہ تو مذاق اُڑا اُڑا کر تمہاری جان عذاب میں کر دیں گی۔''

ہم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی کسی سہیلی کو نہیں بلاؤں گی۔''

''مگر کرو گی انہی چچا چھکن سے شادی؟'' بھائی نے لقمہ دیا۔

''تصویر دیکھ کر آپا کے تو حواس ہی جاتے رہے' بھلا دیکھو یہ اپنی سہیلیوں کو نہیں بلائیں گی' آخر کیا بہانہ کریں گی؟ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنی شادی پر نہیں بلا سکتی اس لیے کہ جن حضرات سے میرا ناطہ جوڑا جا رہا ہے' وہ ہو بہو شیخ چلی لگتے ہیں۔''

''باز نہیں آؤ گے تم لوگ؟'' ہم نے اپنی سرخ ناک کو دوپٹے سے مسلتے ہوئے کہا۔

''میں کہتی ہوں فضول باتوں کی بجائے کوئی مناسب حل تلاش کرو' یہ تو طے ہے کہ ان حضرت کھوجی سے آپا کا نباہ مشکل ہے۔''

''تصویر تم نے غور سے دیکھی تھی' قرولی تو نہیں ہاتھ میں؟'' بھائی نے بات کاٹی۔

''جب میں بات کرتی ہوں تو تم ضرور درمیان میں ٹانگ اڑاتے ہو۔ مجھے قرولی دیکھنے کا ہوش ہی کہاں رہا تھا--- ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جب تصویر دیکھ کر یہ عالم ہے تو اگر سچ مچ وہ ساری زندگی کو سامنے آن کھڑے ہوئے تو یہ روتی روتی اندھی ہو جائیں گی۔''

''یہ کیا بدفال منہ سے نکال رہی ہو' میں کیوں ہوں اندھی؟'' ہم صاف برا مان گئے۔

''نہ نہ تم کیوں اندھی ہو گی' تمہارے تو دیکھتے ہی چودہ طبق روشن ہو جائیں گے' آنکھ میں نور دل میں سرور پیدا ہوگا۔''

''دھیان رکھنا کہیں یوسف ثانی کو دیکھ کر بجائے انگوٹھے کے پورا ہاتھ کلائی تک نہ اڑا دینا۔''

''ہائے' ہائے کیسے ستمگر بہن بھائی ہیں۔ کوئی مجھے اندھا بنائے دے رہا ہے' کوئی سرے سے ہاتھ کا دشمن ہوا ہے۔''

''تو پھر انکار کیوں نہیں کر دیتیں' میں کس منہ سے اپنے دوستوں کو بلا کر درشن کراؤں گا؟ لیجئے' ان سے ملیے یہ ہیں ہمارے بہنوئی براہِ راست ولایت سے درآمد کیے گئے ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ وہ انہیں سعید لخت کا حافظ جی سمجھ بیٹھیں اور اپنی خوش قسمتی پر ناز کریں کہ وہ کردار جیتا جاگتا دیکھ لیا جس کے بارے میں اب تک پڑھا ہی تھا۔''

''اُف اللہ! میری سہیلیاں بھی تو آئیں گی۔ میں کیا جواب دوں گی' ان کو کیسے بتاؤں گی کہ یہ میرے دولہا بھائی ہیں؟''

مارے گھبراہٹ کے ہمارے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوئے جا رہے تھے' اوپر سے ان ظالموں کے کھینچے ہوئے بھیانک نقشے۔ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں غائب ہو گئی تھیں۔ آخر خاصی و بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم قطعی خاموش رہیں گے' یہ دونوں ہمارے وکیل بن کر امی جان کے حضور جائیں گے اور ہمارا کیس لڑیں گے۔

امی نے سب کچھ بڑے صبر اور تحمل سے سنا اور صاف کہہ دیا کہ شریفوں میں زبان دے کر پیچھے نہیں ہٹا جاتا۔ جو قسمت میں لکھا ہے' وہی ہو کر رہتا ہے۔ تصویر سے کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ ہے بھی چھ سات سال پرانی۔ والدہ' والد اور بہن اچھی شکل و صورت اور شخصیت کے مالک ہیں' وہ ان سے مختلف نہیں ہو سکتا اور پھر مردوں کی صورت، کون دیکھتا ہے؟ شادی کرنے آئے گا' مقابلہ حسن میں حصہ لینے تو نہیں۔ میاں' میاں ہوتا ہے ڈیکوریشن پیس نہیں کہ ڈرائنگ روم میں سجانے یا سہیلیوں کو دکھانے کے کام آئے۔

بھائی بولا۔ ''آپ بھی عجیب لوگ ہیں؟ دیکھا نہ بھالا اور پٹ منگنی کر دی۔ کبھی کسی نے ایسے بھی کیا ہے' ہماری بہن فالتو تو نہیں ہے جو اس طرح میاں کھوجی کے حوالے کیا جا رہا ہے؟''

بہن نے مصالحت کی راہ نکالی۔ ''امی! کیا ایسے نہیں ہو سکتا کہ اس دن دولہا کوئی اور بن جائے تھوڑی دیر کے لیے۔''

امی غضبناک ہو گئیں۔ ''دماغ خراب ہو گیا تم سب کا' میرا الگ خراب کیے دے رہے ہو۔ دولہا ہے یا ہاتھی کا دانت' دکھانے کا اور کھانے کا اور---''

''کھانے کا نہیں' نکاحنے اور نبھانے کا لفظ استعمال کریں۔''

بھائی نے حسب معمول بات کاٹی۔ امی نے سنی ان سنی کر دی اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔

''نہ دیکھا' نہ سنا کہ دولہا کوئی اور بنے اور شادی کسی اور سے ہو--- بھاگ جاؤ یہاں سے' میں اب اس موضوع پر اور کچھ نہ سنوں گی۔''

اور یہ وفد نا کام واپس آ گیا اور ہم بھی بظاہر اپنی تقدیر پر شاکر ہو گئے۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور ہم اس غم میں سوکھنے لگے کہ ہمارے جیسی خوش مذاق اور ذوق جمال رکھنے والی کو تمام عمر شیخ چلی صاحب کی صورت دیکھ دیکھ کر گزارنی ہو گی۔ پندرہ دن پہلے سے بھوک پیاس اور نیند سب اڑ گئی تھی۔ سب کچھ جیسے عالم بے ہوشی میں ہو رہا تھا' اسی عالم میں ہم دلہن بنے اور رخصت بھی ہو گئے۔

بارات کو جلد اور دور جانا تھا اس لیے رخصتی عجب افراتفری اور ہنگامے میں ہوئی۔ ہماری بہن اور بھائی کو موقع ہی نہ ملا کہ وہ ہمیں ان کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچا سکیں یا پھر ان کے خدشات درست ثابت ہوئے تھے اور اب ہمیں بتلا کر وہ مزید صدمہ نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

رات گئے ہمیں حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا اور ہم مارے ڈر کے تقریباً تھر تھر کانپ رہے تھے' لب تھے کہ بار بار خشک ہوئے جا رہے تھے۔ پھر ہمیں یوں محسوس ہوا کہ کوئی کمرے میں داخل ہوا ہے۔ ہم نے ساری شرم ورم رکھ طاق پر اور جلدی سے باریک دوپٹے کے گھونگھٹ کے پار دیکھا تا کہ جتنی جلدی صاحب تصویر کے درشن ہو جائیں' بہتر ہے مگر وہاں تو کوئی اور صاحب کھڑے تھے۔

''ارے' یہ کون ہیں اور اندر کس خوشی میں آ گئے؟'' ہم اور گھبرا گئے۔

سیاہ گھنے بال' ایک لٹ پیشانی پر جھک کر دائیں ابرو کو چومتی ہوئی' صاف ستھرا صحت مند رنگ' دراز قد' اسمارٹ بندہ سفید شلوار قمیص میں--- عربوں جیسے چھوٹی سی داڑھی' بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں' ستواں ناک۔ وہ آگے بڑھے اور سامنے آ گئے۔ ہم نے کانپتی آواز میں بمشکل کہا۔

''آپ کون ہیں اور یہاں کہاں گھسے چلے آ رہے ہیں؟''

وہ ایک لمحے کو حیرت زدہ رہ گئے' کیا واقعی یہ آواز اسی گھونگھٹ میں سے برآمد ہوئی تھی۔

''میں کون ہوں' تم نہیں جانتیں؟''

ارے' یہ تو خواہ مخواہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں تو تڑاخ پر اتر آئے۔

''آپ یہاں سے فوراً تشریف لے جائیے ورنہ ہم کسی کو آواز دیں گے۔''

وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

''بڑے شوق سے' جسے چاہے آواز دو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کمرہ اس خادم کا ہے البتہ تم یہاں کیوں براجمان ہو؟''

''یہ آپ کا کمرہ ہے' سچ مچ؟'' ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

ہائے' اللہ! ہمیں ضرور کوئی یہاں غلطی سے بٹھا گئی ہے۔ ہائے' اب کیا ہو گا' کیا کریں اب؟ ہم تو کسی کو جانتے بھی نہیں' ہمارے ساتھ ہماری خالہ آئی تھیں' وہ بھی پتہ نہیں کہاں ہوں گی۔

''براہ کرم' زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کریں۔ یہ اس وقت سے کیا ''تم تم'' لگا رکھی ہے جیسے بڑی پرانی واقفیت ہو۔''

وہ صاحب مسکرائے ''بہتر ہے جناب والا! جیسے آپ کا حکم' ویسے آپ ہیں کون محترمہ؟''

''پہلے آپ بتایئے آپ کون ہیں؟ میرے بارے میں تو آپ جانتے ہیں' آخر شادی میں شریک ہوئے ہی ہوں گے؟''

''اچھا تو آپ دلہن صاحبہ ہیں؟'' انہوں نے ذرا حیرت سے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تو کیا میں بندریا نظر آرہی ہوں؟'' ہم نے برا مناتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑے ''باتوں سے تو کچھ ایسا ہی شک ہو رہا ہے مگر یہ لال جوڑا اور زیور وغیرہ غالباً بندریاں تو نہیں پہنتیں۔ ہے نا؟--- خیر' تو دلہن صاحبہ! آپ کو کسی نے غلطی سے مابدولت کے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔''

''یا پھر آپ غلطی سے اپنا کمرہ چھوڑ کر یہاں آگئے ہیں؟ بعض دفعہ ایسا گھپلا ہو جاتا ہے' میرا خیال ہے آپ ہی سے غلطی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے چلے جایئے' ابھی وہ آجائیں گے۔''

''وہ کون؟''

''وہی ہمارے شیخ چلی---!''

اور اگلے ہی لمحے ہم نے اپنی زبان دانتوں سے کاٹ ڈالی۔ یہ کیا غضب ہو گیا' ہمارے منہ پر اس قدر یہ لفظ چڑھ چکا تھا کہ بے ساختہ زبان سے پھسل پڑا۔

''کون میں سمجھا نہیں؟''

''ارے بھئی' کون آتا ہے کمرے میں؟ ظاہر ہے کہ دولہا ہی آئے گا۔''

''اچھا---'' انہوں نے لمبی سی اچھا کی ''تو آپ کے دولہا کا نام شیخ چلی ہے' کارڈ پر تو کچھ اور لکھا تھا؟''

''بھئی' خدا کے لیے آپ جایئے' کیوں میری زندگی برباد کرنے پر تل گئے ہیں؟ پہلے ہی میں کون سی بڑی---'' اور ہم پھر چپ ہو گئے کہ اجنبی سے زیادہ پرسنل باتیں کرنا مناسب نہیں۔

''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ گھبراؤ نہیں' جیسے ہی دولہا آئے گا' ہم چلے جائیں گے۔''

''آخر آپ ان کے کیا لگتے ہیں جو یہاں چپک کر رہ گئے ہیں؟''

''وہ میرا ہم زاد ہے۔''

''ماموں زاد' چچا زاد تو سنا ہے' یہ ہم زاد کیا بلا ہوتی ہے؟''

''ابھی تھوڑی دیر میں اس بلا کا اسرار کھل جائے گا۔''

ہم خاموش ہو گئے' وہ بھی خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے گھونگھٹ میں سے نظریں اٹھا کر دیکھا' وہ ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے' بڑے سکون اور اطمینان سے جیسے وہی دولہا ہوں۔ ہمیں پھر پریشانی ہو گئی۔ ہمارے چچا چھکن کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا اور یہ نہ جانے کون مزے سے بیٹھے تھے۔ اگر لوگوں کو پتہ چل گیا کہ دلہن کے کمرے میں ایک شخص گھسا بیٹھا ہے تو کیا ہو گا' کتنی بدنامی ہو گی۔ ہمیں پسینہ آگیا' مارے گھبراہٹ کے زبان لڑکھڑانے لگی۔

''دیکھیے' ہم پردہ کرتے ہیں اور آپ نامحرم ہیں۔ خدا کے لیے چلے جایئے' ہماری شادی بالکل غیروں میں ہوئی ہے۔ ہم یہاں کے طور طریقے رسم ورواج بالکل نہیں جانتے' شاید یہاں سے دولہا سے پہلے دولہا کا ہم زاد آتا ہو مگر ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے۔ آپ اگر تشریف لے جاتے تو اچھا رہتا۔''

''آپ کے شیخ چلی آنے کا نام ہی نہیں لیتے' وہ آئیں تو ہم جائیں۔ ویسے بے فکر رہو' ہم زادوں سے پردہ تھوڑی ہوتا ہے' وہ بھی محرم ہی ہوتے ہیں--- اگر تھک گئی ہو تو گھونگھٹ ہٹا دو' لیٹ جاؤ' یا جو دل چاہے کرو۔''

عجیب ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں یہ ہم زاد بھی؟ اس اطمینان سے بیٹھے تھے کہ نیم دراز ہو گئے تھے' پھر خود ہی بولے۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اصل دولہا نہیں ہوں' کیا تمہیں دولہا سے شرف ملاقات حاصل ہو چکا ہے؟''

''واہ یہ کیا بات ہوئی؟ ان سے نہ سہی' ان کی تصویر کے تو نیاز حاصل ہو چکے ہیں۔''

''تو کیا اس تصویر میں اور مجھ میں کوئی مشابہت نظر نہیں آتی؟''

''کمال ہے' آپ دونوں میں مشابہت کا کیا سوال' کیا وہ آپ کے بھائی وائی ہیں؟''

''بھائی وائی نہیں ہیں' ابھی پہلے عرض کیا تھا نا'' کہ ہم زاد ہیں اور ہم زادوں کی شکل وصورت ایک سی ہوتی ہے۔''

''آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟ آپ دونوں کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ان کے سر پر بال نہیں ہیں اور آپ کے سر پر ٹوکرا بھر بال ہیں۔''

''انہوں نے اپنا سیاہ چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرا'' حیرت انگیز--- اور کیا فرق ہے؟''

''ان کی ناک آپ سے لمبی ہے' وہ آپ سے دبلے اور ان کی داڑھی---''

''ہاں ہاں ان کی داڑھی؟''

''مختلف ہے۔''

''کیا مطلب؟ یہ کون سی تصویر ہے، کسی نے غلط تصویر تو نہیں بھیج دی شرارت سے۔''

''سنا ہے، حج کے بعد کھنچوائی تھی۔''

''اوہ!'' وہ بے ساختہ ہنس پڑے ''خاصی باریک بینی سے اس تصویر کا معائنہ کیا گیا تھا۔ میری بھولی بہن کو اور کوئی نہ ملی تو اس نے وہی بھجوا دی۔ تو محترمہ! آخر سات سال گزر گئے ہیں، اتنے عرصے میں میرا خیال ہے بال اُگ آتے ہیں اور پھر وزن بھی انسان کا کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے۔''

ہم نے گھونگھٹ الٹ دیا، ہماری آنکھیں اور منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ تو یہ تھے ہمارے شیخ چلی، چچا چھکن، میاں کھوجی اور نہ جانے کیا کیا!

☆☆

شادی کے کچھ عرصہ بعد میرے شوہر ایک روز فرمانے لگے کہ بہت ہولی اب تم سیدھی طرح اپنا چارج سنبھالو۔ بہت عرصہ ہم نے پیٹ پوجا کے سلسلے میں اپنی انگلیاں فگار بلکہ خونچکاں تک کی ہیں۔ اب ہمیں چھٹی ملنی چاہیے، آخر کو خاتون خانہ بلکہ چراغ خانہ ہو۔ کچھ جلو، کچھ جلاؤ تاکہ روشنی ہو۔

''بھئی، آخر یہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ سیدھے سبھاؤ گفتگو نہیں کر سکتے؟'' ہم ذرا تنک کر بولے۔

''مطلب صاف ہے۔ باورچی خانہ دراصل آپ کی حکومت کا دارالخلافہ ہے، آپ کب تک وہاں قدم رنجہ نہ فرمائیں گی؟ کچھ اس کی خیر خبر لیجئے، آب و ہوا کا اندازہ کیجئے۔ لون تیل لکڑی پہچانئے، ادرک کا سواد چکھئے۔ ہم کو جتنا کرنا تھا کرلیا، بس آپ جانیں اور آپ کا کام!''

ان کے لہجے کی بے پناہ سنجیدگی دیکھ کر ہم کھٹک گئے کہ معاملہ سیریس ہے۔ ویسے بھی جب یہ تم سے آپ پر آجاتے تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ اب دال اور نہ گلے گی۔ ہم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''تو بھائی! آپکی پکائی کا سنہری دور ختم ہوا۔ اب ہو جاؤ تیار چولہا جھونکنے کے لیے۔''

چنانچہ اگلے روز صبح سویرے قدم لرزیدہ ہم کچن میں داخل ہوئے جو اب تک ہمارے لیے شہر ممنوع تھا اور اس شان سے داخل ہوئے کہ ہمارے بازوان ضخیم کتابوں کے بوجھ سے ٹوٹے جارہے تھے جو انہوں نے بڑی محنت سے اپنی نادیدہ دلہن کے لیے پچھلے پانچ برسوں میں جمع کی تھیں۔ ان کے علاوہ امی جان کی وقتاً فوقتاً بھیجی ہوئی ترکیبوں کی پرچیاں بڑی نفاست سے دیوار پر پن سے چپکا دیں۔ بڑے اہتمام سے پھولدار ایپرن باندھا اور ناشتہ بنانے کی ابتداء کی۔ ساری کتابیں چھان ماریں مگر انڈا ابنانے کی ترکیب کسی میں بھی نہیں لکھی تھی۔ کمال ہے، بنیادی چیز ہی موجود نہیں تھی۔ بغیر بنیاد کے بھی بھلا کبھی عمارت اٹھی ہے؟ ان بادشاہوں، راجوں اور نوابوں کی مرغیاں کیا تلے ہوئے انڈے دیتی تھیں یا وہ کچے انڈے ہی ہڑپ کر جاتے تھے؟ بہت ممکن ہے اس زمانے میں کچے انڈے ہی کھانے کا رواج ہو، تلنے تلانے کا چکر انگریزوں نے ایجاد کیا--- ہم نے انگریزی کتابوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لو جی، ان کم بختوں کی بھی مت ماری گئی ہے۔ ''فرائیڈ ایگ'' کی ترکیب لکھنا یہ بھی بھول گئے، کیا فائدہ ان کتابوں کا؟ ہم نے کتابیں ایک طرف پٹخیں اور خود اپنی عقل سلیم سے کام لینے کا ارادہ کیا۔

انڈہ پہلے ہوتا ہے یا گھی؟ ہم سوچ سوچ کر پاگل ہوئے جارہے تھے۔ آخر ہم نے پہلے گھی ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ فرائی پان میں گھی ڈال کر ہم انڈے کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب طرف سے الٹ پلٹ اور گھما کر دیکھا، آخر یہ کہاں سے توڑا یا پھوڑا جاتا ہے مگر وہاں کوئی نشان کوئی اشارہ یا کوئی ہدایت موجود نہ تھی۔ بالکل صاف ستھرا چکنا گھڑا تھا۔ اب پتہ چلا کہ انڈا توڑنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ بادام اخروٹ کی طرح زمین پر رکھا اور کوئی بھاری سی چیز کھٹاک سے دے ماری۔ نہ آلو پیاز کی طرح ہے کہ چھری سے کاٹ لیا۔ لیموں بھی نہیں کہ آسانی سے نچوڑ لیا۔ چھلکا تو ہے مگر مالٹے، کنو کی طرح چھیلا نہیں جا سکتا۔ بڑی احتیاط اور نزاکت سے اس میں سوراخ کرنے کی کوشش کی۔ سوراخ تو ہو گیا مگر

لچکدار غزل

میرے آٹا شاٹا سے ''مل'' نے ''غذائی'' کھینچ لی
دُودھ والے نے میرے ''دُودھ'' سے ملائی کھینچ لی
اب تلک لرزہ کے تپ شپ میں ہیں یارو مبتلا
غیض کے عالم میں جب اُس نے تپائی کھینچ لی
سو رہے تھے گھوڑے شوڑے بیچ کر مزے سے ہم
ہنہنا کے اُس نے اُوپر سے رضائی کھینچ لی
جلوہ شلوہ کے لئے جو روزنِ دیوار تھا
کھینچ کے پردہ وہاں، جلوہ نمائی کھینچ لی
حال شال اِک قرض خواہ نے میرا ایسا کر دیا
جسم کی جو چیز اُس کے ہاتھ آئی، کھینچ لی

❁ فضل کریم شگفتہ

زردی اور سفیدی نے باہر آنے سے صاف انکار کر دیا۔ سوراخ بڑا کیا تو خالی سفیدی لٹکنے لگی۔ کیا مصیبت ہے؟ ہم نے انگوٹھے سے سوراخ کو دبایا اور انڈا چھلکوں سمیت ہی فرائی پان میں جا پڑا۔ دو چار چھینٹیں بازور پر پڑیں جنہیں نظر انداز کر کے ہم چھلکے چننے لگے، جتنے دستیاب ہو سکے، کوڑے کے ٹین کی نذر ہو گئے۔

انڈہ توڑنے کے عمل نے شاید وقت کچھ زیادہ لے لیا تھا۔ گھی خوب گرم ہو گیا تھا لہٰذا سفیدی تو فوراً سکڑ سکڑا کر مرنڈا سی بن گئی اور زردی کچی رہ گئی۔ اب جو اس انڈے کو پلیٹ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ نابکار پہلے تو فرائنگ پین ہی سے چپک گیا، جلدی سے چمچ سے پلٹا تو چمچے کی جان کو آلپٹا۔ بمشکل اس بلائے جان کو پلیٹ کی زینت بنایا، اس تگ ودو میں اس کی صورت کچھ اور بگڑ گئی۔ اب اس میں بھلا ہمارا کیا قصور تھا؟

یہ ناشتے کے لیے آئے۔ غور سے اس عجیب الخلقت انڈے کو دیکھا، کچھ دیر دم بخود رہے، قوت گویائی واپس آئی تو پوچھا۔

''بھئی، یہ کس قسم کا انڈہ بنایا گیا ہے؟''

''کیوں کیا ہوا، کیا خرابی ہے اس میں؟''

''تمہیں کیا یہ کوئی نارمل قسم کی چیز لگ رہی ہے؟'' انہوں نے نوالہ توڑا۔

•

''چیز کیا مطلب، انڈہ ہے۔ اپنے وطن میں تو اسی طرح انڈہ بنایا جاتا ہے، پہلے گھی ڈالا پھر۔''

انہوں نے بات کاٹی ''اپنے وطن میں کیا انڈے کے ساتھ چھلکے بھی تلے جاتے ہیں؟''

''میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی البتہ یہ چھلکے نقصان دہ ہرگز نہیں ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ان میں کیلشیم ہوتا ہے جو ہڈیوں اور دانتوں کے لیے بڑی مفید ہے۔''

''میری ہڈیاں اور دانت بفضل خدا بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ اب کل کہو گی کہ کیلے، انناس اور ناریل بھی چھلکے سمیت کھاؤ کہ ان میں بھی کئی قسم کے وٹامن پائے جاتے ہیں۔''

''لیجئے، اب ہم اتنے بھی بے وقوف نہیں ہیں۔''

انہوں نے ہماری بات کا جواب دینے کی بجائے اٹھ کر اپنے لیے ایک بے حد حسین انڈہ تل لیا بلکہ از راہ کرم ہمارے لیے بھی بنا دیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے ہم سے کھانا پکانے کی ذمہ داری واپس لے لی گئی تاکہ ہم اطمینان سے ناشتہ بنانے میں مہارت حاصل کر لیں۔

جب ہم ناشتہ بنانے میں طاق ہو گئے تو ایک روز سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہوں اور کھانا پکانے کا تجربہ بھی کر ڈالیں۔ آخر ناشتہ جیسی مہم سر کر ہی چکے ہیں گویا آدھے باورچی تو ہم بن چکے ہیں۔ سب سے آسان ترکیب ''کڑھی'' کی نظر آئی۔ لکھا تھا، دہی ایک پاؤ، بیسن ایک چھٹانک اور پانی ایک سیر ہم نے سوچا کہ پاؤ بھر تو بہت کم رہے گی کم از کم سیر بھر تو ہو تاکہ ایک آدھ وقت اور بھی چل جائے۔

اگلے روز دودھ والے سے ہم نے چار پیالے دہی کے لیے، ان میں ایک پاؤ بیسن گھولا۔ پانی کیسے تولیں، ترازو، بٹہ تو ہے نہیں، کافی غور وخوض کے بعد یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ دودھ کی خالی بوتل سے بھی پانی ناپا جا سکتا ہے۔ اب جو پانی ڈالنا شروع کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے پاس موجود کسی پتیلی کا اتنا بڑا ظرف نہیں ہے جس میں چار سیر پانی سما جائے۔ طوعاً وکرہاً غسل خانے کی بالٹی میں یہ ملغوبہ گھولا اور موجود تین پتیلیوں میں ڈال کر چولہوں پر چڑھا دیا۔ ایک گلاس پھر بھی بچ رہا تھا جسے ہم نے چپکے سے سنک میں بہا دیا۔ کم بخت یہ ذہن میں ہی نہ آیا کہ پاؤ بھر دہی کی کڑھی مناسب تھی۔ وقت کاٹنے کے لیے ایک ناول لے کر بیٹھ گئے۔

دوپہر سے سہ پہر ہو گئی، ان کی واپسی تک کڑھی تیار ہونے کے کوئی آثار نہ دیکھ کر ہم نے کوئی اور آسان سی چیز پکانے کی ٹھانی۔ کافی فکر اور مطالعے سے یہ پتہ چلا کہ ہر کھانے میں ہلدی، دھنیہ، نمک، مرچ، پیاز، لہسن اور ادرک ضرور پڑتا ہے۔ معلوم نہیں اس خام مواد سے تیار ہونے والی اشیاء کے نام جدا جدا رکھنے میں کیا مصلحت تھی؟ ہم نے آنکھیں بند کر کے چند دعائیں پڑھیں اور کتاب کھولی تو پہلے صفحے پر کوفتوں کا نام جگمگا رہا تھا۔ ذرا کی ذرا گھبرائے مگر پھر اس مشہور نظم کا مصرع دماغ میں گونجا:---

''اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے''

اپنے خدا پر ہمیں پورا بھروسا تھا اور پھر کوفتوں میں بھی وہ ساری ہی چیزیں پڑتی تھیں جو تمام سالن کا بنیادی فارمولا ہیں لہٰذا کچھ نہ کچھ پکے گا ضرور۔ کوفتے نہ پکے قورمہ یا قیمہ بن جائے گا۔ بعد میں دیکھیں گے جس کھانے کی بھی جھلک نظر آئی، وہی نام رکھ دیں گے اور ویسے بھی بھلا ناموں میں کیا رکھا ہے۔

فریج میں سے قیمہ نکالا اور بتائے گئے تمام مسالہ جات اس میں ڈال دیے سوائے چنوں اور خشخاش کے۔ دو ہی چیزیں تو کم تھیں بھلا بقیہ چیزوں کی موجودگی میں ان دو کی کمی کا کہاں پتہ چل سکتا تھا؟ سل بٹہ بھی موجود نہ تھا کہ کوٹتے پیستے، ایسے ہی گوندھ گوندھ کر گولے سے بنا لیے۔ پیاز گھی میں سرخ کیا اور نمک مرچ ہلدی لہسن وغیرہ ڈال کر مصنف کی

ہدایت کے مطابق بھوننا شروع کیا۔ محترم نے مسالوں کے بارے میں صرف اتنا لکھا تھا کہ اندازے کے مطابق یا حسبِ ذائقہ ڈال لیں۔ اندازہ کبھی کیا ہوتا تو اندازہ ہوتا' بس ہر چیز کا پوڈر چمچی بھر ڈال دیا البتہ دھنیہ مٹھی بھر جھونک دیا' کہیں پڑھا تھا کہ دھنیہ دماغ کے لیے بہت مفید ہے--- میاں بیچارے کی پڑھائی جمع خرچ اور حساب کتاب والی تھی جس میں دماغ خاصا کھپتا ہے۔ ہمیں یہ علم قطعی نہ تھا کہ مسالہ پانی ڈال کر بھونا جاتا ہے یا بغیر پانی کے۔ کتاب اس بارے میں خاموش تھی' صرف اتنا لکھا تھا کہ جب گھی چھوٹ جائے اور مسالہ بھننے کی خوشبو آنے لگے تو سمجھیں ہنڈیا بھن گئی۔ گھی تو پہلے ہی ہمارے چھکوں کی طرح چھٹا ہوا تھا البتہ جب خوشبو کی بجائے عجیب سی بو آنے لگی تو ہم نے فوراً کئی گلاس پانی کے ڈال دیے۔ جب ابلنے لگا تو اس میں کوفتے چھوڑ کر ڈھکنا بند کر دیا اور لگے کوفتوں کا انتظار کرنے۔ یہ بتانا تو بھول ہی گئے کہ تینوں پتیلیوں میں تو کڑھی تھی' پھر کوفتوں کے لیے پتیلی کہاں سے آئی؟ ہم نے تیسری پتیلی کی کڑھی دو پتیلیوں میں انڈیلی اور باقی کڑھی لوٹے کو مانجھ کر اور پاک کر کے اس میں ڈال دی اور لوٹا سنک میں رکھ دیا اور بھلا ہم کیا کرتے؟

تھوڑی دیر بعد پتیلی کا ڈھکنا اٹھا کر جو دیکھتے ہیں جو سوائے حیرانی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ کوفتوں کا حجم گھٹ گیا تھا' مسالے سے پانی میں کوفتوں کی پوری ذریت ہر سائز کی تیر رہی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں ان کا سائز مزید کم نہ ہو جائے یا یہ پھر سے ابتدائی حالت پر نہ آ جائیں' ہم نے پتیلی اتار لینے ہی میں عافیت سمجھی۔ اوپر سے تھوڑا سا ہرا دھنیہ اور ہری مرچیں ضرور کاٹ کر ڈال دیں۔ اب تک ہم نے اپنی پوری زندگی میں جو کچھ تناول فرمایا تھا' اس میں سے کسی کی بھی جھلک اس میں نظر نہ آئی لہٰذا نام تجویز نہ ہو سکا۔

شام کو چائے سے فارغ ہو کر وہ کچن کی طرف جانے لگے تو ہم نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

''کدھر کے ارادے ہیں؟''

''جہاں کے روز ہوتے ہیں۔''

''یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں کہ کہاں کے؟''

''کمال ہے' آج پہلی مرتبہ تو نہیں جا رہے جو پوچھ رہی ہو۔ کھانا پکانے کا فرض نبھانے اور کہاں جاؤں گا؟''

''وہ تو ہم پکا چکے۔''

''اچھا---'' انہوں نے قدرے حیرت سے کہا جیسے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔

''کیا پکایا ہے؟''

''سرپرائز دیں گے آپ کو۔''

''ماشاءاللہ!''

''آپ اطمینان سے اخبار پڑھیں یا امتحان کی تیاری کریں' ہم منٹوں میں کھانا لگا کر بلاتے ہیں۔''

ہم نے کھانے کی میز پر اپنے جہیز کا خوبصورت میز پوش بچھایا' پلیٹیں رکھیں' نیپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں اڑسے دو طویل قامت موم بتیاں جلائیں۔ ایک گلدان میں پچھواڑے سے توڑے ہوئے گلاب سجائے۔ تھوڑا سا مشرقی انداز دینے کو ایک اگربتی بھی سلگا دی۔ سارے انتظامات پر ایک ناقدانہ نظر ڈال کر ان کو بلوایا۔

''واہ بھئی' واہ خوب رومینٹک ماحول ہے۔ شمع کی روشنی' گلابوں کی مہک' اگربتی کی خوشبو' بڑی سگھڑ اور سلیقہ مند بیوی نظر آ رہی ہو۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔

ہم نے ان کے سامنے اچار' چٹنی' سلاد' سلائس اور کوفتوں کا ڈونگا رکھ دیا۔ انہوں نے ڈھکنا اٹھایا اور ذرا سا چونکے یا شاید ہمیں غلط فہمی ہوئی ہو کیونکہ بظاہر چونکنے یا چوکنا ہونے کی کوئی بات نہ تھی۔

''یہ کون سی ڈش ہے؟''

''آپ کو کیا لگ رہی ہے؟''

''کبھی پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کون سے ملک کا کھانا ہے' اسپین یا ترکی کا؟''

''اپنے ہی ملک کا کھانا ہے' اب ایسے بھولے بھی آپ نہیں کہ پہچان ہی نہ سکیں۔''

سیاہ فام

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہسپتال کے شعبہ زچہ خانے کے باہر تین پروفیسران سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے اور بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اچانک نرس سعیدہ بیگم گود میں ایک سیاہ فام بچے کو لئے ہوئے باہر نکلی اور اس نے بدحواس پروفیسر سید زاہد حسین نقوی سے پوچھا۔

''یہ بچہ تمہارا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں---''

نرس سعیدہ بیگم نے دوسرے پروفیسر سید سکندر علی ترمذی سے پوچھا۔

''کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں---''

تیسرے پروفیسر سید ساجد حسین نقوی نے نرس سعیدہ بیگم کے پوچھنے سے پہلے ہی کہا۔

''یہ میرا بچہ حسنین ہوگا۔ میری بیوی شہنشائی عرف بنو ہر چیز کو سیاہ کر ڈالتی ہے۔''

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی' کراچی

''بخدا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، کچھ اتہ پتہ بھی تو دو؟''

''کوفتے ہیں۔''

''کوفتے---؟'' ان کے ہاتھ سے چمچہ گرتے گرتے بچا۔

''جی ہاں، تھے تو کوفتے بس ذرا ٹوٹ گئے ہیں۔ آپ کوفتیاں کہہ لیجئے۔''

''تمہارے ہاں کوفتے ایسے پکتے ہیں؟''

''پکائے تو اسی طرح جاتے ہوں گے مگر پکنے کے بعد ان کی شکل ان سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ رام پور کے کسی رکابدار کی ترکیب ہے، بہت ممکن ہے نواب لوگ ایسے ہی کوفتے پسند کرتے ہیں؟''

''ہم میں سے کون ہے جسے کبھی کسی نواب نے انوائٹ کیا ہو؟ اگر آپ کوئی اور نام اس ڈش کا رکھنا چاہیں تو رکھ لیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

انہوں نے چمچہ بھر مٹیالا پانی پلیٹ میں ڈالا، کوفتوں کے کچھ نوزائیدہ بچے بھی ساتھ چلے آئے۔

''اس کا رنگ ایسا کیوں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مرچوں سے رنگ نکلتا ہے، نا! میں نے کم ڈالی ہیں، آپ کم جو کھاتے ہیں۔''

''اور یہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ یہ خاکسار نمک سے بھی پرہیز کرتا ہے۔''

''ہائے میرے اللہ! کیا میں نمک ڈالنا بھول گئی حالانکہ جو چیز ڈالتی تھی، اس پر ٹک مارک کر دیتی تھی---- یہ لیجئے نمک۔''

''میرا تو خیال ہے کہ سارے مسالے ڈالنا بھول گئی ہو۔''

''نہیں، نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے تو خود خاص طور پر مٹھی بھر دھنیہ ڈالا ہے، دماغ کے لیے بہت مفید ہے۔''

''تو پھر یوں کرتے ہیں کہ چھلنی سے چھان کر کوفتے کے ذرات الگ کر دیتے ہیں اور پانی بطور تیل سر میں ڈال لیتے ہیں تاکہ دماغ کو طاقت پہنچے۔''

ہم نے ان کی اس اعلیٰ درجے کی تجویز پر کوئی رائے دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ خاموشی سے کھا رہے تھے، سچی بات تو یہ ہے کہ اپنا پکایا ہوا یہ کھانا ہمیں بھی ذرا نہ بھایا۔ ایک دو سلائس بمشکل زہر مار کیے، اس کے باوجود ہم نے ان کی رائے لینا ضروری سمجھا۔ ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''کھانا کیسا ہے؟''

''انہوں نے ایک نظر ہمارے پرشوق چہرے پر ڈالی ''بہت مزیدار---!''

ہمیں اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، عورت کے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہوئے انہیں پانچ برس گزر گئے ہیں۔ کیسے ترسے ہوئے ہیں بیچارے! تبھی اتنے ذوق و شوق سے کھا رہے ہیں۔ ہمارا دل تھوڑا تھوڑا ابھر آیا اور ہم نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے ان کے لیے کھانا پکایا کریں گے۔ کھانے کی بے لذتی اور ان کے شوق کی انتہا دیکھ کر ہم نے ایک بار پھر کریدا۔

''کیا واقعی مزیدار ہے؟''

کہنے لگے ''ذائقہ تو ہاتھ میں ہوتا ہے، مرچ مسالے میں نہیں۔''

ہم نے بڑے خلوص سے شکریہ ادا کیا، وہ برتن سمیٹ کر سنک میں رکھنے لگے اور ہم کرسی سے ٹیک لگائے سیب کترنے لگے۔

کچھ دیر بعد ہم برتن دھو رہے تھے کہ غسل خانے سے ان کے چلانے کی آواز آئی۔ ہم بدحواس ہو کر دوڑے۔

''اللہ رحم کرے کسی کیڑے مکوڑے نے نہ کاٹ لیا ہو۔''

''کیا بات ہے، کس نے کاٹا آپ کو فرسٹ ایڈ کی کتاب لاؤں؟''

اندر سے جھنجلائی ہوئی آواز آئی ''یہ لوٹے میں کیا بلا ہے؟''

ہم ذرا حیران ہوئے، پھر اچانک یاد آ گیا۔

''بلا نہیں ہے جی، کڑھی ہے۔''

ہم نے اطمینان کا سانس لیا، انہوں نے ناگواری سے دروازہ کھولا اور تقریباً پھاڑ کھانے والے انداز میں بولے۔

''کڑھی سے کون گدھے کا بچہ طہارت کرتا ہے، کس حکیم نے تمہیں یہ نسخہ بتایا ہے؟''

''ہائے اللہ! یہ طہارت کے لیے تو نہیں رکھی، آپ بھی قسم سے غضب کرتے ہیں۔ ہمیں کوفتے پکانے کے لیے پتیلی کی ضرورت تھی اس لیے ہم نے لوٹے میں کڑھی ڈال دی تھی۔ پتہ نہیں آپ کچن سے لوٹا کیوں اٹھا لائے خواہ مخواہ میں۔''

انہوں نے لوٹا تقریباً ہمارے ہاتھوں میں پٹخ دیا۔

''باقی پتیلیاں کہاں تھیں؟''

''ان میں بھی کڑھی ہے۔'' ہم نے ان کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کیا---؟'' وہ ایک بار پھر چلائے ''ان میں بھی کڑھی ہے؟''

ہمیں مجبوراً ساری داستان سنانی پڑی، شکر ہے کارگزاری ختم ہوتے ہوتے ان کا موڈ کسی حد تک ٹھیک ہو گیا تھا کیونکہ وہ ہنس رہے تھے، نہ جانے کیوں؟

☆☆

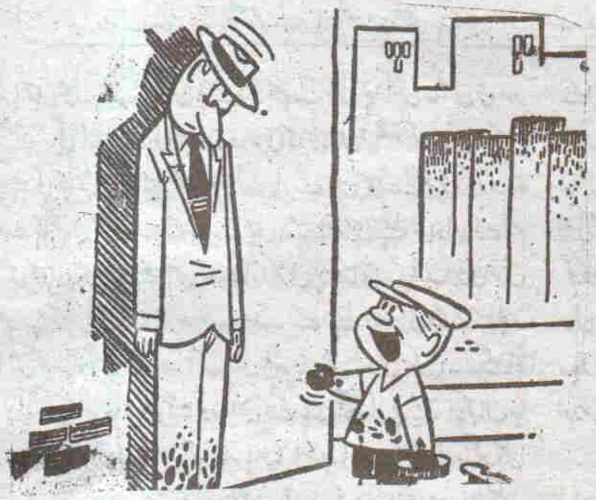

روحانی ڈیڈی

☆ امجد یوسف

بات اِس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آتش پر نئی نئی جوانی آئی تھی یعنی ہم نے نیکر پہننا اور ناک صاف کرنا سیکھ لیا تھا۔ ہم کو آگاہ کیا جا چکا تھا کہ حضور والا کا نام امجد ہے اور جہلم وہ خوش نصیب شہر ہے جس میں پیدا ہو کر اس کی رونق بڑھائی ہے جب کہ ہمارے گاؤں کا نام کالا گوجراں ہے۔ جب ہم چند دن بعد مزید بڑے ہو گئے تو گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ موصوف کو سکول داخل کرا دیا جائے۔ جونہی یہ بل متفقہ طور پر پاس ہوا' اس کے اگلے دن ہی والد صاحب نے ہماری انگلی تھامی اور سکول کی طرف چل پڑے۔ ہمارے گاؤں میں تین سکول تھے۔ ایک لڑکیوں کے لئے اور دو سکول لڑکوں کے لئے۔ ان میں سے ایک ہائی سکول اور دوسرا مڈل سکول تھا۔ اس سکول کے ساتھ ہی ایک بڑا تالاب تھا' اسی مناسبت سے مڈل سکول کو چھپڑ والا سکول کہا جاتا تھا۔

ہم دونوں باپ بیٹا سکول پہنچ گئے اور جاتے ہی ہمیں (اباجی کو نہیں) داخلہ مل گیا۔ اس کے بعد ہم کو ایک بھوری بھوری آنکھوں والے ماسٹر کے پاس پہنچا دیا گیا جن کا نام ماسٹر خلیل تھا۔ اس طرح وہ ہمارے پہلے استاد یعنی روحانی ڈیڈی کہلائے۔ ڈیڈی جی کو دال سویّاں اور ریوڑیاں کھانے کا بہت شوق تھا اور یہ شوق ان ملزمان کی جیب سے پورا ہوتا تھا جو گھر کا کام کر کے نہیں آتے تھے۔ اباجی نے چلتے چلتے ماسٹر جی کو کچھ رقم ادا کی تا کہ اس رقم سے ہم کو سکول آنے کے لئے پابند کیا جائے۔ یہ روایت ہمارے جہلم میں کافی پہلے سے چل رہی تھی۔ دراصل قصہ یوں تھا کہ بچے جب سکول میں داخل ہوتے تو سزا اور جزا والا سلسلہ دیکھ کر سکول میں دوبارہ داخل ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے اور انہیں ڈنڈا ڈولی کر کے سکول لایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس خدشے کے پیش نظر والدین اساتذہ کو کچھ رقم دے جاتے تا کہ بچے کو روزانہ کچھ پیسے استاد دیتا رہے اور بچہ پیسوں کے لالچ میں روزانہ سکول جائے۔ جب تک یہ سلسلہ چلتا رہتا تو بچہ بہت خوش رہتا اور جب اور امداد کی فراہمی رُک جاتی تو وہ کچھ نہ کر پاتا۔ ایک تو وہ سکول کا عادی ہو چکا ہوتا۔ دوسرا وہ انتظار میں رہتا کہ شاید امداد کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جائے۔ (لگتا ہے امریکہ نے بھی آج کل یہی پالیسی اپنائی ہوئی ہے) چنانچہ ہم کو بھی اسی سنہرے جال میں پھنسایا گیا۔ چند روز تو ہم بھی سلطان برونائی بنے رہے یعنی گھر سے بھی پیسے ملتے اور سکول سے بھی۔ اس طرح ہم نے خوب عیاشی کی۔ آلو چھولے کھائے' ریوڑیاں اور مونگ پھلی خریدی اور غباروں کی شاپنگ کی۔ جب امداد بند ہو گئی تو ہمیں شبہ گذرا کہ ماسٹر صاحب شاید بھول گئے ہیں۔ اس لئے اشاروں اشاروں میں ہم نے ماسٹر صاحب کو یاد دلایا لیکن ان کے ماتھے پر جوں بھی نہیں رینگی (ویسے بھی انہوں نے تازی تازی ٹنڈ کرائی ہوئی تھی) ہم اسی انتظار میں رہے کہ امداد کا سلسلہ دوبارہ کب شروع ہوتا ہے لیکن انتظار طویل تر ہوتا چلا گیا اور زمانہ حال تک جاری ہے۔

ہمیں جس جماعت میں رکھا گیا اسے کچی جماعت کہتے تھے جب کہ آج کل نرسری یا پریپ کہا جاتا ہے۔ ہماری کلاس کو جماعت الف کا درجہ حاصل تھا جب کہ جماعت ب میں زیادہ تعداد باغیوں کی تھی جن کا کام ہی یہی تھا کہ وہ سکول سے فرار کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے رہیں۔ اتفاق سے اس جماعت کے استاد کا نام بھی خلیل تھا۔ موصوف بالکل عمرو عیار جیسے تھے لمبی سی داڑھی' تیز اور کرخت آواز' لمبا سا لبادہ' دبلے پتلے اور پھرتیلے تھے۔ جب کوئی باغی فرار کی کوشش کرتا ہوا پکڑا جاتا۔ اس کو ایک ٹانگ سے پکڑ کر ہوا میں معلق کر دیتے اور اوپر سے نیچے تک اچھی طرح دھنائی کرتے۔ اس طرح باغی کی فریاد بھی عرش پر پہنچنے کی بجائے زمین پر ہی رہ جاتی۔ یہ دل خراش منظر دیکھ کر بہت سوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے جن میں بعض ہمسایہ کلاس کے یعنی ہماری جماعت کے ہوتے تھے۔ ہمارا شمار اچھے لڑکوں میں ہوتا تھا کیونکہ ہماری والدہ نے ہمیں گنتی اور الف ب پہلے سے سکھا دی تھی اس لئے ہم کو زیادہ

سزا نہیں ملی۔ جب امتحان ہوئے تو ہم نے پہلی پوزیشن حاصل کی اور ہمیں ''پکی'' جماعت کی بجائے دوسری کلاس میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ جس استاد کی کلاس میں بھیجا گیا' ان کے بارے میں کسی نے مخبری کی کہ وہ بہت ظالم ہیں بغیر وجہ کے مارتے ہیں۔ یہ سنتے ہی پہلے ہی دن سے ہم ایسی کلاس میں جا بیٹھے جس میں ہمارا کزن پڑھتا تھا۔ یہ ایک بڑی خوش نصیب کلاس تھی۔ ماسٹر صاحب سب سے پہلے حاضری لگاتے۔ چند باتیں کرتے اس کے بعد تاک میں بیٹھ جاتے۔ جونہی سکول کے عملے کا کوئی رکن باہر جاتا نظر آتا فوراً اس کے پاس پہنچ کر پوچھتے کہ کہاں جا رہے ہو۔ اگلا آدمی جہاں بھی جا رہا ہوتا' ماسٹر صاحب اس کے ساتھ چل پڑتے۔ بعض دفعہ ماسٹر جی کو ساتھ لے جانے سے انکار ہو جاتا لیکن ماسٹر جی بھی کہاں سنتے تھے' اپنی بات منوا کے ہی چھوڑتے۔ اسی لئے سارا عملہ ان کو بددعائیں جب کہ سارے لڑکے دعائیں دیا کرتے۔ یہ جماعت ایک بڑے برگد کے سائے تلے بیٹھا کرتی تھی۔ اس لئے سارے لڑکے پورا دن برگد کی جڑوں پر سائنسی تجربات اور آپس میں سر پھٹول کرنے میں مصروف رہتے۔ ہر لڑکا سکول سے بھاگنے میں ماہر اور جدید دور کی گالی گلوچ میں ڈگری ہولڈر تھا۔ ماسٹر صاحب تو کلاس میں ہوتے نہیں تھے اس لئے سکول کے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ادھر تو ہمارے روز و شب ایسے ہی بسر ہو رہے تھے اور دوسری طرف ہماری اوریجنل کلاس میں ہمارا نام حاضری کے لئے پکارا جاتا۔ ایک دن ماسٹر صاحب نے لڑکوں سے پوچھا۔

''یہ امجد کون ہے جو پہلے ہی دن سے غیر حاضر ہے؟''

یہ سنتے ہی ہمارے محلے کے چند ''غداروں'' نے مخبری کر دی کہ ''ماسٹر جی! وہ تو روزانہ ہی سکول آتا ہے پھر پتہ نہیں کہاں بیٹھ جاتا ہے۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد ماسٹر صاحب نے ہمارے محلے کا ایک گروپ تیار کیا اور اسے یہ مشن سونپا کہ جہاں بھی ملزم نظر آئے' اسے پکڑ کر لے آؤ۔ سارے غدار سکول میں گشت کرنے لگے۔ آخر کار انہوں نے ہم کو ڈھونڈ نکالا اور ناکہ بندی کر کے گرفتار کر لیا اور منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم چیخ چیخ کر دہائی دے رہے تھے لیکن یورپی برادری نے اس پسماندہ ملک کی فریاد پر بالکل کان نہیں دھرا اور ہم کو ماسٹر صاحب کے سامنے پٹخ دیا۔ ہم مزید شدت سے دل لگا کر رونے لگے۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ماسٹر صاحب نے بڑے پیار سے ہمیں پکارا اور چپ ہونے کو کہا۔ ہماری ''TUNE'' کچھ گم ہو گئی لیکن رونے کی قسط جاری رہی۔ ماسٹر صاحب نے بڑی کوشش کی اور بہترا سمجھایا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر کار تنگ آ کر انہوں نے اپنی جون بدلی اور سلطان راہی کے انداز میں کڑک کر چپ ہونے کو کہا۔ فوراً ہماری سانس ہی بند ہو گئی۔ ہمارے چپ ہوتے ہی کلاس اور ماسٹر صاحب دونوں نے سکون کا سانس لیا۔ اور ہم کو ایک طرف بٹھا دیا۔ ہماری گلی کے چند لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ ہم کو روزانہ اپنے ساتھ سکول لایا کریں لیکن دو تین دن بعد ہی ہم کو کلاس پسند آ گئی اور ہم خود ہی خوشی خوشی سکول آنے لگے۔ بعد میں یہ حال ہوا کہ ہم کلاس کے مانیٹر مقرر کیے گئے۔ ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا (ادھر ادھر دربدر پھرتی رہی)۔ محلے والوں نے والدہ کو مبارک باد دی اور ساتھ ہی آٹا چینی ادھار مانگ لئے' والدہ صاحبہ بھی انکار نہ کر سکیں۔

ماسٹر صاحب کا ایک لڑکا تھا جو چہارم میں پڑھتا تھا۔ چونکہ وہ ماسٹر صاحب کا سپوت تھا۔ اس لئے ہر لڑکا اس کا خصوصی احترام کرتا تھا۔ موصوف کا صرف یہ شوق تھا کہ نئے نئے کام کیے جائیں مثلاً بکرے پر سواری کرنا' چمگادڑ پالنا۔ ان کاموں کی وجہ سے اکثر اس کی ٹھکائی ہوا کرتی۔ انہیں دنوں سکول کے ساتھ والے تالاب میں بہت زیادہ مچھلیاں آ گئیں اور بہت سے لڑکے سکول سے بھاگ کر کانٹے اور ڈوری کی مدد سے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیتے۔ ایک دن دو آدمی جال لے آئے اور تالاب سے بے شمار مچھلیاں پکڑ لیں۔ یہ منظر دیکھ کر ماسٹر صاحب کے لڑکے کی آنکھیں کھل گئیں۔ فوراً گھر بھاگے۔ اپنی اماں کا دوپٹہ اٹھایا۔ ایک ہمسائے لڑکے کو ساتھ لیا اور تالاب پر پہنچ کر سانس لیا۔ یہ شکاری منظر دیکھنے کے لئے ہماری کلاس ساری کی ساری وہیں جمع ہو گئی۔ موصوف نے اپنے اتنے زیادہ حمایتی دیکھے تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ فوراً ہی کھڑے کھڑے قومی اسمبلی کے امیدوار کی طرح ایک تقریر کی۔ نظم و ضبط قائم کرنے کا مشورہ دیا اور آخر میں ہر لڑکے کو دو دو مچھلیاں دینے کا وعدہ کیا۔ ہم کو مانیٹر ہونے کے ناتے تین مچھلیاں دینے کا اعلان کیا۔ تقریر ختم ہوئی اور اس کے ساتھ ہی پرشور نعروں اور تالیوں میں دونوں ''شکاری'' تالاب میں داخل ہو گئے۔ درمیان میں پہنچ کر انہوں نے دوپٹے کو جال کی طرح پکڑا اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا کچھ دور تک چلنے کے بعد انہوں نے دوپٹے کو چاروں کونوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ پانی کا بوجھ نہ سہارتے ہوئے چر رکی آواز کے ساتھ درمیان سے پھٹ گیا۔ ساری محنت دوبارہ پانی میں چلی گئی۔ دونوں شکاریوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے جب کہ تماشائیوں کے منہ سے ایک لمبی سی ''اوہ'' نکل گئی۔ سارے ماحول پر اچانک ہی اداسی چھا گئی۔ قریب ہی تھا کہ غم کے بادل مزید گہرے ہوتے کہ کھلبلی سی مچ گئی۔ شور بڑھ گیا۔ ساری عوام تتر بتر ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب آ گئے ہیں۔ ان

وکسی نے اطلاع دے دی تھی کہ آپ کا فرزندار جمند نئے دوپٹے کے
ساتھ جم کاربٹ کے ریکارڈ توڑنے والا ہی ہے۔ یہ سنتے ہی ماسٹر
صاحب بھاگے بھاگے تالاب پر پہنچ گئے۔ جہاں یہ دل خراش واقعہ
رونما ہو چکا تھا۔ ماسٹر صاحب کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ دونوں شکاری
ابھی تک تالاب میں تھے اور غور و فکر میں مصروف تھے کہ یہ کیا ہو گیا اور
کیسے ہو گیا۔ جونہی دونوں تالاب سے باہر نکلے' ماسٹر صاحب نے
دونوں کو دبوچ لیا اور زور و شور سے ٹھکائی شروع کر دی۔ دونوں نے بڑی
کوشش کی کہ جان بچ جائے لیکن ماسٹر صاحب نے بھی ان کی ایک نہ سُنی
مکوں' لاتوں اور تھپڑوں کے مکسچر کے ساتھ تیکوانڈو کا شاندار مظاہرہ
کیا۔ اگر چند ریفری وہاں موجود ہوتے تو امید تھی کہ ماسٹر صاحب کو
بلیک بیلٹ تھری ڈان کا اعزاز مل ہی جاتا لیکن اس عظیم کھیل کے بے
مثال مظاہرے سے کچھ حاصل نہ ہوا' دوپٹہ تو پھٹ چکا تھا۔

آخر کار وہ دن بھی آیا جب ہم نے دوسری جماعت پاس کر لی اور
تیسری جماعت میں پہنچ گئے۔ نئے روحانی ڈیڈی منیر صاحب
تھے۔ انتہائی شفیق' رحمدل اور قابل استاد تھے۔ بڑی توجہ اور محنت سے
پڑھاتے تھے۔ بڑے سے بڑا ڈھیٹ اور بے شرم بھی کوشش کرتا تھا کہ
منیر صاحب کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ کبھی کبھی ہم سب سوچتے
تھے کہ منیر صاحب تو ماسٹر ہو ہی نہیں سکتے' شاید غلطی سے بن گئے
ہیں۔ ان کی کلاس میں بڑی زور شور سے پڑھائی ہوتی۔ ان دنوں
ہمارے سکول کی آٹھویں کلاس بیت بازی کے لئے مشہور تھی۔ ششم اور
ہفتم والوں کے ساتھ ان کے کافی مقابلے ہوئے لیکن مڈل والوں نے
کسی کی ایک نہ چلنے دی۔ یہ دیکھ کر منیر صاحب نے اپنی کلاس کو روزانہ
بیت بازی کی ٹریننگ دینا شروع کر دی۔ ہر لڑکے کا فرض تھا کہ اس کو کم
از کم آٹھ شعر ضرور آنے چاہئیں۔ جب کافی مشق ہو گئی تو ہمارا مقابلہ
کلاس چہارم سے ہوا۔ ہم سب نے بڑی آسانی کے ساتھ مات دے
دی۔ ہمارے حوصلے سکول کی چھت جتنے بلند ہو گئے۔

کچھ دن ہی بعد ہمارا ٹکراؤ چھٹی جماعت سے ہو گیا۔ ہم سب نے
ان کی خوب درگت بنائی۔ ان کے روحانی ڈیڈی یہ دیکھ کر بڑے چراغ پا
ہوئے اور جرمانہ کے طور پر ساری کلاس کو ہمارے سامنے ہی کان پکڑا
دیئے۔ منیر صاحب ہم سب کی کارکردگی سے بڑے خوش تھے۔ انہوں
نے اعلان کیا کہ آئندہ بزم ادب میں سارے سکول کے سامنے ہمارا
مقابلہ سنئیر ترین کلاس سے ہو گا اس لئے ساری کلاس سے تین لڑکے منتخب
کئے جائیں گے جو کلاس کی نمائندگی کریں گے۔ یہ سن کر ہم اور زیادہ خوش
ہوئے۔ اگلے دن اسی سلسلے میں الیکشن ہوئے اور تین لڑکے چنے گئے جن

میں ہمارا نام بھی شامل تھا۔ ہم پر تو جنون سا سوار ہو گیا۔ اسی وقت سے
مقابلے کے لئے خصوصی تیاری شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب روزانہ ہماری
کارکردگی چیک کرتے۔ آخر کار مقابلے کا دن آ گیا۔ بڑے گراؤنڈ میں
سارا سکول جمع تھا۔ بیت بازی کے لئے اعلان کیا گیا اور ہماری کلاس
کے لڑکوں کو پکارا گیا۔ ہم بڑی عجیب کیفیت میں تقریباً ڈگمگاتے ہوئے
ڈائس پر پہنچے جب کہ دشمن کلاس کے لوفر اکڑتے ہوئے آ کر کھڑے
ہوئے۔ منیر صاحب دور دور سے ہی ہمیں بار بار دلاسہ دیتے رہے۔
دشمنوں نے بڑی نخوت سے گھورا اور بڑے کروفر سے ایک شعر سے آغاز
کیا۔ ہمارے ساتھی نے لرزتے ہوئے شعر سے جواب دیا۔ اس کے بعد
لڑائی شروع ہو گئی۔ انہوں نے مشہور مشہور شعروں سے ہم پر پتھراؤ کیا'
ہم نے بھی نوکدار اینٹوں سے جواب دیا۔ ہماری جھجک دور ہو چکی تھی۔
مقابلہ سخت دیکھ کر جونیئر کلاسوں نے زور و شور کے ساتھ ہمارے حق میں
نعرے بازی کی۔ دشمنوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ انہوں نے کبھی سوچا
بھی نہ تھا کہ اتنی چھوٹی کلاس بھی ان کو مشکل میں ڈال سکتی ہے لیکن اس
میں ہمارا کوئی کمال نہیں تھا یہ صرف ہمارے استاد کی محنت تھی یہ قابلیت
صرف استاد ہی میں ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو کس ڈھب پر لے
جاتا ہے۔۔۔ خیر مقابلہ طویل ہوتا گیا اور ان کا سٹاک بہت تھوڑا رہ گیا
جب کہ ہمارے پاس رٹا ہوا گولہ بارود کافی مقدار میں تھا کہ اچانک
مقابلے کا وقت ختم ہو گیا اور ٹیسٹ میچ ڈرا ہو گیا لیکن پھر بھی ہماری ٹیم کی
خوب پذیرائی ہوئی اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے حوصلہ افزائی کی خاطر
ٹافیاں تقسیم کیں۔ منیر صاحب کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور خوشی ان
سے چھپائے نہ چھپتی تھی۔ ہر استاد نے انہیں مبارک باد دی۔ اس دن
کے بعد ہماری تو ''ٹور'' ہی بدل گئی (عجیب سی ہو گئی) اس کے بعد مڈل
کلاس والوں نے ہم سے دوبارہ مقابلہ کرنے کا پنگا ہی نہیں لیا۔ جب کہ
باقی کلاسوں کو ہم نے بڑی آسانی سے ہرا دیا۔ دن گزرتے گئے اور
دیکھتے دیکھتے امتحان ہو گئے اور ہم نے ساری کلاس میں سے پہلی پوزیشن
حاصل کر لی۔

اگر ساتھ دینے والے اچھے ہوں تو دنوں کیا سالوں کا پتہ نہیں چلتا
اور ہر کوئی حیران ہو کر یہی کہتا ہے۔ ''ارے اتنا عرصہ گزر گیا اور ہمیں پتہ
ہی نہیں چلا؟'' جب کہ برے دن ہوں تو ایک دن گزارنا بھی بڑا مشکل
ہوتا ہے مثلاً کسی کو جلتے ہوئے چولہے پر بٹھا دیا جائے اور چند لمحوں بعد
اسے اٹھا کر پوچھا جائے کہ کیسا رہا تو اس غریب کا ایک ہی جواب ہو گا
کہ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی
ہوا۔ منیر صاحب کا دور خواب و خیال ہوا اور جماعت چہارم کے سنگدل

ماسٹر صاحب کا زمانہ آگیا۔ ان کا ایک ہی شوق تھا' ڈنڈے کا استعمال۔ ان کو شعر وشاعری سے سخت چڑ تھی جب کہ علم ریاضی کو بڑا پسند کرتے تھے۔ ہم سب کی قابلیت ان کے سامنے دھری کی دھری رہ گئی اور ہم سب کا ایک ہی کام رہ گیا وہ تھا مار کھانا۔ سب لڑکوں نے بڑی کوشش کی کہ یا تو سزا میں کمی ہو جائے یا چوٹ کم لگے۔ بعض لڑکے سزا پاتے وقت ایسی آوازیں نکالتے جیسے بکرا حلال ہو رہا ہو لیکن ایک مرتبہ ہمارے ایک ساتھی موجد نے ایک نئی راہ ایجاد کی مگر پکڑی گئی۔ ہوا یوں کہ حسب معمول ہم سب ریاضی کے موجد کو صلواتیں (دل ہی دل میں) سنا رہے تھے کہ ماسٹر صاحب نے سبق نہ سنانے پر ایک لڑکے کو مرغا بنا دیا اور ڈنڈے مارنے شروع کر دیے۔ ڈنڈے مارنے سے ایک عجیب سی ٹھپ ٹھپ کی آواز آئی۔ ماسٹر صاحب بھی چونکے اور تحقیق کی غرض سے ملزم کا پاجامہ اتارنے کا حکم دیا۔ پاجامہ اترنے کے بعد اندر سے چمڑے کا ''بوکا'' برآمد ہوا جس کی مدد سے کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے۔ یہ بوکا اس لئے رکھا گیا تاکہ ظلم وسزا کے سخت موسم کا نازک جلد پر کوئی اثر نہ پڑے۔ ماسٹر صاحب ''برآمدگی'' کا سامان دیکھ کر حیرت سے سن ہو گئے جب کہ ہم دل ہی دل میں افسوس کرنے لگے کہ آخر یہ لاجواب ترکیب ہمارے ذہن میں کیوں نہ آئی۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ ماسٹر صاحب سنبھلے' ملزم اور آلہ واردات کو قبضہ میں کیا اور سارے قصے کو باری باری ہر کلاس میں جا کر سنایا اور ملزم کی بار بار پٹائی کی۔ آخر میں اس کو مالی نقصان پہنچانے کی غرض سے ماسٹر صاحب نے ''بوکا'' اپنے گھر بھجوا دیا۔ خیر یہ بات آئی گئی ہو گئی موسم بدلتے رہے صدیاں گزر گئیں اور آخر کار قدرت کو ہم پر رحم آیا اور ہم پاس ہو کر پانچویں میں پہنچ گئے۔ نئے اُستاد کا اسم گرامی ''مشتاق'' تھا۔ مارتے کم' پڑھواتے تھوڑا اور لکھواتے زیادہ تھے لیکن بڑے ذہین اور شریر تھے۔ انہیں دنوں چند تخریب کار سکول کو بار بار نقصان پہنچا رہے تھے۔ یہ تخریب کار دراصل سکول کے سابقہ طالب علم تھے جو سکول سے بھاگ گئے تھے اور عمر کے ساتھ ساتھ آوارہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا بس یہی کام تھا کہ سکول سے انتقام لیا جائے۔ اس لئے جب سکول خالی ہوتا اور چھٹی ہوئے کافی دیر ہو چکی ہوتی۔ یہ کمانڈو چھاپہ مارتے پودوں کو نقصان پہنچاتے' لمبی سی چھڑی کی مدد سے کھڑکی کے راستے کلاسوں کے چارٹ پھاڑ دیتے اور خوب غل غپاڑہ مچاتے۔ ایک دن انہوں نے سٹور روم کی کھڑکی تک رسائی حاصل کر لی اور قریب ترین دراز سے جو کچھ ملا اڑا کر لے گئے۔ یہ دیکھ کر مشتاق صاحب بڑے ناراض ہوئے لیکن فوراً ہی خاموش ہو کر سوچنے لگے۔ اگلے دن بہت سے لڑکوں نے دیکھا کہ مشتاق صاحب مٹھائی کا ڈبہ لے کر آ رہے ہیں۔ مٹھائی کا ڈبہ سٹور میں رکھ دیا گیا۔ سکول میں چھٹی ہوئی اور کمانڈوز کو کسی نے اطلاع دے دی کہ سٹور میں مٹھائی کا ڈبہ پڑا ہوا ہے۔ سہ پہر ہوتے ہی کنگ کمانڈو اور باقی چیلے بھی سکول میں آن پہنچے۔ اتفاق سے ہم بھی گلی ڈنڈا کھیلنے کی غرض سے قریب موجود تھے اس لئے یہ ساری کارروائی ہمارے سامنے ہوئی۔ سبھی کمانڈوز تیز تیز چلتے ہوئے سٹور روم کی کھڑکی کے نیچے آ کھڑے ہوئے۔ لیڈر صاحب ایک کمزور سے ساتھی کے کندھوں پر سوار ہوئے اور کھڑکی تک پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے انہیں دراز بھی بغیر لاک کے نظر آیا۔ لیڈر نے کوشش کر کے دراز کھول لیا اور منزل مقصود صاف نظر آنے لگی۔ لیڈر صاحب نے بڑی مشکل سے ڈبے میں ہاتھ ڈال کر مٹھائی نکالی۔ جب ہاتھ کھڑکی سے باہر آیا تو یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ ہاتھ میں مٹھائی کی بجائے کسی اعلیٰ نسل کی بھینس کا خوشبودار سا گوبر ہے۔ لیڈر صاحب نے دل ہلا دینے والی چیخ ماری اور زور سے اپنا ہاتھ جھٹک دیا جس کی وجہ سے آدھا گوبر ان کی قمیض پر اور آدھا گوبر مٹھائی کے ان طلب گاروں کے منہ پر پڑا جو اوپر ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سبھی بری طرح بدکے۔ نیچے والے لڑکے نے لیڈر صاحب کو بری طرح نیچے پٹخ دیا۔ سبھی نے گوبر صاف کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور ویسے بھی گوبر کی مہین سی خوشبو ان کے دماغ ہلا رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟ ہم اور ہمارے ساتھی ان پر خوب ہنسے لیکن اس وقت تو ہماری ہنسی ہی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی جب ہم نے دیکھا کہ لیڈر صاحب اپنی قمیض اور باقی سب تالاب کے پاک صاف پانی سے اپنا منہ دھو رہے تھے جب کہ قریب ہی کافی تعداد میں بھینسیں پانی میں ہالی ڈے منا رہی تھیں۔ اگلے دن یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ کمانڈوز نے اپنی تخریب کاری کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

پرائمری کر لینے کے بعد ہم نے ہائی سکول میں داخلہ لے لیا۔ ویسے بھی ہائی سکول کی شان ہی نرالی تھی لیکن جب ہائی سکول کے ڈیڈیوں نے اپنا اصل روپ دکھانا شروع کیا ہی تھا کہ ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور پاؤں کے گینڈے بھاگ گئے۔ یہاں بڑی سختی کے ساتھ ڈسپلن اور ہوم ورک کروایا جاتا تھا۔ جب ہم چھٹی جماعت میں داخل ہوئے تو انکشاف ہوا کہ اب ایک استاد کی بجائے ہر پریڈ الگ الگ اساتذہ لیا کریں گے چنانچہ مار بھی مختلف سٹائل کی ملا کرے گی اور یہی ہوا۔ سبھی اساتذہ نے جی بھر کر دھنائی کرنا شروع کر دی' غریب عوام الاماں پکار اٹھی۔ بڑے سے بڑا الو فر بھی پوری کوشش کرتا تھا کہ ہر سبق یاد ہو اور ہوم ورک بھی پورا کیا ہو جب کہ اساتذہ ہر کام میں سے کیڑا نکال

ہی لیتے تھے۔ان کے بارے میں ہم سب کی متفقہ رائے تھی کہ یہ سب استاد تاتاریوں کے لشکر سے بچھڑے ہوئے ہیں اور ان کا ایک ہی ارادہ ہے وہ ہے بے گناہ مسلمانوں پر ظلم وستم۔چنانچہ ہر استاد کا ایک انوکھا نام بھی رکھا گیا۔کچھ لڑکوں کا یہ وطیرہ تھا کہ وہ پٹائی سے بچنے کے لئے ایک خفیہ عمل کیا کرتے تھے اور اکثر اوقات وہ واقعی بچ جاتے تھے۔قصہ کچھ یوں تھا کہ یہ لڑکے ایک سنسان سی جگہ پہ صبح صبح چلے جاتے وہاں پر ایک دو جیسے پتھر ڈھونڈتے۔ایک پتھر کو نیچے اور دوسرے پتھر کو اوپر کھڑا کر دیتے۔اگر اوپر والا پتھر نیچے والے پتھر پر دوسری مرتبہ بھی نہ کھڑا ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آج مار ضرور پڑے گی اور اگر پتھر صحیح طور پر کھڑے ہو جائیں تو اس کا مطلب تھا کہ آج پٹائی نہیں ہوگی۔اگر ایک آدھ تھپڑ یا ڈنڈا پڑ جاتا تو اس کو پٹائی سمجھا نہیں جاتا تھا۔بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ پتھر بھی درست حالت میں کھڑے ہو جاتے اور پٹائی بھی ہو جاتی چنانچہ فوراً ہی یہ خیال ذہن میں آجاتا کہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے لہٰذا چھٹی کے بعد موقع پر پہنچ کر دیکھا جاتا تو واقعی پتھر نیچے گرا ہوا ملتا۔یہ ٹوٹکا کسی دوسرے لڑکے کو کم ہی بتایا جاتا تھا سوائے خاص دوستوں کے۔۔۔

چھٹی اور ساتویں کلاس میں جو حال ہوا اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ہماری کلاس میں پورے سکول سے چن چن کر ظالم اور سنگدل ٹیچر رکھے گئے تھے جنہیں ایک ہی کام آتا تھا وہ تھا کھال اتارنا۔جونہی ہم طالب علموں کو ایک ایک استاد کا تعارف کرایا گیا۔ہم سب کی جان ہی نکل گئی۔ چہرے پیلے پڑ گئے۔پہلے پریڈ سے آخر تک رسوائی ہی رسوائی تھی (ہم سب کی)۔پھر یوں ہوا کہ کلاسیں شروع ہو گئیں اور ہم سب کی چیخوں نے آسمان میں جگہ جگہ شگاف ڈال دیے۔(آج کل جو یہ زمین کی حفاظتی تہہ اوزون کو خطرہ لاحق ہے، یہ خطرہ شاید ہمارا ہی پیدا کردہ ہے)۔

سب سے پہلے جب ہم سکول پہنچتے۔اسمبلی میں شامل ہوتے اور بعد میں دعائیں پڑھتے ہوئے کلاس میں آجاتے۔پہلا پریڈ ہمارے انچارج ٹیچر ملک عباس صاحب کا ہوتا تھا۔ان کی دہشت پورے علاقے میں تھی اور ان کے مارنے کا سٹائل سب سے نرالا تھا۔عام ماسٹر جب بھی مارتے ایک دفعہ ہی سزا دیتے جب کہ ملک صاحب پہلے مجرم کو مرغا بناتے، ایک زوردار بید رسید کرتے اور صلواتیں سنانی شروع کر دیتے۔جب پہلے ڈنڈے کا اثر ختم ہو جاتا تو دوسرا رسید کر کے دوبارہ بولنا شروع ہو جاتے۔ تھوڑی دیر بعد تیسرے ڈنڈے کی آمد ہوتی اور مجرم کی بولتی جام کر جاتی۔ اس طرح دس ڈنڈوں کی سزا پانچ منٹ میں مکمل ہوتی۔ویسے بھی مرغا بنے بنے نظر کے سامنے جگر کے پاس موت کا فرشتہ بیٹھا چائے پیتا ہوا نظر آجاتا۔سزا ختم ہو جانے کے بعد مجرم کو یہ دنیا جنت معلوم ہونے لگتی۔ملک صاحب خراب لکھائی سے الرجک تھے ان کا حکم تھا کہ ہوم ورک پر کوئی نشان یا سیاہی کا دھبہ بھی نظر آگیا تو وہ سخت سزا دیں گے۔ہر لڑکا بڑی محنت سے ان کا ہوم ورک کیا کرتا۔ملک صاحب کام چیک کرتے۔اطمینان کر لینے کے بعد پورے صفحے پر اپنا جہازی سائز کا دستخط کر دیتے جس میں ان کا پورا نام، تاریخ، ذات اور عہدہ شامل ہوتا تھا۔ چنانچہ دستخط ہو جانے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا کہ نیچے والی تحریر کیا تھی۔

دوسرا پریڈ شروع ہوتا اور دینیات کے استاد تشریف لاتے۔ہمیشہ پتلون پہنا کرتے۔ان کی آواز عجیب سی تھی یوں لگتا تھا کہ بولنے کی بجائے رو رہے ہیں۔بعض اوقات منظر کچھ یوں ہوتا کہ ماسٹر صاحب کسی لڑکے کو سزا دے رہے ہوتے اور ساتھ ساتھ بول رہے ہوتے تو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا کہ دونوں میں سے کس کو سزا مل رہی ہے؟ جناب صاحب کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ الٹے ہاتھوں پر ڈنڈے رسید کیا کرتے۔ سزا پانے والے کی روح تھرا اٹھتی اور آواز گلے میں ہی بند ہو جاتی۔ان کے بعد تیسرا پریڈ مجید صاحب کا تھا جو ریاضی پڑھایا کرتے۔ان کا حلیہ تو اکبر الٰہ آبادی جیسا تھا لیکن عادتیں نادر شاہ سے ملتی تھیں۔ان کے پاس انتہائی پتلی چھڑی ہوتی جہاں بھی جسم کو چھوتی تھی، آگ سی لگا دیتی تھی۔انہوں نے نجا آرٹ کا کورس بھی کیا ہوا تھا کیونکہ جب سزا دے رہے ہوتے تو تابڑ توڑ حملے کیا کرتے۔ہر لڑکا بہت کوشش کرتا کہ کم از کم ایک وار کو تو روک لے لیکن ماسٹر صاحب بھی اس کی ایک نہ چلنے دیتے۔ ہر نشانہ پکا لگاتے۔ان کے جانے کے بعد گوندل صاحب کی باری آتی۔ ان کا نام سن کر ہی لڑکوں کی روح فنا ہو جاتی تھی۔درمیانے سے قد کے تھے۔بائیں آنکھ سے تھوڑا سا "ڈیڑ" مارتے تھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرف دیکھ رہے ہیں۔یہ ہمیں انگلش پڑھاتے تھے۔جب گوندل صاحب کی آوازیں گونج رہی ہوتی تھیں، ہر ایک کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہوتا یا لو کی پوزیشن نظر آرہی ہوتی۔ماسٹر صاحب بلاوجہ سزا دینے کے جنون کی حد تک شوقین تھے۔مثلاً کسی لڑکے کے قریب جا کر کھڑے ہوتے۔اس کی نازک سی جگہ پر زوردار ہٹ لگاتے، کھڑا ہونے کا حکم دیتے اور فرماتے کہ فلاں لفظ کے سپیلنگ سناؤ۔لڑکا ابھی پہلے وار سے بند ہو جانے والی سانس بحال بھی نہ کر پایا ہوتا کہ ماسٹر صاحب گرج کر کہتے کہ لگتا ہے جواب نہیں آتا۔اس کے بعد غریب پر دوبارہ چڑھائی کر دیتے اور اس کو تباہ و برباد کر دینے کے بعد فتوحات جاری رکھنے کی غرض سے آگے روانہ ہو جاتے۔اگر کسی سے یہ کہا جاتا کہ تم نے گوندل صاحب کا چھٹیوں کا کام نہ کیا ہو تو کیا مرجانا پسند کرو گے یا مار کھانا چاہو گے تو جواب صرف یہی ہوتا تھا کہ موت قبول ہے۔خدا خدا کر کے ان کا پریڈ

ختم ہوتا اور سائنس کے ٹیچر آتے۔ بے حد کم گو آدمی تھے لیکن معمولی سی زیر زبر کی غلطی ہونے پر بھی پورے بیس ڈنڈے مارتے تھے نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ آخر میں اردو کے استاد آتے۔ اتفاق سے موصوف گنجے تھے اس لئے ان کی سزا بھی منفرد تھی۔ وہ سزا ہولڈر کو بالوں سے پکڑ کر کبھی دیواروں میں مارتے کبھی بلیک بورڈ پر اور خوب جھٹکے مار کر قدرت سے اپنا انتقام لیا کرتے جب کہ سزا ہولڈر بلبلا اٹھتا۔ بعض لڑکوں نے ان کی سزا سے بچنے کے لئے مستقل طور پر ٹنڈ کرا رکھی تھی۔ ابھی یہ ظلم و ستم ہو رہا تھا اور ہماری دعائیں فریادیں جاری تھیں کہ آخر کار ہماری ایک دعا اوزون کی تہہ پھاڑتی ہوئی آسمان تک جا پہنچی۔ قدرت کو ہم پر رحم آ گیا۔ ابا جی نے سب گھر والوں کو لاہور میں بلوا لیا تو ہم نے شکر ادا کیا اور عازم لاہور ہوئے۔ سب ساتھیوں نے ہماری رہائی پر مبارک باد دی اور رشک کے ساتھ رخصت کیا۔ لاہور پہنچ کر ہم اس کی رنگینیاں اور بتیاں دیکھنے میں کھو گئے۔ دن گزرتے رہے، موسم بدلتے رہے اور زندگی کے گزرے واقعات پر وقت کی گرد دبیز ہوتی گئی۔

کافی عرصے کے بعد ہم نے جہلم جانے کا ارادہ کیا۔ اب ہمارے پاس بی۔ اے کی ڈگری تھی اور شخصیت میں بھی ایک استحکام پیدا ہو چکا تھا۔ جہلم میں پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک جشن کا سا سماں رہا۔ ایک دن ہماری چچی صاحبہ نے اپنے چھوٹے بیٹے کو ہمارے حوالے کیا کہ اس کو مڈل سکول میں داخل کروانا ہے۔ ہم نے ریحان کی انگلی پکڑی اور سکول کو روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم کو اپنا بچپن یاد آیا جب ہم ابا جی کی انگلی پکڑے پہلے مرتبہ سکول میں آئے تھے۔ ہم تقریباً تیرہ برس کے بعد سکول میں دوبارہ داخل ہو رہے تھے۔ پرائمری کر لینے کے بعد کبھی اس طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا اس لئے آج سکول میں داخل ہوتے ہوئے بھی دل کی عجیب سی کیفیت تھی۔ ہم نے سوچا کہ پہلے ریحان کو اس کی کلاس میں بٹھا دیتے ہیں پھر دفتری کارروائی کروائیں گے۔ چنانچہ کلاس اول کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم بوکھلا سے گئے۔ ہماری پہلی کلاس کے ماسٹر خلیل صاحب اب بھی اسی کلاس میں براجمان تھے اور ''فتوحات'' کرنے میں مشغول تھے۔ ذرا بھی نہیں بدلے تھے، بالکل ویسے کے ویسے تھے۔ وہی رعب وہی آواز اور وہی کلاس۔ پھر ہم آگے بڑھے اور ادب سے سلام کیا اور آنے کا مدعا بیان کیا۔ ماسٹر صاحب نے ریحان کو کلاس میں بٹھا لیا اور اس کا بستہ چیک کیا۔ سلیٹ اور قاعدہ تھوڑے سے استعمال شدہ تھے کیونکہ کچھ دن وہ گھر پر بھی والدہ سے پڑھتا رہا تھا لیکن ماسٹر صاحب چراغ پا ہو گئے اور سلیٹ کو توڑ مروڑ کر دور پھینک دیا جب کہ کتاب کے پرزے پرزے کر دیے اور حکم دیا کہ نئی چیزیں لا کر دو۔ ہم نے دوڑ کر حکم کی تعمیل کی اور دفتر کی جانب بھاگ پڑے۔ اچانک ہماری نظر ایک شفیق سی ہستی پر پڑی جو ہماری تیسری کلاس کے ٹیچر منیر صاحب تھے اور ہمارے دل میں ان کا احترام آج بھی اسی طرح موجود تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اچھے استاد کی وقعت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہم آگے بڑھے اور نہایت ادب کے ساتھ انہیں سلام کیا۔ منیر صاحب نے بغور دیکھا اور سلام کا جواب دے کر بولے۔

''شاید تم میرے شاگرد رہ چکے ہو اسی لئے اس طرح سلام کر رہے ہو۔''

ہم نے اثبات میں سر ہلایا۔ منیر صاحب نے ایک عجیب سوال کیا۔

''تمہارے ہم جماعت دوستوں کے نام کیا تھے؟''

ہم بولے۔ ''جناب میرے دوستوں میں شاہد رضا، ارشد بھٹی، اشتیاق احمد اور ارشد محمود کے نام شامل تھے۔''

''پھر تو تمہارا نام امجد ہونا چاہیے۔''

ماسٹر صاحب نے انکشاف کیا۔ ہم تو حیرت سے سن ہو گئے پھر ہکلا کر بولے۔

''سر آپ کو میرا نام یاد ہے؟''

ماسٹر صاحب مسکرا دیے اور بولے۔ ''اچھے شاگرد ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور تم تو میری کلاس میں اول آئے تھے۔''

ہم ایک عجیب سی کیفیت میں بولے ''سر اتنے سالوں کے بعد بھی آپ نے مجھے یاد رکھا، میں اس قابل تو تھا نہیں۔''

ماسٹر صاحب مسکرا دیے اور ہمیں اپنے ساتھ دفتر لے گئے۔ وہیں معلوم ہوا کہ اب وہ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر بن چکے ہیں اور سکول کا زیادہ تر چارج انہیں کے پاس ہوتا ہے۔ منیر صاحب نے اپنے سٹاف کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ داخلے کا کام منٹوں میں کروا دیا اور اتنی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آئے کہ ہم شرمندہ سے ہوئے جا رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد ہم نے نہایت ادب کے ساتھ اجازت چاہی اور منیر صاحب کی دعاؤں کے زیر سایہ واپس روانہ ہوئے۔ ایک انجانی سی خوشی ہم پر سوار تھی۔ ہم نے اچانک دعا مانگی۔

''کاش، سارے روحانی ڈیڈی ان جیسے ہی بن جائیں۔''

ہم چلتے جا رہے تھے اور کائنات کی خوبصورتی گنگناتی ہوئی ہمارے ساتھ چل رہی تھی۔

☆☆

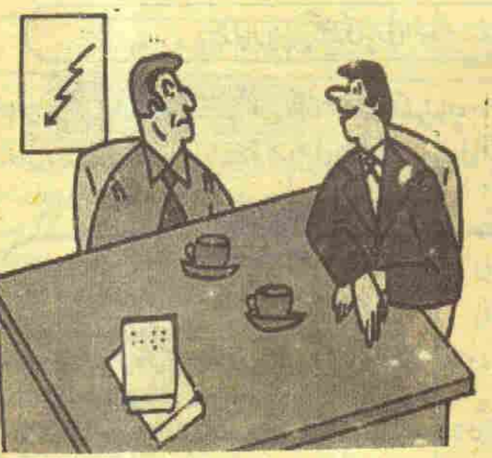

اصلاح دفاتر

☆ ڈاکٹر مشتاق احمد سحر

یوں تو مختلف حکومتیں ملازمین کی بہتری اور دفاتر کی اصلاح کے لئے مختلف جھوٹے سچے اقدامات کرتی رہتی ہیں لیکن ان تمام تر کوششوں کے باوجود دفاتر کی حالت جوں کی توں ہے۔ ملازمین پر بیجا پابندیوں اور سختیوں (غیر جسمانی و غیر انسانی) کی وجہ سے کارکردگی بڑھنے کی بجائے کم ہو کر رہ گئی ہے۔ عوام الناس کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ زچ کرنے کی خاطر معمولی سے معمولی کام کے لئے پیچیدہ سے پیچیدہ طریقہ کار وضع کیا گیا ہے جبکہ اس تمام تر پیچیدگی کا سہرا ملازمین کے سر باندھ دیا جاتا ہے تاکہ عوام اور ملازم حضرات آپس میں دست و گریبان رہیں اور حکومت کو بالکل معصوم سمجھا جائے--- ان تمام مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے خلق خدا کی بہتری کے لئے اور خاص کر ملازمین کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ اقدامات تجویز کئے ہیں۔ اگر ہماری پیش کردہ تجاویز پر عمل کیا جائے تو دفاتر کی کارکردگی میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو جائے اس لئے حکومت کو چاہئے کہ ان اقدامات کو فوری طور پر آرڈیننس کی صورت میں نافذ کر کے بیچارے ملازمین کے مسائل کو حل کرے جس کا حتمی فائدہ عوام' یعنی ووٹروں ہی کو پہنچے گا۔

ان اہم اقدامات میں سے سرفہرست دھوتی' چارپائی اور حقے کو دفاتر میں رائج کرنا ہے اور ہم ان تینوں اصلاحات کو سرکاری سرپرستی عوام کے تمام مسائل بھی حل ہو گئے۔ ذیل میں ان اصلاحات کو نافذ کرنے کی وجوہات اور فوائد کا تفصیلی جائزہ عوام کے لئے مشتہر کیا جا رہا ہے مزید براں ملازمت میں کشش اور نکھار پیدا کرنے کے لئے سرکاری ملازمین کی طرف سے تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ عوام الناس اس سلسلے میں تکلیف نہ کریں کیونکہ ہماری تمام تر ہمدردیاں ملازمت پیشہ خواتین و حضرات کے ساتھ ہیں اس لئے انہی کی تجاویز کو اولیت دی جائے گی تاہم ایسی کوئی تجویز جس میں فائدہ سراسر ملازم حضرات کا ہو' اس پر غور کیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ تجویز نیک نیتی سے پیش کی گئی ہے۔ نیک نیت ہونے کا سرٹیفکیٹ علیحدہ سے پیش کرنا ہوگا۔

☆ دھوتی:

سب سے پہلے ہم دھوتی کو دفتری لباس قرار دینے کی پرزور حمایت کرتے ہیں کیونکہ اس کے کئی پوشیدہ و غیر پوشیدہ فائدے ہیں۔ پوشیدہ فائدوں کو ہم یوں سرعام تو فاش نہیں کر سکتے جیسے پوشیدہ امراض کے ماہر حکیم پوشیدہ امراض کو بڑے بڑے سائن بورڈ' اشتہاروں' وال چاکنگ اور پوسٹروں میں فاش کرتے رہتے ہیں تاہم اشارتاً اتنا بتا دیں کہ اگر کوئی ملازم سروس کو جاری رکھنا چاہئے یا نہ رکھنا چاہئے تو ہر دو صورتوں میں وہ دھوتی کی مدد سے با آسانی ایک راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ہم نے دھوتی کو سرکاری لباس قرار دینے کی تجویز پیش کی ہے' کہیں اس سے مراد لاچا نہ لے لیا جائے۔ دھوتی اور لاچے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ لاچا باندھ کر خواہ مخواہ بڑکیں مارنے کو دل چاہتا ہے جیسے سلطان راہی وغیرہ وغیرہ جبکہ ایسی کوئی حرکت حکومت افورڈ نہیں کر سکتی۔

اگرچہ پبلک لائف میں دھوتی کے بیشمار فائدے ہیں لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر صرف ان فوائد کا ذکر خیر ہے' جو دھوتی کے سرکاری لباس قرار دیئے جانے کی صورت میں حاصل ہوں گے اور حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ دیہات میں چیدہ چیدہ باہمت پٹواریوں اور سکول ٹیچروں نے محض اپنی دھونس کے بل بوتے پر اسے جزوی طور پر ڈیوٹی ٹائم میں اپنا بھی رکھا ہے۔ یہاں ان کی اس جرات کی داد نہ دینا کم ظرفی ہوگی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ابھی تک کلچر کو کمر سے باندھ رکھا ہے (براہ کرم اس فقرے کو "سینے سے لگا رکھا ہے" کے ردھم میں پڑھا جائے) تاہم ابھی تک دفتر میں اس کا عمل دخل ذرا کم ہے لیکن ہمیں بھرپور اعتماد ہے کہ سرکاری ملازمین کو اگر اسے پہننے کا چسکہ ایک دفعہ پڑ گیا تو پھر کوئی انگریز گورنمنٹ بھی اسے تبدیل نہ کر سکے گی۔

بعض غیر سنجیدہ قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ دھوتی یا تہبند میں آزار بند استعمال کر کے اور دیگر جملہ خرابیاں و خامیاں دور کر کے اسے سرکاری

لباس کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ہمارا موقف جو کہ زیادہ درست دکھائی دیتا ہے کہ اگر ایسا کیا جائے تو پھر دھوتی دھوتی نہیں رہے گی' فرنٹ اوپن شلوار بن جائے گی۔ اِسی طرح بعض لوگ ناگہانی شرمندگی سے بچنے کے لئے دھوتی کے کھلے فرنٹ کو سی کر بند کرنے کی تجویز دیتے ہیں تو جناب! ایسا کرنے سے بھی دھوتی نہیں رہے گی' غرارہ بن جائے گی تو صاحبو! ہم اس قسم کے عامیانہ اور مصنوعی اقدامات کے ہر گز حق میں نہیں ہم تو اسے اصل حالت میں رائج کرنا چاہتے ہیں کہ اسی میں ہمارے کلچر کی بقاء ہے۔

دھوتی اور دوسرے لباس میں بنیادی فرق تو یہی ہے کہ دھوتی محض باندھنی پڑتی ہے۔ جبکہ باقی لباس باقاعدہ پہننے پڑتے ہیں اور پہننے کے لئے کئی جانگسل مراحل سے گزرنا بھی پڑتا ہے جو اس تیز رفتار زندگی میں سراسر وقت کا ضیاع ہے۔ آپ نے مندرجہ بالا بحث و تمحیص کے دوران نوٹ کیا ہوگا (اگر آپ خود سرکاری ملازم ہیں تو ان باریکیوں کو نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں) کہ سرکاری ملازمین کا کافی وقت صبح کے وقت تیاری میں صرف ہو جاتا ہے اور یوں ان کے دفتر سے ہمیشہ لیٹ ہو جانے کی وجہ باسانی سمجھ میں آسکتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عوام کے مسائل کے حل میں غیر ارادی تاخیر کی بڑی وجہ اسی قسم کے مشکل پہناوے ہیں۔ ہمارے غیر جانبدارانہ تجزیے کے مطابق ہم دھوتی کے علاوہ تمام لباسوں کو پیچیدہ قرار دے سکتے ہیں کہ کافی تراش خراش کے بعد پہنے جانے کے قابل بنتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان لباسوں پر محض جھوٹی انا اور دنیاداری کی خاطر تنخواہ کا ایک کثیر حصہ خرچ کر کے درزیوں سے سلوائے جاتے ہیں اور ٹیلرز کے پاس پھیرے علیحدہ لگانے پڑتے ہیں یوں قیمتی وقت کے ساتھ ساتھ دولت کا ضیاع بھی ہے جسے آج کل کی ہوشربا مہنگائی کے دور میں غریب ملازم برداشت نہیں کر سکتا اور وہ ''اوپر'' سے مدد کا طلبگار رہتا ہے۔ اسی طرح ٹراؤزرز کا فیشن اکثر بدلتا رہتا ہے کبھی بیل باٹم' کبھی تنگ' کبھی غرارے کی طرح کھلی' کبھی دھاری دار' کبھی چیک اور کبھی پلین کلرز۔ اب بھلا غریب ملازم کہاں تک فیشن کا ساتھ دے۔ اس کے برعکس دھوتی جیسی تھے ویسی ہی اب بھی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی۔ اس کا فیشن ایسا یونیورسل قسم کا ہے کہ کوئی ذی ہوش انکار کی جرات ہی نہیں کر سکتا۔

یہ کئی خوبیوں کی حامل ہے۔ مثلاً دھوتی سستی اور غریب سے غریب ملازم بھی افورڈ کر سکتا ہے' سائز کے تردد میں بھی پڑنے کی ضرورت نہیں' الٹی سیدھی کا جھگڑا بھی نہیں' ہر دفعہ سائیڈ تبدیل کر کے کئی کئی دن بغیر پریس کیے استعمال کی جاسکتی ہے' چھوٹے موٹے داغ دھبے اور سوراخ اس میں مسلسل بننے والی لہروں میں چھپے رہتے ہیں' نہ سلائی ادھڑنے کا اندیشہ اور نہ بٹن ٹوٹنے کا خوف دامن گیر ہوتا ہے' نیز ہر موسم میں ساتھ

لکی ورڈز

✿ مچھر خاوند کو نہیں کاٹتا کیونکہ اُس کا خون کوئی اور چوس لیتا ہے--- وقار چاند
☆ ہاں' مثلاً کھٹمل' بیوی وغیرہ۔
✿ لڑکیوں کا ویلن ٹائن میسج --- ''اگر محبت ہے تو کم از کم ڈھائی سو والا کارڈ لوڈ کراؤ''--- شاہد اطہر
☆ پھر آپ تین سو والا کارڈ لوڈ کرا دیتے ہیں کہ ٹیکس کی کٹوتی کے بعد 250 ہی بچیں گے؟
✿ موبائل پر خوبصورت آواز میں بات کرنے والیاں اکثر بدصورت ہوتی ہیں--- SBS
☆ آپ کو تو اچھا خاصا تجربہ ہوگا' نا!
✿ خالد صاحب کو بھی ''عصمت کے باورچی خانے'' سے کھانا پڑ ہی گیا--- اُف یہ شادی--- SBS
☆ نہیں' پہلے دن ہی گند بلا کھا کر پیٹ میں وہ مروڑ اُٹھا کہ آج کل کھانا ہوٹل سے ہی آتا ہے۔
✿ لڑکیوں کو ماں باپ کا بہت خیال ہے' ہمیشہ چھوٹے کپڑے لاتی ہیں--- وقار چاند
☆ لیکن شوہروں کا خیال بالکل نہیں' ہمیشہ بڑا چیک مانگتی ہیں۔
✿ کل کی ملاقات بہت یادگار تھی' لڑکی نے گفٹ جو نہیں مانگا تھا--- شام
☆ نہیں نہیں۔ اُس نے مانگا تھا آپ لے جانا بھول گئے تھے
✿ اور یہ مرد جو اخبار کھولتے ہی پہلے ضرورت رشتہ کا اشتہار پڑھتے ہیں--- 3N
☆ اور لڑکیاں پوری اخبار فقط اس لئے پڑھتی ہیں کہ شاید کسی امیر آدمی کی بیوی کی موت کی خبر آتی ہو اور وہ جا کر ٹرائی کریں۔
✿ آہ بے چاری' جو شوہروں کی موجودگی میں بیواؤں جیسی زندگی گزار رہی ہیں--- نایاب رضوی
☆ ہمیں آپ سے دلی ہمدردی ہے' ایسا کریں اپنے شوہر سے ''ورقہ'' لے لیں۔
✿ حقیقت یہ ہے کہ آج مرد اور عورت کے درمیان صرف لباس کا فرق رہ گیا--- نایاب رضوی
☆ لگتا ہے آپ جنرل نالج میں دلچسپی نہیں رکھتیں؟ ابھی مردوں نے بچے پیدا کرنے شروع نہیں کیے اور نہ ہی عورتوں کی مونچھیں نکلی ہیں۔
✿ ایک گونگے فقیر نے اس وقت بولنا شروع کر دیا جب اُسے بھیک نہیں ملی--- عبدالقیوم اُسد
☆ تھوڑا سا مزید صبر کر لیتے آپ' شاید کوئی رحم دل آ ہی جاتا۔
✿ عورت اس وقت شیطان کی چیلی بنتی ہے جب اسے بڑے شیطان سے پالا پڑتا ہے--- نایاب رضوی
☆ بڑے شیطان سے--- یعنی کسی دوسری عورت سے؟
✿ ''میں شادی کرنا چاہتا ہوں''--- اس کو کہتے ہیں آ بیل مجھے مار--- توصیف احمد
☆ پھر ہوتا کچھ یوں ہے کہ بیل تو نہیں مارتا البتہ ایک ''گائے'' یہ کام ضرور سرانجام دیتی ہے۔
✿ مجھے جب کبھی کارٹون دیکھنا ہو تو کسی بھی کا کے کو دیکھ لیتی ہوں--- 3N
☆ لیکن جب بہت سے کارٹون دیکھنا ہوں تو خود کو دیکھ لیا کریں۔

عرفان شہزاد' کوٹلی آزاد کشمیر

دیتی ہے۔ علاوہ ازیں دھوتی میں وسیع ورائٹی مہیا نہ ہونے کی وجہ سی امیر وغریب میں کم سے کم طبقاتی تفریق پیدا ہوگئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لباس کی سادگی خوب فروغ پائے گی یوں غریب ملازمین لباس کے رکھ رکھاؤ کے اخراجات سے بھی بچے رہیں گے اور پھر آہستہ آہستہ ان کی مالی حالت سنوارنا شروع ہو جائے گی جس کا حتمی نتیجہ ان کی بہتر دفتری کارکردگی کی شکل میں سامنے آئے گا۔

دھوتی ہی وہ واحد لباس ہے جس کی ڈب میں سودا سلف بھی باندھ کر لایا جاسکتا ہے۔ یہ تو خیر ایک سراسر پرائیویٹ فائدہ ہے جس سے ہم شاپرز کی پولیوشن سے بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں اور سرعام ہاتھوں میں بوجھ اٹھائے پھرنے سے بھی بچ سکتے ہیں تاہم ملازم کے نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو دفتر سے بلاخوف وخطر کثیر مقدار میں سٹیشنری لانا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ یعنی کسی بھی پہلو سے دھوتی کا تجزیہ کریں' اس کے اپنانے میں بچت ہی بچت ہے اور بچوں کے لئے سٹیشنری کی بچت تو یقینی! ان ہی بیشمار خوبیوں کی بنا پر ہم نے اس ملٹی پرپز ڈریس کو ہمیشہ فوقیت دی ہے۔ اگر جین کی پینٹ قدرت کا ایک لاجواب تحفہ ہے تو مشرق کے لئے دھوتی ایک بے مثل نعمت ہے۔ یقین نہ آئے تو دھوتی باندھنے والوں سے کنفرم کرلیں۔

گرمیوں میں اس کی شاندار کارکردگی سے انکار ممکن ہی نہیں' اس شدید موسم میں پینٹ پہن کر مسلسل چار بجے بعد از دوپہر تک دفتر میں بیٹھنا اور وہ بھی اکثر لوڈشیڈنگ میں' تو ایسے حالات میں اچھا خاصا مضبوط اعصاب کا مالک بھی ہمت ہارتا نظر آتا ہے اور ملازم کا ٹھیک گیارہ بجے کے بعد چڑچڑا اور غصیلا ہو جانا ایک فطری سی بات ہے اور ظاہر ہے یہ غصہ افسران پر نکلنے سے تو رہا صرف غریب سائل ہی اس کا شکار ہوتے ہیں' دھوتی اس اس صورت حال سے بخوبی نمٹ سکتی ہے کہ گرمی میں قدرتی ائیرکنڈیشنز کا کام دیتی ہے اور اس کے پلو سے پنکھے کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ گرمیوں میں اسے گیلا کر کے برائے ٹھنڈک منہ پر بھی رکھا جاسکتا ہے۔ ملازم حضرات بوقت مجبوری دفتر میں دوپہر کا کھانا کھا کر اسے تولئے کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں اور اگر کبھی دفتر میں لمبی تان کر سونے کا موقع ملے تو اسی دھوتی کو چادر کا درجہ دے کر اوڑھا بھی جا سکتا ہے اور جب بھی جاگے گا تو اپنے آپ کو نہایت تازہ دم محسوس کرے گا اور اپنے بچھے کچھے کام کو خواہ وہ کتنے ہی مہینوں سے التواء میں پڑا ہو' نہایت چابکدستی سے جلد از جلد نمٹا دے گا۔ گرمیوں میں دھوتی کے ساتھ بنیان کا ایک بہترین فطری تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موسم میں دھوتی کے ساتھ محض بنیان پہن کر دفتر میں بیٹھنے پر کوئی معترض بھی نہیں ہو

زنامہ ماہنامے میں زنانی کا خط

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! السلام علیکم

جی! کیا حال ہے؟ مَیں اللہ میاں کے فضل سے بالکل ٹھیک ہوں۔ اُمید کرتی ہوں کہ آپ کا حال بھی ٹھیک ہوگا --- باجی! مَیں آپ کے رسالے کی بہت پرانی قاری ہوں' میرے خیال میں اِسے تقریباً پندرہ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ ماشااللہ' سے میری عمر بیس سال ہونے والی ہے۔

اِس مرتبہ سارے ناول بہت اچھے تھے۔ سب سے بڑھ کر فائزہ فیض فیضی جی کا ناول ''تتلیوں کے اودے' نیلے اور دھنک رنگ'' انتہائی انتہائی زبردست تھا۔ مائلہ جیسی چھاپا کٹنی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور شیداں کی شادی فائزہ جی نے ارہان سے کروا دی۔ ہائے' اتنے ڈیشنگ بندے کی شادی کام کرنے والی سے؟ خیر' ہمیں کیا' کون سا ہماری ہوئی ہے --- صائمہ کے منہ پر تیزاب پھینک کر نادر نے بہت اچھا کیا۔ بھلا چہرہ خوبصورت ہو تو بندہ نقاب کیوں کرے' ویسے بھی پردہ تو آنکھوں کا ہوتا ہے۔ ہم پر تو کسی نے تیزاب نہیں پھینکا اور انوش رائے کے ساتھ بہت بُرا ہوا۔ اتنے ہینڈسم بندے کو ہسپتال بھجوا دینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ --- دوسرے نمبر پر امبر مہک علی کا افسانہ ''آ گہی کا درحاصل کچھ بھی نہیں ہوتا'' ہائے' کیا افسانہ تھا۔ جب ہیرو فاراگ بجائی' ملائکہ کے پیچھے چکر لگا لگا کر تھک گیا تب اُسے پتہ چلا کہ ملائکہ شادی شدہ ہے۔ فریحہ امانت کا ناولٹ ''صحراؤں کا بھید تھو ہر کا پیڑ جانے'' حقیقت سے بھرپور تھا۔ میاں سے ایسے ہی کام کروانے چاہئیں۔ اُنہوں نے جو سوٹ ورشاہ کو پہنایا ہے' یعنی ڈارک بلیک کے ساتھ ڈارک پرپل اور ریلو کنٹراسٹ والا ٹراؤزر پہنا تھا' غضب کا تھا۔ مس انیلی کا مزاح سے بھرپور افسانہ ''ماہتاب رُتوں کی دھوپ میں چار چاند'' غضب کا تھا۔ مس انیلی نئی ہیں مگر کرتب پرانے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آگے جا کر ترقی کریں گی۔ اِن کی ہیروئن صوبیہ کے چار کزن تھے۔ غضب کی قسمت تھی صوبیہ کی۔ ایک ہم ہیں کہ کزن تو درجنوں کے حساب سے ہیں مگر کوئی ڈھنگ کا نہیں۔ پتہ نہیں ہمارا سمارٹ' گڈلکنگ' وجیہہ' ڈیشنگ' چھ فٹ کا صحیح چہرہ' روشن پیشانی' گھنگھریالے بال' ستواں ناک'' کھڑی مونچھوں والا' خوابوں کا شہزادہ کہاں ہے؟ --- اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف۔ باجی! مَیں آپ کا رسالہ صرف اِن سلسلوں کی وجہ سے پڑھتی ہوں ورنہ بازار میں تو ''بہن' دوپٹہ' گھریلو' بہو' نیا راور بلقیس ڈائجسٹ ہیں مگر مَیں صرف آپ کا ڈائجسٹ خریدتی ہوں' باقی مانگ تانگ کر پڑھ لیتی ہوں --- آپ کے ڈائجسٹ کا مواد معیاری ہوتا ہے۔ آپ کی ماڈل ذرا افلاطون قسم کی ہوتی ہے اور اِس کے علاوہ آپ مشہور ہیروز اور کرکٹرز کی تصاویر شائع کرتی ہیں۔ اِسی لئے آپ کا ڈائجسٹ نمبر ون ہے --- اچھا' تو بات ہو رہی تھی مستقل سلسلوں کی۔ اِن میں ''آج کیا کھائیں'' میں مجھے ''چکن پاپڑ'' اور ''امرود کا حلوہ'' مزے کے لگے۔ دُعا کریں کہ میری شادی ہو جائے' مَیں اپنے میاں سے بنوا کر کھاؤں گی --- ''پیاری باتیں'' بھی کمال کی تھیں۔ سب سے ''پیاری'' باتیں سُمیت اور سوجل کی تھیں --- باجی ''آپا کی ڈائری'' میں مس کومل گل جو غزل شائع ہوئی ہے' وہ اُس کی اپنی نہیں۔ مَیں اُسے جانتی ہوں۔ پوری حرافہ ہے' کسی کی چوری کر کے بھیج دی ہوگی۔ باجی! مَیں نے ج خاتون کے کالم ''آپ کے مسائل'' میں اپنا مسئلہ بھیجا تھا۔ پلیز' اُسے شائع کر دیں۔ میرا مسئلہ آپ نے شائع نہیں کیا لیکن شہزادی کا کر دیا ہے۔ اگر اس بار آپ نے میرا مسئلہ نہ شائع کیا تو مَیں ماہنامہ ''لڑکی'' پڑھنا شروع کر دوں گی --- باجی! مَیں نے کچھ ٹوٹکے بھی بھیجے تھے جن میں ''ہوٹل کے کھانوں کو گھریلو بنانا' کپڑوں کی خریداری کا طریقہ'' وغیرہ تھے۔ باجی! اِس کے علاوہ مَیں نے ایک ناول ''برفیلی وادیوں میں سوا نیزے کا سورج'' اور ''مہتاب رُتوں کی انوکھی داستانیں'' افسانہ لکھا ہے۔ آپ کو بھیجوں گی پلیز' شائع ضرور کریں۔ باجی! اِس دفعہ خط اِس لئے بہت چھوٹا ہے کہ مجھے کچھ کام ہیں' اِن شااللہ اگلے ماہ تفصیلی خط لکھوں گی۔

والسلام آپ کی پنکی رانی!

وقار چاند

گا۔ یہ سہولت بھلا باقی لباسوں میں کہاں؟--- علاوہ ازیں دھوتی ان ملازمین کے لئے نہایت ہی سودمند ہے۔ جن کے پیٹ بے تحاشا آمدن اور دفتر میں مسلسل سٹنگ کی وجہ سے پھیلتے ہی جا رہے ہیں اور ہر طرح کے علاج یا خود تجویز کردہ ڈائٹنگ کے باوجود کنٹرول میں نہیں آ رہے۔ ایسے حالات میں پینٹ ان کے لئے مزید وبال جان بن جاتی ہے کیونکہ عشرے دوعشرے کے بعد ہر نئی پینٹ تنگ ہو جاتی ہے نیز بار بار نیچے کی طرف کھسکتی ہے اور کسی طور قابو میں نہیں آتی اس لئے بعض اوقات بروقت نہ سنبھالنے کی صورت میں کافی شرمندگی بھی اٹھانا پڑتی ہے۔ ان مشکل حالات میں دھوتی ہی وہ واحد لباس ہے جو بغیر کسی پیچیدگی کے اس مسئلے کو حل کرتی ہے۔

ماہرین نفسیات کے نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو ڈھیلے ڈھالے اور ہوادار لباس خاص طور پر دھوتی وغیرہ طبیعت پر خوشگوار اثر ڈالتے ہیں اور جب سرکاری ملازم خوشگوار موڈ میں ہو گا تو لامحالہ سائلوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آئے گا۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ دھوتی آرڈیننس کے بعد سائلوں کو شکایات پیدا ہی نہیں ہوں گی' اور اگر کبھی کوئی مجبور سائل کوئی معمولی اور فضول سی شکایت کرے گا بھی کہ فلاں کلرک نے میرے کام میں تاخیر کی ہے تو اس کا نہایت سادہ سا جواب ہو گا کہ میں دھوتی سنبھال رہا تھا اور ظاہر ہے کہ بروقت دھوتی نہ سنبھالنے کے خوفناک نتائج کے پیش نظر کوئی افسر یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ دھوتی کو چھوڑ دیتے--- یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ سرکاری اہلکار یا کوئی بھی شخص دھوتی کس کر باندھے یا ڈھیلی' اس کے ہر بار کھل جانے کے مواقع سو فیصد ہیں اس لئے ملازم حضرات سائلوں کے بار بار غصہ دلانے کے باوجود ٹھنڈے مزاج کا مظاہرہ کرتے ہوئے لڑنے سے کترائے گا' یوں سائل خود ہی کام نہ ہو سکنے کی باوجود ملازمین کی خوش اخلاقی کا قائل ہوتا چلا جائے گا۔

مناسب اور ٹھیک ڈائرکشن میں ہوا چل رہی ہو تو اس سے پیراشوٹ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور یوں وہ دفاتر خاص طور پر پرائیویٹ ادارے کہ جہاں گیٹ پر ہمہ وقت چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے اور اس سے نظر بچا کر اہلکار کا نکلنا محال ہوتا ہے تو وہ دھوتی کو پیراشوٹ بنا کر دفتر سے غائب بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں آپ کی سوچ کے عین مطابق یہ طریقہ خود ہمیں بھی ذرا مشکل نظر آتا ہے کیونکہ عین ممکن ہے کہ دفتر کی دیوار کے قریب پہنچ کر ہوا اچانک اپنا رخ بدل دے اور دھوتی پیراشوٹ دوبارہ اسے اس کی سیٹ پر دے پٹکے اس لئے اس سے کہیں آسان یہ ہے کہ اہلکار دھوتی اتار کر اور کندھے پر رکھ کر نہایت شریفانہ طریقے سے گیٹ سے نکلے۔ کسی کی جرات نہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے' روکنا تو بہت دور کی بات ہے۔

☆ چارپائی:

ویسے تو چارپائی ہمارے کلچر کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے لیکن جب تک پوری قوم اسے نہ اپنا لے ہماری تہذیب وثقافت خطرے میں رہے گی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم میں اتنی جرات بھی نہیں کہ اپنے کلچر پر فخر کرتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا احیاء کر سکیں۔ اب چارپائی ہی کو لیں کہ معاشرہ میں اس کی اہم حیثیت کو ابھی تک سرکاری سطح پر تسلیم نہیں کیا گیا اور یہ اب تک دفاتر میں بھی اپنا سکہ قائم کر چکی ہوتی۔ ہمیں قوی یقین ہے کہ اگر چارپائی کو سرکاری وغیرہ سرکاری دفاتر میں لازمی فرنیچر کا درجہ دے دیا جائے تو ملازمین کے اکثر مسائل حل ہوں گے۔

یوں تو چارپائی کو کلی طور پر سمجھنے کے لئے مشتاق یوسفی کے مضامین "چارپائی" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے لیکن ہم آپ کو اس کے لاتعداد سوشل اور دیگر گھریلو قسم کے استعمالات وفوائد (سونے کے علاوہ) میں اُلجھانا نہیں چاہتے ہیں یہاں ہم اس کے فوائد کا احاطہ صرف اور صرف دفاتر میں استعمال تک محدود رکھیں گے اب دیکھئے نا' کہ کثرت استعمال سے چارپائی کا کیا بگڑے گا' زیادہ سے زیادہ ڈھیلی ہو جائے گی جسے کوئی بھی کس سکتا ہے لیکن کرسی کے ساتھ ایسا نہیں ہے اسے مرمت کرنے کے لئے ہر دفعہ کاریگر بھی چاہئے اور رقم بھی یوں نفاذ چارپائی آرڈیننس کے بعد حکومتی لیول پر اخراجات کی خاصی بچت ہو گی کیونکہ کرسی اور چارپائی پر پانچ کلرک بمعہ افسر با آسانی بیٹھ سکتے ہیں گویا پورا دفتر ایک ہی جگہ جمایا جا سکتا ہے۔

یہ ایک ناقابل فراموش اٹل حقیقت ہے کہ دفاتر میں اہلکاروں کو

شان جوتے کی

بش سے بڑھ کر ہے شان جوتے کی	بڑھ گئی آن بان جوتے کی
ہاتھ سے نکلا اور منہ پہ پڑا	دیکھ لو تم اُڑان جوتے کی
ہاتھ سے روک وہ نہیں پایا	اُس نے دیکھی ہے جان جوتے کی
جو نہ اِنساں کے کہنے سے مانا	جانتا تھا زبان جوتے کی
اِس پہ رگڑ' اور اِس کو سیدھا کرو	بش کی خاطر ہے سان جوتے کی
منتظرؔ نام پا گیا جگ میں	ذات تھی مہربان جوتے کی
بش کے چہرے پہ مارنے کے لیے	ہم نے کھولی دوکان جوتے کی

✿ ریاض احمد قادری' فیصل آباد

کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی اونگھنا پڑتا ہے (ذرا تصور میں سرکاری ملازمین کی بے بسی کا اندازہ لگائیں) جس سے نیند پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور جب نیند پر منفی اثرات پڑیں گے تو لامحالہ صحت بھی بگڑے گی اور یوں ان کیا علی صلاحیتیں اور کارکردگی متاثر ہوگی جس کا حتمی نتیجہ عوامی مسائل کے حل میں رکاوٹ کی صورت میں نکلے گا۔ یہاں میں ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ وہ لوگ جو محض ملازمین کے اونگھنے پر معترض ہیں، ان کے لئے دندان شکن جواب یہ ہے کہ اگر ہماری ارکان اسمبلی دوران اجلاس باقاعدہ خراٹے لے کر سو سکتے ہیں تو کیا ملازم حضرات دفتر میں محض اونگھ بھی نہیں سکتے؟

آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کرسی پر پھیل کر بیٹھنے کی خواہش پوری نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ پہلو بدلنے کی سہولت بھی نہیں ہوتی اور ستم ظریفی یہ کہ اگر آپ بے چینی سے بھی پہلو بدلنا چاہیں تو نہیں بدل سکتے جبکہ انگڑائی تو بالکل آدھی ہو کر رہ جاتی ہے اور یوں اہلکار جمائیوں پہ جمائیاں لیتا چلا جاتا ہے اور سائل خود پریشان ہو جاتا ہے کہ ایسی تھکے ہوئے ملازم کو کام کے لئے کہوں یا نہ کہوں اور آخر خاموش رہنے کا دانشمندانہ فیصلہ کرتا ہے کیونکہ جمائیوں کے ساتھ ساتھ ملازم کے تیور بھی بگڑے نظر آتے ہیں ان مناظر کے تو ہم خود گواہ ہیں کہ چارپائی پر نیم دراز ہو کر اونگھتے اونگھتے سرسری طور پر فائلیں دیکھ کر دستخط کرنے کا اپنا ہی ایک سرور ہے جسے صرف وہی محسوس کرسکتا ہے جو ایسے مراحل سے گزرا ہو---اسی طرح بعض اوقات ملازم گھریلو مسائل یا وی سی آر کی وجہ سے رات بھر جاگتا رہتا ہے اور اگلے دن دفتر ہی ایسی جگہ ہے جہاں وہ سکون کے ساتھ نیند پوری کرسکتا ہے۔ ملازم کے لئے ایسی موقع پر دفتری چارپائی کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتی ایسے خوشگوار اور کمفرٹیبل دفتری ماحول میں تھکاوٹ بھی نہیں ہوتی اور یوں ہمہ وقت تازہ دم رہنے کی وجہ سے جو سکون، یکسوئی اور اطمینان حاصل ہوگا وہ اس کے علاوہ ہے جس سے ملازمین کی آؤٹ پٹ بڑھے گی اور عوام کے مسائل نہایت تیز رفتاری سے حل ہوں گے۔

کرسی کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ایک کرسی پر صرف ایک ہی آدمی بیٹھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ نارمل، جسم و جان رکھتا ہو اس کے برعکس ایک ہی چارپائی پر کئی کلرک بلا استثناء جسم و جان بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ یوں سائل کے تمام مسائل بھی ایک ہی جگہ حل ہو سکتے ہیں اور اسے اہلکاروں کو تلاش کرنے کے لئے مختلف کمروں کے چکر پر چکر نہیں لگانے پڑتے۔ اس طریقہ کار کو جدید دفتری اصطلاح میں "ونونڈو اپریشن" کہتے ہیں۔

یاد رہے کہ چارپائی سے مراد بان سے بنی ہوئی چار لمبے پاؤں والی چارپائی ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ کہیں کلرک اور افسر صاحبان اپنی جائز آمدن کا بیجا مصرف کرتے ہوئے دفتر کے لئے فوم والے بیڈ نہ بنوالیں کیونکہ ہم دفتر کو دفتر ہی رکھنا چاہتے ہیں، گھر نہیں بنانا چاہتے ہیں۔ دفتروں میں آزمائشی کامیابی کے بعد اسے تمام دوسرے شعبہ ہائے زندگی کے لئے بھی لازم قرار دیا جاسکتا ہے مثلاً ہوٹل، سکول، ہسپتال، قومی و صوبائی اسمبلیاں، صدر، وزیراعظم، وزراء اعلیٰ اور وزراء صاحبان تاکہ وہ جو ہمارے ہاں ہر وقت کرسی کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں، ان سے نجات ملے۔

☆ حقہ:

چارپائی کے ساتھ حقے کا اضافہ گویا دفتری کردگی کو دوچند کرنے کا جادو ہے۔ حقہ بھی ہمارے کلچر کا حصہ ہے تو اردو کی آخری کتاب (اس کے بعد اردو میں کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن اس کتاب کو اب بھی اردو کی

نمکین غزل

مَیں گدڑی چھین لیتا ہوں، قلندر بیچ دیتا ہوں
عدو سے دوستی رکھتا ہوں، بندر بیچ دیتا ہوں
بہت چالاکیاں سیکھی ہیں کاروبارِ دُنیا سے
بنا کر کھاد کی صورت میں گوبر بیچ دیتا ہوں
گوالے دُودھ میں پانی ملا کر بیچتے دیکھے
مَیں پانی میں ملا کر دُودھ گھر گھر بیچ دیتا ہوں
کوئی انجانا گاہک ہاتھ لگ جائے اگر میرے
دِکھاتا ہوں اِسے شلغم، چقندر بیچ دیتا ہوں
ذخیرہ کیسے ہوتا ہے، منافع کس کو کہتے ہیں
چھپا دیتا ہوں بہتر کو، مَیں کمتر بیچ دیتا ہوں
سفر کے درمیاں میرا کہیں کھو جائے گر تکیہ
اُتر کر پہلی منزل پر مَیں بستر بیچ دیتا ہوں
نشانی تو نے دی مجھ کو کہ تجھ کو یاد مَیں رکھوں
بُرے دِن میں نشانی تیری دلبر بیچ دیتا ہوں
کوئی آباد گھر کردوں، کوئی مجھ کو دُعائیں دے
سوئمبر جیت کر محرم سوئمبر بیچ دیتا ہوں

✿ رفیع یوسفی محرم
5-A 12/4 ناظم آباد کراچی

آخری کتاب ہی لکھا اور سمجھا جاتا ہے، نہ جانے کیوں) میں بھی کہیں نہ کہیں درج ہے کہ باپ حقہ پیتا ہے۔ یعنی ہر وہ شخص جو باپ ہے خواہ ایک ہی بچے کا ہو حقہ پیتا ہے۔ اس سے آپ حقے کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں مگر افسوس کہ انگریز ہمیں حقے کی جگہ سگریٹ جیسی خرافات میں الجھا کر چلتا بنا۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنے کلچر کو نئی زندگی بخشیں ہم تجویز کرتے ہیں کہ حکومت سگریٹ کے نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر پابندی لگائے نیز صدق دل سے حقے کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر پابندی لگائے نیز صدق دل سے حقے کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے دفاتر میں رواج دے اس اقدام سے حقے کی گرتی ہوئی ساکھ بھی بحال ہوگی، قومی و انفرادی سطح پر بچت بھی ہو گی اور ماحول کی آلودگی سے بھی کافی حد تک نجات ملے گی۔

حقہ کلچر سے ہمیں بیشمار دوسرے فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ مثلاً یہ جو ملازم حضرات سگریٹ خریدنے کے بہانے بار بار باہر کی طرف لپکتے ہیں اور خواہ مخواہ اپنی ٹانگوں کو تکلیف دیتے ہیں، اس سے نجات ملے گی۔ چلم بار بار گرم کرنے کی وجہ سے مصروفیات بڑھ جائیں گی اور یوں ملازمین میں محنت کی عادت پڑے گی جو ان میں ابھی تک ناپید ہے--- مزید برآں حکومت کو کم از کم یہ گلہ تو نہیں رہے گا کہ ملازمین سارا سارا دن بیکار بیٹھے رہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ سائلوں کا یہ شکوہ بھی دور ہو جائے گا کہ دفتروں میں اہلکار اکثر غائب ہوتے ہیں۔

حقے سے بھائی چارہ خوب فروغ پاتا ہے کہ اسے سب مل جل کر تیار کرتے ہیں اور پھر تیاری کے بعد نہایت اہتمام اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ مل جل کر پیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ گپ شپ بھی رہتی ہے جو اطمینان قلب، بے فکری، ذہنی آسودگی اور مسرت و انبساط کے لئے ٹانک کا کام دیتی ہے۔ یوں حقہ نوشی اور گپ شپ کے بعد کلرک حضرات نئے سرے سے تازہ دم ہو کر سائلوں سے بہتر طریقے سے نمٹ سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حقے کی گڑگڑاہٹ سے جاگتے رہیں گے۔ عقلمند افسر زور زور سے حقہ گڑگڑایا کریں گے تاکہ ماتحت سمجھ لیں کہ افسر جاگ رہا ہے اور اس سے بھی عقل مند افسر وہ ہوگا جو اپنے ملنے جلنے والوں کو بھی اپنے دفتر میں خوب حقہ پلایا کریں گے تاکہ صاحب کا دبدبہ قائم رہے اور عقل مند ترین افسر وہ ہوگا جو کسی ملازم کو اپنے دفتر میں بٹھا کر حقہ پلوا تا رہے اور خود مزے سے سوتا رہے (اتنے عقل مند افسر ہمارے ہاں پہلے ہی موجود ہیں۔) مالی منفعت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ ایک حقے کو پورا دفتر استعمال کر سکتا ہے ملازمین کو دوہرا فائدہ ہوگا کہ سردیوں میں آگ تاپنے کو ملے گی اور کینٹین سے چائے منگوانے کی بجائے اسی آگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چائے بنائی جا سکے گی اور گرم بھی کی جا سکے گی، یوں ملازمین کا ذاتی بجٹ روز بروز بہتر ہوتا چلا جائے گا اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ملازمین کے گھریلو بجٹ کا بہتر ہونا عوام کے مسائل کا شرطیہ علاج ہے۔

حقہ نوشی سے بعض دوسری دفتری برائیوں سے بھی نجات ملے گی۔ مثلاً آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ فوری اور معمولی ترین رشوت سگریٹ کی شکل ہی میں پیش کی جاتی ہے اور نہایت ڈھٹائی سے وصول بھی کر لی جاتی ہے جبکہ ماچس جھونگے کے طور پر تھمائی جاتی ہے گویا رشوت کا دروازہ سگریٹ سے کھلتا ہے اور پھر کھلتا ہی جاتا ہے۔ اسی طرح کسی اہلکار کے رشوت کے معیار کو جانچنے کے لئے بھی سگریٹ کو بطور DOSE TEST استعمال کیا جاتا ہے اگر تو اہلکار کی پیش کش قبول کر لے تو سمجھئے کہ رشوت کم ہوگی اور اگر یہ کہہ کر واپس کر دے کہ میں گولڈ لیف سے کم نہیں پیتا تو سمجھ لیں کہ جیب کافی ہلکی کرنی پڑے گی۔ حقہ آرڈیننس سے قوم کو اس ناجائز کاروبار (تیسرے شخص کی نظروں میں) سے نجات ملے گی کیونکہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

سگریٹ چھوڑ کر حقہ پینے کی ترغیب دینے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ سے مسلسل یہ پروپیگنڈہ کیا جائے کہ حقہ سگریٹ سے بہتر ہے۔ مثلاً سستا ہے، نشہ و سرور زیادہ ہے، جاذب نظر ہے، متانت اور سنجیدگی کو فروغ دیتا ہے جبکہ سگریٹ محض لاابالی پن اور فیشن کو فروغ دیتی ہے۔ مجموعی طور پر صحت کے لئے کم نقصان دہ ہے، کش کے لئے خوب زور لگانا پڑتا ہے جس سے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ حقہ تازہ کرنے کے لئے دن بھر میں جو کئی دفعہ جسمانی مشقت کرنا پڑتی ہے تو اس وجہ سے صحت برقرار رکھنے کے لئے علیحدہ سے ورزش کی ضرورت نہیں رہتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مل بیٹھنے کی وجہ سے رنجشیں دور کرنے کا ذریعہ بنتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ حقے کے فروغ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سرکاری سرپرستی میں حقہ نوشی کے صحت مند مقابلوں کے لئے مختلف محکموں میں حقہ تنظیمیں تشکیل دی جائیں، مثلاً یاران حقہ، حلقہ فروغ حقہ وغیرہ۔ یہاں پاکستانی سیاست کو مدنظر رکھتے ہوئے مزید گروپ بندی کے لئے چیتا گروپ، وارئیر گروپ، پاگل گروپ اور نوخیز گروپ وغیرہ کے ناموں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ان سرکاری اقدامات سے حقے پر طاری جمود کو توڑا جا سکے گا اور نت نئے حقے ڈیزائنوں کو دیکھتے ہوئے اعلیٰ و ادانی سرکاری و غیر ملازمین اسے بلا جبر و کراہ اپنائیں گے اور بعد ازاں حکمرانوں کی دیکھا دیکھی عوام بھی اسے پذیرائی بخشنے میں فخر محسوس کریں گے۔

☆☆

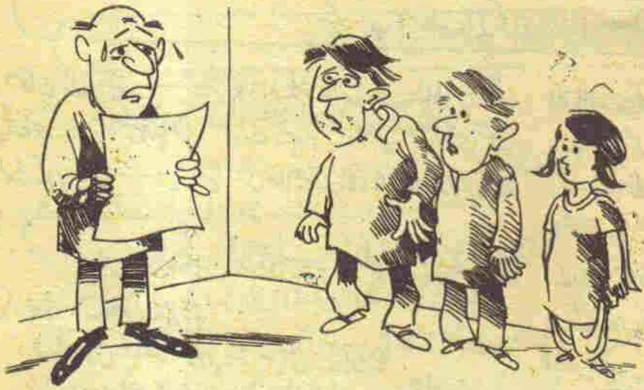

پہلا عنوان

☆ کے۔ایم مجاہد

(حقیقی شعراء سے معذرت کے ساتھ)

بن رشوت، سفارش نوکری مل سکتی نہیں
میر ی چھٹی زندگی اب سل سکتی نہیں

فارغ خان ایم اے شاعر نہیں تھا مگر سینکڑوں دفاتر کی سیڑھیاں گننے اور ناکامی کا اعزاز پانے کے بعد آج اچانک اس کے دل کا درد لفظوں کی شکل اختیار کر گیا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ اب ردیف قافیے کا مذاق اڑا سکتا ہے۔ فارغ خان نے سن رکھا تھا کہ انسان شاعر تب بنتا ہے جب اس کے دل پر چوٹ پڑتی ہے اور آج وہ اس بات کا زندہ ثبوت بن چکا تھا---شاعر بننے کے بعد فارغ نے کچھ دوستوں کے مشورے سے ایک تخلص منتخب کیا اور وہ ''فارغ خان خیالی'' ہو گیا تاکہ باقاعدہ شاعروں کی صف میں داخل ہو سکے۔ پھر بے پناہ فرصت میں سے چند لمحے نکال کر لغت کی مدد سے چند قوافی ڈھونڈے اور اپنی اولین غزل تیار کی---

سفارش کی ٹانگیں توڑ دو
رشوت کے پنچھی چھوڑ دو
میں دن میں خواب دیکھتا ہوں
نوکری نہ دو، آنکھیں میری پھوڑ دو
میرٹ کا یہاں جو نام بھی لے
فوراً سے پہلے اس کی ''گچھی'' مروڑ دو
شیخ جی! کیا کرو گے بچہ پڑھا کر
میری مانو کسی فیکٹری میں چھوڑ دو
تعلیم نے میرا پیٹ پھاڑ دیا
روزگار کا ٹانکہ لگا کر اسے جوڑ دو
یہ کیا اندازِ استقبال ہے
امیدوار آئے تو کتے چھوڑ دو
فارغ نے کر لیا ہے ایم اے کیوں
ذمہ داریاں مار کر اس کا سر پھوڑ دو

اس غزل کی تیاری کے بعد فارغ یوں خوش ہو رہا تھا جیسے اسے سترہ گریڈ کی ملازمت مل گئی ہو۔ اس نے یہ غزل گھر کے علاوہ محلے میں بھی فرداً فرداً نشر کی اور ان سب سے داد حاصل کی جو شاعری کی ابجد سے بھی سلام دعا نہ رکھتے تھے۔ انہی میں سے ایک خیر خواہ نے اسے یہ غزل کسی ادبی رسالے میں بھجوانے کا مشورہ دیا۔ فارغ خان کو جب علم ہوا کہ اس طرح اسے شہرت کے ساتھ ساتھ چار پیسے ملنے کی توقع بھی ہے تو اس نے ڈاک لفافے کی صورت میں اس پراجیکٹ پر بیس روپے کی خطیر سرمایہ کاری بھی کر دی۔ خط پوسٹ کرنے کے بعد جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اسے چند مغموم صورت عورتیں اماں بی کے پاس بیٹھی نظر آئیں، وہ صورت احوال کی جاسوسی کے لئے آگے بڑھا۔

''بہت افسوس ہوا، بہن---!'' ایک عورت کہہ رہی تھی۔ ''ہمیں تو جونہی معلوم ہوا کہ تمہارا جوان جہان بیٹا موا شاعر ہو گیا ہے تو غم سے وہ حالت ہو گئی کہ گھر بیٹھا نہ گیا---ہائے، قسمت پھوٹ گئی تمہاری تو، سر کا سائیں پہلے ہی نہ رہا اور اب یہ زخم---''

''جو خدا کو منظور، بہن---!'' اماں بی نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کی مرضی میں کیا دخل---؟''

فراغ خان وہاں مزید نہ رک سکا اور گھومتے ہوئے سر کے ساتھ کمرے میں لوٹ آیا اور ایک بار پھر اخباری اشتہارات سے آنکھیں لڑانے لگا حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اخبار میں اشتہار صرف فارغ جیسے نوجوانوں کو چڑانے کے لئے دیئے جاتے ہیں---بہر حال، پھر بھی اس نے ایک اشتہار منتخب کیا اور اس کے سیاق و سباق کو نوش کرنے کے بعد ایک بار پھر ایسی درخواست لکھنے لگا جس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ مذکورہ پوسٹ کے لئے موزوں ترین امیدوار ہے۔

''ایم اے فرسٹ کلاس، یونیورسٹی کا سکواش چیمپئن، بہترین مقرر،

ہر امتحان میں وظیفہ---'' دفتر کا ڈائریکٹر فارغ خان خیالی کی فائل دیکھتے ہوئے سر دھن رہا تھا۔ ''حیرت ہے تم جیسے قابل شخص کو آج تک نوکری کیوں نہ ملی---ویری سیڈ، اتنی صلاحیتوں کا مالک اور جوتیاں چٹخا رہا ہے---؟''

''سر! مجھ میں ایک صلاحیت اور بھی ہے---'' فارغ خان تعریف سن کر چوڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''وہ کیا بھئی---؟'' ڈائریکٹر اشتیاق سے بولا۔

''سر! میں شاعری بھی کر لیتا ہوں اور---''

''کک---کیا کہا، تم شاعر ہو؟---اوہ مائی گاڈ! تم جا سکتے ہو، مسٹر شاعر! ہمیں بیکار آدمی نہیں چاہئے۔ اب معلوم ہوا کہ تم ٹھیک ہی بیکار پھر رہے ہو---'' ڈائریکٹر کا لہجہ فوراً بدل گیا۔

''مم---مگر ابھی تو آپ---'' فارغ ڈوبتے دل سے بولا۔

''بکواس کر رہا تھا میں---گٹ آؤٹ---!''

دو ہفتوں کے طویل انتظار کے بعد فارغ کو ادبی رسالے کے ایڈیٹر کا جواب موصول ہوا۔ اس نے ہزار ارمانوں سے اسے کھولا، لکھا تھا۔

''محترم فارغ خان خیالی! آپ کا شہہ پارہ ماصول ہوا۔ ادب کی اس سرپرستی پر ہم آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں، کم ہے۔ ایک ہفتے تک آپ کے شہہ پارے کے بغور مطالعے کے باوجود ہماری پوری مجلس ادارت اس کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ بلند خیال شہہ پاروں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ اسے ہم جیسے کم فہم سمجھ ہی نہیں پاتے---بہر حال، اگر تو آپ نے نثر لکھی ہے تو واللہ، غالب کے بعد پہلی بار ایسی مقفیٰ مسجع نثر پڑھنے کو ملی ہے اور اگر آپ نے نظم لکھی ہے تو واللہ، سبحان اللہ ایک ہی غزل میں آپ نے بیک وقت سات، بحر استعمال کر کے کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ جس کی جرات بڑے بڑے اساتذہ کو نہیں ہوئی۔ آپ کو اس منفرد تجربے پر جتنی بھی داد دی جائے، کم ہے لیکن بصد ادب اور ہزار افسوس کے ساتھ عرض ہے کہ ہمارا عاجز مسکین سا رسالہ اتنے ''بلند معیار'' کی تحریریں چھاپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس تحریر کی اشاعت کے بعد اس رسالے کا معیار اتنا بلند ہو جائے گا کہ بڑے بڑے ادیبوں کے لئے اس میں لکھنا ناممکن ہو جائے گا---''

فارغ نے سوچا کہ دوسرے ادیبوں کے پیٹ پر لات نہ ماری جائے بلکہ مشاعروں میں اپنے جوہر دکھائے جائیں---تحقیق و تفتیش کے بعد اسے اپنے شہر میں ایک ہفتے بعد برپا ہونے والے مشاعرے کی سن گن ملی۔ اس نے انتظامیہ سے مل کر اپنی شاعرانہ عظمت کا احساس دلایا اور ان کو باور کرایا کہ وہ اب تک ایک عظیم شاعر کی شاعری سے محروم رہے ہیں جس کی وجہ سے ان کی روح صدیوں تک پیاسی رہنے کا خدشہ ہے---انتظامیہ نے بصد ادب شعراء کرام کی نیل سے لیکر تا بخاک کا شغر لسٹ میں فارغ خان خیالی کا اسم گرامی درج کیا اور مشاعرے کے دن مع لاؤ لشکر پہنچنے کی گزارش کی۔ فارغ خان مشق سخن میں معروف ہو گئے۔ دس غزلیں روزانہ کے حساب سے وہ سات دنوں میں ستر غزلیں جنم دے چکے تھے۔

☆☆

''---اور اب شمع ایک ایسے شاعر کے ''بوتھے'' کے آگے رکھی جاتی ہے، جس کی شاعرانہ عظمت کا ان کے محلے کا بچہ بچہ قائل ہے۔ تو دل تھام کر بیٹھئے کہ میں دعوت کلام دے رہا ہوں جناب فارغ خان خیالی صاحب کو۔'' کمپیئر لفظوں کو ضائع کرنے میں معروف تھا۔

''عرض کیا ہے---'' فارغ نے سٹارٹ ہونے کی کوشش کی۔

''ارشاد ارشاد---!''

''واہ، واہ کیا بندش ہے---''

پیار سے جب پکارتا ہے
دل پہ ڈاکہ مارتا ہے

''کیا چوراچکا شعر ہے، واہ سبحان اللہ---!''

محبت عجیب گیم ہے یارو
جو کھیلے ہارتا ہے

''کیا جواری خیال ہے---''

عجب دوا ہے سینڈل بھی
بگڑے مزاج سنوارتا ہے

''میڈیکل سٹور بند کرائے گا، ڈاکٹروں کی روزی پہ لات مارے گا۔''

بھاگے کہاں غریب کہ چار سو
ناگ مہنگائی کا پھنکارتا ہے

''ہائے، بجٹ---ہائے، بجٹ!''

بتایا جغرافیے کے سٹوڈنٹ نے
روس کا دارالحکومت جکارتہ ہے

''ویڈیو کا قصور ہے---''

تنہائی سے جب گھبراتا ہوں
چھت پہ آ کے پچکارتا ہوں

''کیا چارے دار شعر ہے---کیا منفرد بندش ہے۔''

انسان سے زیادہ وفادار ہے
یہ کہہ کر کتے کو چکارتا ہے

''اف، ظالم! اف---''

''مقطع عرض ہے بلکہ مکتا ہے---''

''ارشاد---ارشاد!''

میں تجھے نہ مارتا ہرگز فارغ
کیا کروں وہ مجھے شٹکارتا ہے

''سازش---سازش---سبحان اللہ---!''

وہ مشاعرے کے بعد سب دوستوں کو لیکر ہوٹل گیا جنہوں نے مشاعرے کے دوران اس کی دوستی کا حق اس خوش اسلوبی سے ادا کیا تھا کہ بڑے بڑے شاعر اپنی غزلیں پھاڑ کر اٹھ گئے تھے۔

☆☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اور ''چور نو دولتیہ'' ابھی تک کسی مکان میں نقب لگانے یا تالا توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس سلسلے میں چوکیدار اور چائنہ کی تالا کمپنی کے شجرہ نسب کو اپنی مرضی سے مرتب کرنے میں مصروف تھا۔ چلتے چلتے اسے ایک دیوار دکھائی دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ مکان کے اندر تھا۔ اس کی خوش قسمتی کہ مکان میں کوئی کتا موجود نہیں تھا۔ بہر حال، وہ اندھیرے میں اندازے سے اندرونی کمرے میں پہنچا اور دیا سلائی کی مدد سے تجوری تلاش کرنے لگا۔ تجوری دیوار میں ایک طرف موجود تھی۔ اس نے ہینڈل پر زور دیا تو کھل گئی۔ ''چور نو دولتیہ'' اپنی خوش قسمتی پر نعرہ لگانے کو تھا کہ اسے ہوش آ گیا کہ وہ کہاں ہے۔ دیا سلائی جلا کر اس نے تجوری کے اندر جھانکا تو اس کی امیدوں کی تمام کشتیاں ڈوب گئیں کیونکہ تجوری میں اوپر نیچے کاغذ ہی کاغذ بھرے ہوئے تھے۔ اب اس نے باقی کمروں کی تلاشی کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی۔ ایک دو سیکنڈ اس نے ستاروں کا رقص دیکھا اور پھر اندھیروں میں ڈوب گیا۔

''چور نو دولتیہ'' کو جب ہوش آیا تو اسے لگا جیسے سمندر میں غسل کر رہا ہو۔ آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے ایک نیم گنجے نوجوان کو پانی کا جگ لئے کھڑے دیکھا۔ اس نے حرکت کرنا چاہی مگر وہ مضبوطی سے کرسی سے بندھا ہوا تھا۔

''کک---کون ہو تم---؟'' چور نو دولتیہ خوف زدہ ہو کر بولا۔

''تو تم یہ پوچھنے کے لئے میرے گھر میں کودے تھے؟''

نیم گنجا نوجوان جو فارغ خان خیالی تھا، غصے سے بولا۔ چور نو دولتیہ بے بسی سے ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

''اب بہتری یہی ہے کہ فوراً اپنا تعارف، مکمل تعارف کرا دو۔'' فارغ بولا۔

''مم---میں پیشہ ور چور ہوں۔ چوری کی نیت سے آیا تھا مگر ملا کچھ نہیں، تجوریوں تک میں تم لوگوں نے کاغذ بھر رکھے ہیں۔''

''ابے، تجھے کیا اندازہ ان کاغذوں کی قیمت کا، یہ تو اس شاعر سے پوچھ جس کی وہ تخلیقات ہیں۔ وہ تو ایسی دولت ہیں جو تجوری تو کیا، بنک کے لاکر میں رکھنا چاہئیں۔ میں راتوں رات بھر جاگ کر خون جگر سے ان کو نکھارتا ہوں اور گھر کی چوکیداری بھی کرتا ہوں۔''

''مم---میں اسی لئے پکڑا گیا تھا، پھر---''

''اب یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا علاج کیا جائے۔ تمہیں سزا ضرور ملنی چاہئے، تم غلط نیت سے میرے گھر میں داخل ہوئے۔ میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔''

''خدا کے لئے، مجھے پولیس کے حوالے نہ کرنا، وہ میری چمڑی ادھیڑ دیں گے۔ آپ مجھے معاف کر دیں، پھر میں نے چرایا بھی کچھ

ہوائیاں

✿ اُٹھو میرے دوست! مصیبت تمہارا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے' ہمارے لئے رشتہ آیا ہے---توصیف احمد

☆ بہت اچھے آپ بھی دروازہ کھولنے سے باز نہ آنا جب کہ پتہ بھی ہے کہ مصیبت آ رہی ہے۔

✿ بیوقوف لڑکیوں کی کمی نہیں ہے' ایک ڈھونڈو ہزار ملتی ہیں---توصیف احمد

☆ آپ بھی ڈھونڈنے سے باز نہ آنا--- چلو اچھا ہے' خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے بے وقوف دو۔

✿ میں جوتے اور کپڑے بعد میں عاشق پہلے بدلتی ہوں---(ایک لڑکی)---حافظ محمد وقاص

☆ جی جوتے اور کپڑے پائیدار جو ہوئے۔

✿ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر اللہ دتہ نہیں ہے---ایک لڑکی کی حسرت---عبدالقیوم اسد

☆ اگر ''اللہ دتہ'' ہوتا تو اللہ کا دیا کچھ نہ ہوتا۔

✿ ایک فقیر سے میں نے اس کا نام پوچھا تو اُس نے شہزادہ بتایا---عبدالقیوم اسد

☆ آپ بھی شہزادے ہی ہیں' فقیروں سے نام پوچھتے ہیں؟

✿ ایڑھی والی جوتی پہننے سے عقل تو وہیں کی وہیں رہتی ہے' پھر فائدہ ایسی جوتی پہننے کا---عبدالقیوم اسد

☆ کھانے والے کی عقل ٹھکانے آ جائے' ہماری خیر ہے پا جی!

✿ حسن ایک قدرتی سفارش جس سے بہت سے کام نکلتے ہیں---ایک چکور

☆ سفارشوں پے ہی رہنا' خود کوشش نہ کرنا' کا کا!

✿ اندھے لڑکے نے بہری لڑکی سے شادی کر لی---مگر افسوس! لڑکا بہرہ نہیں تھا---توصیف احمد

☆ صد افسوس---لڑکی بھی اندھی نہیں تھی۔

مس صائمہ ہوا ہوائی' لاہور

نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ چوری ہرگز نہیں کروں گا۔"

"تو کیا ڈاکہ ڈالو گے۔۔۔اس بے روزگاری کے سیلاب میں گھر کا خرچ کیسے چلاؤ گے؟"

"چلا لوں گا جی، پر آپ مجھے چھوڑیں گے تو۔۔۔"

"چھوڑ دوں گا، چھوڑ دوں گا مگر اس سے پہلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔۔۔" فارغ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"وہ کیا۔۔۔؟" چور نو دولتیہ کی آنکھوں میں امید کا سمندر بہنے لگا۔

"تمہیں میری شاعری سننا ہوگی۔"

"منظور ہے۔۔۔" چور نو دولتیہ نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر عرض کیا ہے۔۔۔" فارغ خان نے بیاض کھولتے ہوئے کہا۔

☆☆

صبح جب فارغ کی اماں جاگیں تو انہیں فارغ کے کمرے سے عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں۔ وہ حیرت زدہ سی فارغ کے کمرے کی طرف چل پڑیں کیونکہ فارغ کا صبح اٹھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا مہنگائی کا خاتمہ۔۔۔دروازے پر انہیں رکنا پڑا کیونکہ اندر کوئی اجنبی یوں چیخ رہا تھا جیسے شدید کرب میں ہو۔

"بس کریں، فارغ صاحب! خدا کے لئے بس کریں۔۔۔"

"بس آدھی غزلیں تو آپ سن چکے، آدھی رہ گئی ہیں، وہ بھی سن لیں۔" فارغ کی آواز سنائی دی۔

"نہیں، میں نہیں سنوں گا۔ آپ مجھے بے شک پولیس کے حوالے کر دو۔"

"سو پیاز کے ساتھ ساتھ سو جوتے کھانے کی کوشش نہ کرو، آرام سے میری شاعری سنو۔ آخر تم غیر قانونی طور پر چوری کی نیت سے میرے گھر داخل ہوئے ہو، اتنی سزا کے تو تم مستحق ہو۔"

چور اور پولیس کے ذکر سے اماں بی چونکیں اور انہوں نے کھڑکی سے اندر کا منظر دیکھا اور پھر فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ وہ واپس کھڑکی کے پاس آئیں تو فارغ غزل سرا تھا۔۔۔

ہم بھی آ رہے ہیں ذرا ٹھہرو تو سہی
ذرا ناشتہ بنا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
تمہیں سینما جانے کی جلدی مچی ہے
بیگم کو بہانے لگا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
گرلز کالج میں ہو چکی ہے چھٹی
اور ہم گا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
ہاتھ تو ہٹاؤ کیا کان پھاڑو گے اب
مسلسل بیل بجا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
پڑوسن سے آنکھ لڑاتے دیکھ لیا بیگم نے
جوتوں سے سر بچا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
فکر نہ کرو عقد ثانی تجھی سے ہم کریں گے
ابھی بیگم کو منا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
لاکھوں خرچ کرکے جلسے میں منگوایا تھا
آپ ہیں کہ سونے جا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
ہو جائے گا جلد ہی سر تال بھی ٹھیک
ابھی ایسے ہی گا رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی
کیا ہوا جو گزر گئی رات شاعری سناتے ، فارغ!
ابھی تو رنگ جما رہے ہیں ، ذرا ٹھہرو تو سہی

اسی اثناء میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو چور نو دولتیہ گڑگڑا رہا تھا۔

"خدا کے لئے مجھے پولیس کے حوالے کر دو مگر اور ایک شعر بھی مت سنانا، میں مر جاؤں گا۔۔۔ہائے، ہائے۔۔۔" چور نو دولتیہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

"اوئے، کھولو اسے اور لے چلو تھانے۔۔۔" حوالدار ماتحتوں سے مخاطب تھا۔"۔۔۔اور ہاں، نوجوان! تم بھی چلو ذرا ہمارے ساتھ۔۔۔" حوالدار فارغ خیالی سے بولا۔

"مم۔۔۔میں۔۔۔وہ کیوں؟"

"اوئے، تم نے ساری رات اس پر تشدد کس قانون کے تحت کیا ہے؟۔۔۔سزا دینا عدالت کا کام ہے۔ ابھی تو یہ بے ہوش ہے، اگر مر جاتا تو تم کو ۳۰۲ میں اندر کر دیتا۔۔۔چلو آگے لگو۔"

محلے کی عورتیں فارغ کے گھر میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اگر وہ بی اماں کو نہ سنبھالتیں تو وہ تو اس واقعے سے نجانے کس حال کو پہنچ جاتیں۔

☆☆

"فارغ خیالی صاحب! آپ جا سکتے ہیں۔۔۔" ایس پی کہہ رہا تھا۔ "ہاں، حوالدار نے مجھے آپ کے بارے میں جو تفصیل بتائی ہے، اس کی روشنی میں میرے پاس آپ کے لئے ایک پیش کش ہے۔"

"کیسی پیش کش۔۔۔؟"

"ملازمت کی۔۔۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق آپ بے

روزگار ہیں۔"

"جی ہاں، مگر کیسی ملازمت---؟" فارغ حیرت سے بولا۔

"انویسٹی گیشن سیل میں ٹارچر انسپکٹر کی---!"

"مگر مجھے کرنا کیا ہوگا---؟"

"آپ کو آرام سے اپنے گھر میں رہنا ہوگا، کبھی کبھار آپ کو بلوایا جائے گا اور کسی ڈھیٹ اور پکے قیدی کو آپ کی شاعری اس وقت تک سنوائی جائے گی، جب تک وہ سچ اگل نہ دے۔"

"مجھے منظور ہے---" فارغ کی خوشی کا آتش فشاں پھٹنے کو تیار تھا۔

☆☆

"فارغ بیٹے! میں نے تمہارے لئے ایک لڑکی دیکھ رکھی ہے۔ اب تو تو روزگار والا ہو گیا ہے، میں چاہتی ہوں کہ اب تیری بات پکی کر ہی دوں۔" اماں بی آنکھوں میں ارمانوں کی بارات سجائے کہہ رہی تھیں۔

"اماں! کیوں میری کھوپڑی کے پیچھے پڑ گئی ہو؟ یہ جو دو چار بال رہ گئے ہیں، یہ وہ اتار دے گی جوتے مار مار کر--- پھر منہ دیکھا کرنا میرے گنج میں---"

"بک بک بند کر اور تیار ہو جا، آج ہم نے لڑکی والوں کے گھر جانا ہے۔" اماں بی نے حکم صادر کر دیا۔

☆☆

"بھائی صاحب اور بہن جی---!" اماں فارغ کے متوقع ساس سسر کو شیشے میں اتارنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ "میرا بیٹا بڑا ہی سعادت مند ہے۔ ماشاء اللہ، پڑھا لکھا ہے، پولیس کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر ہے۔ بہادر اتنا ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے گھر ایک چور گھس آیا۔ فارغ بیٹے نے اسے پکڑ کر باندھ دیا اور پھر ساری رات اسے شعر سناتا رہا اور وہ تکلیف سے چیختا رہا---"

"کیا کہا، بہن جی! شعر سناتا رہا--- کیا فارغ میاں شاعری بھی کرے ہیں؟"

"ہاں، بھائی صاحب! بڑا اچھا شوق ہے، میرے بیٹے کا فارغ وقت میں کچھ کرتا رہتا ہے۔"

"بہن جی! معاف کیجئے، اس غالب کی اولاد کو رشتہ دے کر میں نے اپنی پھول سی بچی کو بھوکوں نہیں مروانا۔ ہم جیتے جی اسے دلدل میں نہیں پھینکیں گے---" متوقع سسر نے فیصلہ سنا دیا۔ "اس سے بہتر ہے، لڑکی کا بیاہ ہم ڈاکو سے کر دیں، بیٹی عیش تو کرے گی۔"

"چلو، اماں---!" فارغ اٹھتے ہوئے بولے۔

میرا مشغلہ روزگار ہے شاعری
میری ذلت کا کاروبار ہے شاعری

☆☆

"مسٹر فارغ! تمہیں آج ایک نہایت خطرناک قیدی کی زبان کھلوانے کے لئے بلوایا گیا ہے---" ایس پی سامنے بیٹھے فارغ سے مخاطب تھا۔ "یہ مجرم ایک بین الاقوامی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے جسے ہمارے محکمے کے ایک باصلاحیت افسر نے زبردست مقابلے کے بعد گرفتار کیا ہے اور ہم اس کے دیگر ساتھیوں اور تنظیم کے مقامی ہیڈکوارٹر کا پتہ اگلوانے کے لئے ہر قسم کا تشدد کر چکے ہیں مگر نجانے یہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے کہ منہ سے کچھ پھوٹتا ہی نہیں۔"

"یقیناً کسی گڑ کی مٹی سے بنا ہوا ہوگا--- بہر حال، آپ بے فکر رہیں، ایک گھنٹے میں یہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجے گا۔"

"ٹھیک ہے، تم سپاہی کے ساتھ سپیشل روم چلے جاؤ۔"

"فارغ خان جب سپیشل روم میں داخل ہوا تو ایک بار تو اس کے رونگٹے اٹینشن ہو گئے کیونکہ کمرے میں نہایت خوفناک ہتھیار ہر طرف موجود تھے۔ مذکورہ قیدی شدید زخمی حالت میں بے ہوش تھا اور کرسی پر بندھا ہوا تھا۔ سپاہی نے اس کے سر پر پانی کا جگ انڈیلا تو وہ ہوش میں آ گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ فارغ کو کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا۔

"یوں کیا دیکھ رہے ہو، بھائی! کیا میں تمہارا ادھار لیکر بھاگ گیا تھا؟" فارغ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو اب تمہیں بھیجا گیا ہے میری زبان کھلوانے کے لئے--- ٹھیک ہے، کوشش کر دیکھو تم بھی۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"توبہ، توبہ تم کوئی نئی نویلی دلہن تھوڑی ہو کہ میں تمہارا منہ کھلواؤں گا اور پھر میرے پاس یہ رسم پوری کرنے کے لئے رقم بھی نہیں ہے۔ میں تو ذرا تمہارا دل بہلانے کے لئے آیا ہوں۔"

قیدی نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔

"تو پھر سنو، عرض کیا ہے---" فارغ نے بیاض کھولتے ہوئے کہا۔

مشکلوں میں گھر جاؤ گے ہم نہ کہتے تھے
بیگم جب تم لاؤ گے ہم نہ کہتے تھے

قیدی کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے ہونٹوں کو مزید بھینچ لیا۔

محلے بھر کو پیٹنے والے بیگم سے

چپ چاپ پٹ جاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
''کیا بکواس ہے، نان سینس---!'' قیدی دھاڑا۔
آزادی سلب ہو جائے گی تمہاری
بیگم کہے تو قدم اٹھاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
رعب سے کبھی ڈائنگ ٹیبل پر آنے والے
بیگم کو ناشتہ کراؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
''بند کرو یہ بک بک---'' قیدی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔
فیملی پلاننگ دھری رہ جائے گی
بچوں کی فوج بناؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
دن رات سسرالی دورہ کریں گے
گھر مہمان خانہ بناؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
''بچاؤ، مجھے بچاؤ---خدا کے لئے چپ ہو جاؤ---خدا کے لئے---''

قیدی کرب سے چیختا ہوا بولا اور پھر اچانک بے ہوش ہو گیا۔ اس کا زخمی جسم اس ذہنی تشدد کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ قیدی کو دوبارہ ہوش میں لایا گیا اور فارغ پھر وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے رابطہ ٹوٹا تھا۔

''بیوی کی فرمائشیں ختم نہ ہوں گی
بیگم کو تنخواہ اڑاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے''
''میں تمہیں قتل کر دوں گا۔'' قیدی دھاڑا۔
''کبھی جو حال پوچھیں گے تمہارا
پھر بات کو گھماؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
کنوار پنے کے دن یاد کرو گے
کر کے شادی پچھتاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
ہو تم کتنے ہی شہ زور اور بہادر
جوتے بیگم سے کھاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
کہتے تھے تم دیکھ لوں گا بیگم کو بھی
تاج زن مریدی سجاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے''

''اوہ، مائی گاڈ! میرا سر پھٹ جائے گا---کاش، میں اپنے کان بند کر سکتا۔'' قیدی بے بسی سے روتے ہوئے بولا۔

''بیگم کو چھوڑ کر کہیں بھاگ بھی گئے تو
بیگم کو وہیں تم پاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے
دنیا میں کہیں پناہ نہ مل سکے گی ، فارغ!
پاگل خانے تم جاؤ گے ، ہم نہ کہتے تھے''

''شکر ہے، غزل تو ختم ہوئی---تھینک گاڈ---!'' قیدی نے سکون کا سانس لیا۔

''اب چند شعر ایک ایک غزل کے ملاحظہ کریں---
''کیا کہا، اب ایک غزل پڑھو گے تم---؟''
''عرض کیا ہے---

''ہم سمجھے مرحلے شادی کے آسان تھے
کیا نکاح تو دشمن زمیں آسمان تھے
یہ اور بات کہ پا نہ سکے تکمیل کبھی
ورنہ شوہروں کے بھی ارمان تھے
جہاں بینڈ بجا ، وہیں ہوش اڑ گئے
واقعات شادی کے کتنے خونچکاں تھے
بیوی کے طعنوں نے چڑچڑا بنا دیا
ورنہ کبھی ہم بھی محفل کی جان تھے''

قیدی ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ دوبارہ ہوش میں لا کر اس کے کانوں میں مزید شاعری انڈیلی جانے لگی---

''دکھائی دیتے تھے یہ سائے بڑے سعادت مند
یہ اور بات کہ بعد میں نکلے نرے شیطان تھے
اب تو گھر گیا ہوں سسرال میں
بیت گئے وہ دن جب دوستوں کے درمیان تھے''

''تم---تم اس صدی کے ظالم ترین انسان ہو اور تمہاری بیوی یقیناً اس سے بھی ظالم ہوگی جس پر تم نے یہ شاعری کی ہے۔''

''میری شادی نہیں ہوئی---بہر حال، اگلے شعر سنو---
شوہروں کی فغاں کو جب غور سے سنا
بیوی کی فرمائشوں سے سبھی نالاں تھے
تم کیوں بھول گئے وہ دن ، اے مسٹر!
کرتے جب ان سے زن مریدی کا پیماں تھے
نہ دیکھ حقارت سے ان شوہروں کو
کبھی یہ بھی فارغ ، گھر پہ حکمراں تھے''

''رحم، رحم---پلیز، اب کوئی اور غزل مت شروع کرنا۔ میں بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔''

قیدی لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں چیخنے لگا اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔ سپاہی نے ٹیپ آن کر کے اس کا بیان ریکارڈ کرنا شروع کر دیا۔

پہلے مشن میں زبردست کامیابی کے بعد فارغ خیالی ہواؤں میں اڑتا ہوا گھر کو رواں تھا کہ اچانک گلی سے مس چلبلی آتی نظر آئی جو اکڑ

نشتر خنجری کی اکلوتی اولاد تھی۔ فارغ کو یوں محسوس ہوا کہ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی ہے حالانکہ اس کی شکل بھی ایسی تھی کہ لگتا تھا اسے کسی ٹوتھ پیسٹ کمپنی نے مستقل طور پر ماڈل بنا رکھا ہے۔ فارغ جواب میں نہایت احمقانہ انداز میں مسکرایا اور مس چلبلی کے عین سامنے رک کر بولا۔

''تو ہے کہ مجھے دور سے کرتی ہے اشارے
میں ہوں کہ تجھے پاس سے کرتا ہوں اشارے''

''کیا بکواس ہے، ہٹو سامنے سے مجھے بیوٹی پارلر جانا ہے۔'' مس چلبلی غصے سے بولی۔

''یہ جو حسن و جمال ہے
کیا میک اپ کا کمال ہے''

''کس پاگل سے واسطہ پڑ گیا --- راستہ چھوڑو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''ہوئے کب ہم پہ تم مہربان
رہے بیوٹی پارلر کو سدا رواں''

''آخر تم چاہتے کیا ہو --؟'' مس چلبلی تنگ آ کر بولی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے پیچھا کیسے چھڑائے۔

''اپنی پلکوں کے لنگر اٹھاؤ کبھی
میرے دل کی یہ نیا چلی ہے ابھی
میں بھی پکڑوں یہاں پیار کی مچھلیاں
جال ڈالے ہوئے ہیں شکاری سبھی''

''اوشٹ اپ، یو اِیڈیٹ! ابھی مزہ چکھاتی ہوں ---''

اچانک مس چلبلی نے چیختے ہوئے پوزیشن بنائی اور فارغ پر کراٹے کا وار کر دیا۔ وہ دور جا گرا۔ پھر اٹھ کر بولا۔

''مجھ کو سر بازار تم نے پیٹ ڈالا
عاشقی کا نام جہاں سے مٹا ڈالا''

نجانے اس دوران کہاں سے مس چلبلی کے بے شمار ''بھائی'' اکٹھے ہو گئے۔ پھر انسانی اعضائے کے ساتھ ہمہ اقسام کے قیمتی پاپوش بھی آزادانہ استعمال کیے گئے۔ اس بہتی گنگا میں بعض ایسے ''پہلوانوں'' نے بھی ہاتھ دھوئے جنہوں نے کبھی زندگی میں مکھی بھی نہ ماری تھی۔ ''مجاہدین'' کو یہ ''کار خیر'' اس وقت بادل نخواستہ روک دینا پڑا۔ جب انہیں احساس ہوا کہ فارغ کی روح اس کے جسم کو بی آف (Be-Off) کہنے کی تیاریوں میں ہے۔ مردہ سر پر لٹکتا دیکھ کر فارغ کو اسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹروں کی پانچ گھنٹے کی سر توڑ کوششوں کے بعد فارغ ہوش میں آیا تو یہ شعر بڑبڑا رہا تھا ---

''لڑکیاں بھی سیکھ چکیں اب جوڈو کراٹے
اک ذرا چھیڑیئے، پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے''

☆☆

دو غزلیں سننے کے بعد ہی ڈاکٹروں نے فارغ کو ہسپتال سے فارغ کر دیا اور اس کا باقی علاج گھر پر ہوتا رہا۔ اس دوران اس کی غزلوں کی بڑی سنچریاں بھی مکمل ہو گئیں۔ اس دن فارغ کی بی اماں دوسرے شہر گئی ہوئی تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں فارغ بستر سے مکمل انصاف کر رہا تھا۔ اس کے اٹھنے کے ٹائم ٹیبل یعنی بارہ بجنے میں ابھی پورا گھنٹہ باقی تھا کہ دروازہ بجا۔ فارغ نے پہلے تو دل ہی دل میں اس مردنامعقول کی شان میں کچھ گستاخی کی اور اس کے شجرہ نسب کو جانوروں کے ساتھ ملانے کی کوشش کی جس نے اسے ''کچی'' نیند میں اٹھا دیا تھا، پھر بادل نخواستہ اٹھ کر دروازہ کھولا تو موٹے شیشوں کی عینک لگائے ایک ادھیڑ عمر گنجا نظر آیا۔

''مجھے فارغ خان خیالی صاحب سے ملنا ہے۔'' وہ شخص بولا۔

''ادھار تک تو کوئی دیتا نہیں اور ملنے آ جاتے ہیں --- ہونہہ ---!'' فارغ بڑبڑایا۔ ''میں ہی ہوں، جی ---!''

''اوہ، آپ --- بڑا اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔''

''مگر آپ ---''

''میں فارغ البال ناقدری ہوں، آپ کا فین ---!''

''اوہ، اچھا اچھا --- آیئے، تشریف لایئے۔'' فارغ خیالی کا چہرہ یوں چمک اٹھا جیسے ابھی بیوٹی پارلر سے آیا ہو۔

''عطا کریں نا! اپنا کوئی تازہ کلام ---''

فارغ البال ڈرائنگ روم میں چائے پیتے ہوئے کہہ رہا تھا اور فارغ کو یوں محسوس ہوا جیسے چائے بنانے پر کی گئی محنت کا اجر ملنے والا

محاورات کا دُرست استعمال

☆ چندے آفتاب چندے ماہتاب: بیوٹی پارلر سے نکلنے الی ہر خاتون چندے آفتاب چندے ماہتاب ہوتی ہے۔
☆ عنقا ہونا: آج کل کے سیاستدانوں میں دیانت داری اور عورتوں میں حیا عنقا ہے۔
☆ جی چھوڑ بیٹھنا: ایک محبت میں ناکام ہو کر جی چھوڑ بیٹھنا عاشقوں کا شیوہ نہیں۔
☆ وارے نیارے ہونا: الیکشن جیتتے ہی وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔
☆ آنکھیں کھلنا: آٹھ گھنٹے سونے کے بعد میری آنکھیں کھل گئیں۔
☆ دقیقہ اُٹھا نہ رکھنا: اس نے الیکشن میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا حتیٰ کہ مرحومین کے ووٹ بھی بھگتائے مگر ہار گیا۔
☆ ہاتھ بٹانا: اس نے ملاوٹ کرنے میں اپنے والد کا ہاتھ بٹایا۔

خادم حسین مجاہد، سرگودھا

ہو۔

''ایک شعر عرض ہے---'' فارغ خیالی نے اسٹارٹ ہونے کی کوشش کی۔

''میں گرلز کالج کی راہ سے ہو کر گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی ویل تھا''

''واہ، کیا شارٹ کٹ مارا ہے---سبحان اللہ---!''

''ایک اور لیجئے---

لے کے طلاق بیوی یہ کہتی ہے ہم سے
تم نے چاہا ہی نہیں چاہنے والوں کی طرح''

''واہ جی، واہ---مگر شادی سے پہلے ہی ایسا تجرباتی شعر---؟'' فارغ البال الجھن میں تھا۔

''ارے، صاحب! اگر میری شادی نہیں ہوئی تو کیا آس پاس کسی اور کی بھی نہیں ہوئی---اب ایک شعر کے لئے میں ایسا ہولناک تجربہ کرتا؟''

''اچھا، اچھا---کچھ اور عطا ہو؟''

''تیرے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھا نہیں جاتا
جیسے مرغ کے پاس انڈا دیکھا نہیں جاتا
تیرے حسن کے جلوے اب کیا ہوئے
ہم سے کہ انداز ٹھنڈا دیکھا نہیں جاتا
کھانے پہ آئیں تو سب کھا جاتے ہیں
وہ پھر مرغی ہو کہ انڈا، دیکھا نہیں جاتا
تیرا رومال لیکر اکڑتا پھرتا ہے
رقیب کے پاس یہ جھنڈا دیکھا نہیں جاتا
جب نکلتی ہو دو چار پھڑکا دیتی ہو
تیرے حسن کا یہ ''غنڈا'' دیکھا نہیں جاتا
تم آؤ تو پھر سیر بھی کریں اس کی
اکیلے تو ہم سے لنڈا دیکھا نہیں جاتا''

''کمال کردیا، فارغ خیالی صاحب! اتنی خوبصورت شاعری عوام تک ضرور پہنچنی چاہئے، کیا خیال ہے؟''

''خیال تو نیک ہے مگر میں مالی طور پر اس پوزیشن میں نہیں کہ چھپوا سکوں۔''

''آپ کے فین کے تعلقات کس دن کام آئیں گے---ایک ناشر (Publisher) میرا دوست ہے۔ آپ مسودہ دیں، ہوسکتا ہے میں کچھ رائلٹی بھی آپ کو دلوانے میں کامیاب ہوجاؤں۔'' فارغ البال بولا۔

''کیا سچ---؟''

''تمہاری شاعری اور میرے گنج کی طرح سچ---!''

فارغ خان خیالی پھولا نہ سما رہا تھا، اس کے کپڑے تنگ پڑ گئے تھے۔ اس نے گھر کے تمام کونوں کھدروں اور تجوری سے اپنے کاغذات اکٹھے کئے اور گنجے کے حوالے کردیئے۔

''میں جلد ہی آپ کو خوشخبری سناؤں گا۔'' گنجا بنڈل لیکر چلا گیا۔

ڈیڑھ ہفتے کے جان لیوا انتظار کے بعد فارغ کو ایک خط موصول ہوا۔ اس نے خط کھولا، لکھا تھا۔

''اپنے محلے کے عظیم شاعر، حضرت فارغ خان خیالی صاحب

آداب!

آپ کا مسودہ لیکر میں پہلی فرصت میں پبلشر دوست کے پا گیا۔ چند صفحات پڑھنے کے بعد اس نے مجھے وہ مسودہ دریا برد کرنے مشورہ دیا لیکن اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس طر سمندری آلودگی میں اضافے کا امکان ہے لہٰذا مسودہ نذر آتش کر جائے تا کہ آئندہ نسل اس کے شر سے محفوظ رہ سکے۔ وہ یہ کار خیر ا نیک ہاتھوں سے سرانجام دینا چاہتا تھا مگر میں آپ کا مسودہ ان ا ناشناسوں سے زندہ واپس لانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر میں نے سو کہ اگر مجموعہ چھپ بھی جاتا تو اتنا مہنگا ہوتا کہ کوئی خرید کر نہ پڑھ آپ کی شاعری سے کوئی محظوظ نہ ہوسکتا۔ پبلک تک براہ راست آپ شاعری پہنچانے کے لئے میں نے آپ کی آدھی غزلیں شہر کے پینٹر میں اس گزارش کے ساتھ تقسیم کردیں کہ وہ آئندہ گاڑیاں پینٹ ڈیکوریٹ کرتے وقت ان کے اشعار استعمال کریں۔ باقی شاعری عام کرنے کی غرض سے میں نے ایک ریڑھی والے کو فروخت کردی۔ وزن ساڑھے تین کلوگرام بنا جس کے مبلغ اٹھائیس روپے سکہ را الوقت قیمت بحساب آٹھ روپے فی کلوگرام کا چیک اس خط سے منس ہے۔ امید ہے، اس طرح غریب سے غریب آدمی بھی آپ کی شا سے لطف اندوز ہوسکے گا۔ پھر یاد فرمائیے گا۔

خیر اند

فارغ البال

دوسرے دن اخبارات میں ایک خبر چھپی۔

''کل ایک نوجوان فارغ خان خیالی نے خودکشی کرلی۔ مط ہے کہ مرحوم کا ذہنی توازن درست نہ تھا، وہ شاعری وغیرہ کر تھا---''

ٹکریں

پیراڈی ایک دقیق فن ہے اور اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کسی شعر میں الفاظ کا کچھ ایسا ہیر پھیر کیا جائے کہ اس کا مفہوم یکسر بدل جائے اور شعر کی ''صحت'' پر بھی مضر اثرات نہ پڑیں۔ اسی رہنما اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ فلمی نغموں اور فلمی و غیر فلمی نظموں، غزلوں کی دُرگت بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو اصل کلام کے ساتھ اپنی کوشش ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم یہاں اسے شائع کریں گے تاکہ دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اپنی ''ٹکریں'' اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج ٹکریں تیس روزہ ''چاند'' F-31، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

فلم ''دو بدن'' کا شاعر

رہا گردشوں میں ہر دَم میرے عشق کا ستارا
کبھی ڈگمگائی کشتی کبھی کھو گیا کنارا
رہا گردشوں میں ہر دَم--- ---
کوئی دل کے کھیل دیکھے کہ محبتوں کی بازی
وہ قدم قدم پہ جیتے، مَیں قدم قدم پہ ہارا
رہا گردشوں میں ہر دَم--- ---
یہ ہماری بدنصیبی جو نہیں تو اور کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا
رہا گردشوں میں ہر دَم--- ---
پڑے جب غموں سے پالے رہے مٹ کے مٹنے والے
جسے موت نے نہ پوچھا اُسے زندگی نے مارا
رہا گردشوں میں ہر دَم میرے عشق کا ستارا

محمد سعید انجم

رہا طیش ہی میں ہر دَم میری اہلیہ کا پارا
کبھی تو گھمائی جوتی، کبھی جھاڑو دے کے مارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم --- ---
کوئی گھر میں آ کے دیکھے کہ یہ ازدواجی دنگل
وہ قدم قدم پہ جیتے، مَیں قدم قدم پہ ہارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم --- ---
یہ ہماری بدنصیبی جو نہیں تو اور کیا ہے
کہ ہمیں ملی ہے نکڑ، اُسے مل گیا شرارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم --- ---
پڑے جاہلوں سے پالے رہے پٹ کے پٹنے والے
جسے ساس نے نہ کوٹا، اُسے سالیوں نے مارا
رہا طیش ہی میں ہر دَم میری اہلیہ کا پارا

نذیر قیصر

عالم ہے عجیب حسن کا بھی
وہ چاند ہے اور چاند سا بھی
دن بھر کی تھکن تھی، سو گیا مَیں
یاد آتا کوئی تو جاگتا بھی
روتے تھے کہ درد ہجر کم ہو
اب ختم ہوا یہ سلسلہ بھی
اک شخص ملا تھا رات مجھ سے
کیا تجھ سا ہے کوئی دوسرا بھی
چوما تھا کبھی تیرے لبوں کو
اب یاد نہیں وہ ذائقہ بھی
ملے جاؤں کہاں بچا کے آنکھیں
آئینہ بدست ہے صدا بھی

نوید ظفر کیانی

عالم ہے عجیب حسن کا بھی
وہ چاند ہے اور چاند سا بھی
دفتر کا ہے معمول، سو گیا مَیں
گھر ہوتا اگر تو جاگتا بھی
روتے تھے کمیشنوں کے غم میں
اب ختم ہوا اور کک مکا بھی
اک شخص اُڑا گیا ہے بٹوہ
کیا تجھ سا ہے کوئی دوسرا بھی
مارا تھا کبھی تری مما نے
اب یاد نہیں وہ بیلنا بھی
مَیں جاؤں کہاں بجٹ سے بچ کے
رستے میں کھڑی ہے یہ بلا بھی

سفیر

سوزِ اُلفت چھپائے بیٹھا ہوں
آگ گھر میں لگائے بیٹھا ہوں
دردِ اُلفت چھپائے بیٹھا ہوں
لاکھ طوفاں دبائے بیٹھا ہوں
کھو دیا یاد آنے والے نے
آج سب کچھ بھلائے بیٹھا ہوں
اُٹھ کے اے درد تو دوا بن جا
مَیں بہت تنگ آئے بیٹھا ہوں
اَب ہوئی آہٹ اَب کوئی آیا
در پہ آنکھیں لگائے بیٹھا ہوں
رات مر مر کے رات کاٹی ہے
ہر دَم اُٹھ اُٹھ کے ہائے بیٹھا ہوں
اُن کی تصویر روبرو ہے سفیر
دِل کی دُنیا بسائے بیٹھا ہوں

سعید خاں

مار بیوی سے کھائے بیٹھا ہوں
سر پہ پٹی سجائے بیٹھا ہوں
وار چمٹی کا کھائے بیٹھا ہوں
کھانا اَب تک چھپائے بیٹھا ہوں
مانگا کھانا تھا نہ دیا اُس نے
بس فقط جھاڑ کھائے بیٹھا ہوں
اُٹھ کے دو قدم چل نہیں سکتا
ایسی ٹانگیں تڑائے بیٹھا ہوں
اَب ہوئی آہٹ اَب کوئی آیا
ڈر سے خود کو چھپائے بیٹھا ہوں
اِک سہارا سا ہو گیا ہے بس
سوکھے ٹکڑے چبائے بیٹھا ہوں
اپنی تقدیر روبرو ہے سعید
دِل کی دُنیا لٹائے بیٹھا ہوں

فلم ''قربانی'' کا شاعر

آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے
تو بات بن جائے ہاں ہاں بات بن جائے
گل کو بہار، بہار کو چمن
دِل کو دِل، بدن کو بدن
ہر کسی کو چاہیے تن کا ملن
کاش مجھ پہ ایسا دِل آپ کا بھی آئے
تو بات بن جائے --- ---
مَیں انسان ہوں فرشتہ نہیں
ڈر ہے بہک نہ جاؤں کہیں
تنہا دِل نہ سنبھلے گا پیار بنا یہ ترسے گا
آپ سا کہاں ہے دِل آپ کو ہی پائے
تو بات بن جائے --- ---

محمد اسلم قریشی

ہم جیسا کوئی تیری برسی منائے
تو بات بن جائے ہاں ہاں بات بن جائے
تم کو بخار، بخار میں جلن
موت کو تم، تم کو کفن
ہر کسی کو چاہیے ایسا ہی ملن
کاش، تجھ پہ ایسا وقت جلدی جلدی آئے
تو بات بن جائے --- ---
تم شیطان ہو فرشتہ نہیں
جلدی سے اَب بھاگ جاؤ کہیں
تنہا دِل نہ سنبھلے گا پیار بنا نہ تڑپے گا
تم نے ڈسا ہے رَبّ تم کو اُٹھائے
تو بات بن جائے --- ---

چاند نگر

مختلف موضوعات پر ہنستی مسکراتی، کھلکھلاتی ہنستی تحریریں

"چاند نگر" ایسی شوخ تحریروں سے آباد ہوتا ہے جو طوالت کے لحاظ سے "نابالغ" لیکن شوخی اور شرارت میں بالغ ہوتی ہیں۔ آپ بھی اس میں جگہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن شرط یہی ہے کہ آپ کی تحریر میں مزاح کوٹ کوٹ کر بلکہ ٹھونس ٹھونس کر بھرا گیا ہو۔ یہ خیال بھی رکھئے کہ یہ مسکراہٹیں آپ کی اپنی تخلیق ہوں، کہیں سے اُڑائی نہ جائیں۔ اپنے مختصر مضامین اس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج "چاند نگر" تیس روزہ "چاند" F-29، شمع پلازہ، فیروز پور روڈ، لاہور 54600

پائے

ناہید صدیقی

لاہوریوں کی پسندیدہ ڈش پائے ہیں اور ہر کوئی پائے کھاتے ہوئے پایا جاتا ہے۔ کسی سے پوچھا کہ پائے کی کتنی قسمیں ہیں؟ کہا۔

"دو--- ایک جانور خود رسید کرتا ہے اور اس کا رنگ نیلا آتا ہے۔ دوسرا انسان پکا کر کھاتا ہے۔"

بڑے پائے بڑے ہونے کی وجہ سے بڑے ہی لذیذ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ بڑوں کا احترام بھی کرتے ہیں۔ بھینس کے پائے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں، شاید اس لئے کہ بھینس کی عقل پائیوں میں ہوتی ہے لیکن اگر بھینس میں عقل ہوتی تو یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ عقل بڑی کہ بھینس--- اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ عقل اور بھینس آپس میں سسٹرز ہیں۔ یہ بات کہاں تک درست ہے، کوئی بھینس ہی اس کا جواب دے سکتی ہے۔

دُنیا میں کئی قسم کے پائے پائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمام کھانے والے نہیں ہوتے۔ عموماً پائے گائے، بھینس، بکری کے ہی کھائے جاتے ہیں۔ گائے کے پائے دیکھنے میں خوبصورت ہو سکتے ہیں۔ (اگر کوئی بھینس یہ مضمون پڑھ رہی ہو تو وہ اپنے پایوں کی خوبصورتی کے لئے پائے کی ورزش اور فیئر اینڈ لولی استعمال کر سکتی ہے۔) گائے جوڈو کراٹے بھی سیکھ لے کہ وقتِ ضرورت دُشمن کا مقابلہ پائے سے کر سکے، شاید اس طرح اس کی قیمت میں مزید اضافہ ہو جائے۔

لاہوریوں کو پائے پسند ہیں۔ اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ نان کو پائیوں میں ڈبو ڈبو کر بے حال کر دیا جاتا ہے۔ پہلے ہاتھوں کی مار ماری جاتی ہے، پھر دانتوں کی۔ اس بات پہ ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے، یہ تو ان کے سیانے پن کی بات ہے کہ نان کو پہلے ہی اس حال تک پہنچا کر کھاتے ہیں کہ بعد میں خدا سے دُعا نہ کرنی پڑے کہ "یا اللہ یا نان کنڈیا جان کنڈ"

پائے گرم ہوتے ہیں۔ تاثیر کے لحاظ سے بھی اور کھانے کے لحاظ سے بھی۔ ویسے بھی آج کل غریب عوام گرمی ہی کھاتی ہے۔ ہر بات پر اور مستقبل قریب میں جب صدر مشرف اور وزیراعظم صاحب کا "غریب مکاؤ" پروگرام عروج پر ہوگا تو بھینس، گائے، بکری کے پائے خیالی پلاؤ لگیں گے اور ہر طرف مرغ پائے اور آخر میں چڑی پائے ہی پائے جائیں گے--- اگر بھینس کو اپنی اہمیت کا اندازہ ہو جائے تو غریب عوام کو لفٹ ہی نہ کروائے اور گھر میں بھینس لانا ہاتھی لانے کے برابر ہو جائے۔ اب یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ بھینس کے پائے "کھانے کے اور دکھانے کے اور" آج کل حکومت ہر خاص و عام کی مدد کا دعویٰ کرتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ کوئی بھینس ہم پر "ہتک پائے" کا دعویٰ کر دے۔ ویسے بھی الیکشن کا دور ہے، کیا پتہ گائے بھینسوں کے ووٹ بھی بن رہے ہوں اور اِن کی بھی ترقی کا کام جاری ہو۔ ہمارے خیال سے اِن کا پہلا مطالبہ یہ ہوگا کہ اِن کے لئے بھی موٹروے بنوائی جائے کہ اُونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے اِن کے پائے خراب ہوتے ہیں اور بعد میں آرمی والوں کی طرح لونگ جوتے بھی بنوا کر دیئے جائیں۔ احتیاط کی احتیاط اور ساتھ میں اِن کے پائے استدلال میں لغزش نہ آئے اور وہ راہِ راست پر چلتے ہوئے مطلوبہ جگہ ووٹنگ کے لئے پہنچ جائیں۔

اِس سے پہلے کہ کوئی گائے، بھینس ہمیں ہی نیلا رنگ دینے پہ اُتر آئے، ہمیں کنی کترا لینی چاہئے۔ ☆☆

کنواروں کی دنیا

محمد سعید خان

دورِ حاضر میں معاشرے کے ہر طبقے پر مسائل کا عفریت دھرنا مارے بیٹھا ہے اور معاشرے کا ہر طبقہ اِس کے نیچے دبا چیخ رہا ہے، ہاتھ جھٹک رہا ہے، پیر پٹک رہا ہے۔ ان ہی مسلوب طبقوں میں ایک طبقہ کنواروں کا بھی ہے کہ جن کا بنیادی مسئلہ تو آگ کے نہ "بلنے" کا ہی ہے۔ کنوارے کہ جنہیں عرف عام میں چھڑا بھی کہا جاتا ہے، سخت مصائب کا شکار ہیں۔ اُن کے لئے یہی مصیبت کیا کم ہے کہ چھڑیاں

(صنف نازک) برسرِ عام گھومتی پھرتی ہے اور پھر طرّہ یہ کہ فیشن نے لباس کا ''قلع قمع'' کر دیا ہے۔ درزی حضرات بھی کنواروں کے دُشمن نمبر ایک ہیں جو آئے دِن نت نئے صبر آزما قسم کے فیشن معرضِ وجود میں لاتے رہتے ہیں۔ کنواروں کے لئے یہ بھی ایک پرابلم ہے کہ جو کچھ فلمساز اُنہیں فلموں میں دِکھاتے ہیں' عام زندگی میں اُس کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ اِن ہی گوں ناگوں مسائل کو دیکھتے ہوئے ہم نے اِس طبقے سے رابطے کی ٹھانی اور سروے کر ڈالا۔ اِس سروے کا ٹارگٹ ہمارے اریب قریب کے اصحاب بنے۔

ہمارے ایک شناسا ہیں جو منگنی کروا چکے ہیں' اب انتظار ہے تو اتنا کہ کب وہ بھاگ بھرا دِن آئے کہ جب موصوف ''سپنوں کی رانی'' کو پھولوں بھری کار میں لادلائیں۔ اِس حسرت وتمنا میں موصوف عجیب و غریب حرکات فرماتے ہیں۔ مثلاً گزری عید کا واقعہ لیجئے۔ اپنی اُن کے لئے عید کارڈ تلاشنے نکلے تو شوقِ تمنا نے اُن کے ساتھ ہمیں بھی پورا لاہور گھمایا لیکن پھر بھی اُنہیں کوئی کارڈ اپنی ''خوابوں کی شہزادی'' کے لئے نہیں جچا۔ جھلا کر ہم نے ایک دھول اُن کی نازک کمریا پر جمائی تو موصوف نے بزرگانہ انداز سے تبسم فرمایا' بعدازاں ارشاد فرمایا کہ ''جس تن لاگے سوتن جانے'' --- سو صاحبو! مصیبت میں گھرے اُس تن کو ہم نے اُس کے حال پر چھوڑا اور گھر کی راہ لی۔

اب آیئے ایک اور حضرت کی طرف۔ یہ موصوف بھی منگنی یافتہ ہیں لیکن پہلے مذکور موصوف سے کہیں زیادہ بے قرار و بے تاب واقع ہوئے ہیں۔ ہر دَم رُخِ یار اُن کے تصوّرات پر چھایا رہتا ہے۔ ہر مہینے اناؤنس کر دیتے ہیں کہ فلاں مہینے شرلی پٹاخے چھوٹیں گے۔ اِس کے علاوہ اضافی خصوصیت یہ کہ بذریعہ سالی نامہ و پیام جاری و ساری ہے اور اِس مد میں ہماری شامت آئی رہتی ہے۔ روز دہاڑے کاپی ہاتھ میں لئے ہمارے دَر پر عشقیہ اشعار کے لئے صدا دیتے ہیں جبکہ مصیبت یہ ہے کہ موصوف بھڑکیلے اشعار سے نیچے بات ہی نہیں کرتے اور بسا اوقات اُن کے دِلِ بے قرار کا تمام احوال بھی ہمیں ہی مضمون میں باندھنا پڑتا ہے۔ ایک بار اُن کی دوستی نے جو جوش مارا تو دوڑے آئے اپنی ''اُن'' کی تصویر دِکھانے۔ تصویر دیکھ کر ہمارا جو حال ہوا' وہ ہمارے علاوہ فقط ہمارا خدا جانتا ہے۔ ہم کافی دیر تک موصوفہ میں نسوانیت تلاشتے رہے لیکن یہ کوشش سین کے ڈراپ ہونے تک بارآور نہ ہوئی۔ صرف لبوں کی لالی وجو وزن کی نشاندہی کر رہی تھی اور کہ عمر کا بادل موصوفہ پر گھٹا باندھ کر برسا تھا۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

''بھئی' کمال ہے تمہاری ساس تو بڑی الٹرا ماڈرن ہے؟''

جواب میں ایک گھونسا ہماری کمر میں آیا اور تصویر ہماری نظروں کے سامنے تارا بن کر ناچنے لگی۔

ایک اور دِل والے ہیں کہ جنہیں منگنی میسر نہیں ہے سو اسی لئے اُن کی حالت دیدنی ہے۔ ہر دَم موصوف پر یاس غلبہ رکھتی ہے۔ اکثر گنگناتے پائے گئے ہیں کہ ''کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے'' --- ہمارے ساتھ کہیں نکل کھڑے ہوں تو سرِ راہ ملنے والی مہ وشوں کے باعث سرد آہوں کا بازار گرم کئے رکھتے ہیں۔ اکثر ہم سے فرماتے ہیں کہ یار! تم شادی کر لو' اپنی تو ہونی نہیں اور جب تک ہم بات کی تہہ تک پہنچتے ہیں' وہ شیر بہادر رفو چکر ہو چکے ہوتے ہیں۔

اور یہ رہے ایک اور حرماں نصیب! یہ حضرت بے قراری و بے تابی میں نمبر ون ہیں۔ کسی عزیز رشتہ دار کی شادی ہو تو حضرت باقاعدہ سوگ مناتے ہیں اور شادی میں شرکت کا سوال ہی عبث ہے۔ کبھی کہیں جو کسی کے آنگن میں ''پھول'' کھلے تو سرد آہ کھینچ کر ہم سے مخاطب ہوتے ہیں۔

''یار! اب تک تم بھی نہ جانے کتنوں کے ہی چچا بن چکے ہوتے۔''

ایک بار موصوف پھنس گئے اور خوش فہمی دیکھئے کہ خیال یہ کرتے رہے کہ لڑکی پھنس گئی ہے۔ لڑکی بھی ایک حرافہ تھی۔ فون پر فون کرتی' شاید فون آپریٹر تھی اور ہمارے دوست کو دیوانہ بنائے رکھتی۔ یہاں سے سوال ہوتا کہ کب ملوگی؟ وہاں سے جواب آتا کہ جب تم کہوگے لیکن جب یہاں سے پروگرام طے کرنے کی بات چلتی تو دوسری طرف سے پروگرام کینسل کے جھگڑ چلنے لگتے کہ آج نہیں آ سکتی۔ اکثر کہا جاتا کہ پھر کبھی سہی --- آخر اِس روز روز کے جھنجھٹ نے دوست ہمارے کو دلیری پر اُکسایا اور موصوف جا پہنچے ایک روز اُس بلبل کے آشیانے پر لیکن بلبل کو دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا کیونکہ بلبل کے سب بال و پر جھڑ چکے تھے۔

اب آخر میں ایک ایسے صاحب کا ذکر آتا ہے جو کہ صاحبِ نکاح ہیں اور اِسی لئے کسی قدر غرور کے دائرے میں رہتے ہیں (اخلاق کے دائرے میں عموماً نہیں رہتے) تمام دوستوں میں اِک شان تمکنت سے بیٹھتے ہیں' دِلِ بے تاب کی بے تابی کو کبھی آشکار نہیں کرتے۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے سسرال یاترا کو جاتے ہیں لیکن جب ساس روڈ رولر کی طرح دندناتی ہے تو اُلٹے قدموں پلٹ آتے ہیں --- اکثر خدا سے ساس سسٹم پر شکوہ گو رہتے ہیں' سالوں کے معاملے بھی خدا سے خوش نہیں البتہ سالیوں کے معاملے میں خدا کے شکر گزار ہیں اور سُسر کے معاملے میں خدا سے درمیانی معاملہ رکھتے ہیں --- جناب کی منکوحہ نے بھی بڑی

چنچل طبیعت پائی ہے۔ اکثر بہانے بہانے کوئے یار میں آتی جاتی ہے' یعنی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی لیکن ہم جانتے ہیں کہ جب یہ آگ سرد پڑے گی اور پھر اِس زمین سے ''شگوفے'' پھوٹیں گے تب خود اِن دونوں کے سر بھی اکثر پھوٹیں گے--- کیوں' صاحبو! غلط تو نہیں کہتا میں؟

☆☆

پاکستانی ڈریسنگ روم

محمد کامران شہزاد، بھکر

پاکستانی کرکٹ ٹیم دُنیا میں جہاں بھی جاتی ہے' داستان چھوڑ آتی ہے۔ ٹیم کا ایک ایک کھلاڑی اتنا مشہور ہوتا ہے کہ جہاں بھی جاتے ہیں' کرکٹ کم اور آؤٹ ڈور سرگرمیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اِسی وجہ سے ٹیم کی کارکردگی سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ کچھ ڈریسنگ روم کی سرگرمیاں اور مناظر آپ کے سامنے پیشِ خدمت ہیں (یہ میرے تخیل کا کمال ہے)

بھارت کے خلاف ون ڈے میچ ہے۔ انضمام مختلف کھلاڑیوں کی منت سماجت کر رہے ہیں کہ وہ اوپننگ کرنے چلے جائیں۔ آخر شعیب ملک اور کامران اکمل نیم رضامندی سے پیڈ باندھتے ہیں' بلے سنبھالتے ہیں اور مرے مرے قدموں سے چل پڑتے ہیں۔ آخر پٹھان کا سامنا کرنا ہے' جس کی سوئنگ ہوتی گیندیں نخریلی لڑکی کی طرح ناز دِکھاتی گزر جاتی ہیں۔ انضمام دونوں کو رُخصت کر کے اگلی مہم کی پلاننگ کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ تیسری نمبر پر کھیلنے کے لئے یونس خان آج کل کافی منت سماجت کرتے ہیں۔

یار! تم چلے جانا' تمہاری پسندیدہ آئس کریم میں منگوا رکھوں گا۔''

انضمام حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے یونس خان کو یہ ''گرینڈ'' قسم کی آفر کرتے ہیں۔ اتنے میں شور ہوتا ہے اور کامران اکمل واپس آ جاتے ہیں۔ پٹھان کی اُٹھان کی تاب نہ لاتے ہوئے پہلا کھلاڑی میدان سے سر جھکائے' صفر کا تمغہ سجائے ڈریسنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔

''اصل میں مجھے باتھ روم کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور ایمپائر ظالم جن کی طرح میرے راستے میں حائل تھا۔ مجھے آسان راستہ یہی لگا کہ مَیں آؤٹ ہو کر واپس آ جاؤں۔'' کامران نے اپنی ''تکلیف بیتی'' بیان کی اور فوراً باتھ روم میں گھس گئے۔

میدان میں یونس خان اور پٹھان آمنے سامنے ہیں اور دوسری طرف آئس کریم کا کپ ہے۔ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔

''پٹھان سے تو بعد میں بھی نپٹا جا سکتا ہے مگر انضمام کے خرچ پر آئس کریم بار بار کہاں ملنے والی ہے؟''

یونس خان نے دِل و دماغ کے گٹھ جوڑ سے فیصلہ کیا اور دو تین بار آڑا ترچھا بلا ہوا میں گھمایا اور آئس کریم کے فراق میں واپس دوڑے آئے۔

دوسری جانب شعیب ملک ہیں۔ رزاق ڈریسنگ روم کے دروازے پر آ کر آواز لگاتے ہیں۔

''شعیب بھائی! حیدر آباد دکن سے آپ کے لئے فون ہے' بند کر دوں یا آپ آ رہے ہیں؟''

یہ سننا تھا کہ شعیب ملک دِل کے سامنے ہار گیا اور اپنی وکٹ پٹھان کی جھولی میں یوں ڈالی جیسے کوئی بھکاری کو ہزار کا نوٹ دے کر اکڑتا ہوا چم چم کرتی کار میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا--- آخر ہونے والی گھر والی کا فون ہو اور آدمی اُس کی قدر نہ کرے' یہ کہاں کا انصاف ہے؟

محمد یوسف اور انضمام وکٹ پر ہیں' خوب جم کر کھیل رہے ہیں کہ مشتاق احمد ڈریسنگ روم کے دروازے پر نمودار ہوتے ہیں اور کچھ اِن الفاظ کے ساتھ بلند آواز میں گویا ہوتے ہیں۔

''انضمام بھائی! یہ شعیب اختر اور آفریدی نے ڈریسنگ روم کو نائٹ کلب بنایا ہوا ہے' بلند آواز میں انگلش گانے بجا کر ناچ رہے ہیں۔ ذرا جلدی آؤ تا کہ اِن پر قابو پایا جا سکے ورنہ اِسلام خطرے میں ہے۔''

یہ سن کر انضمام کے اندر کا مسلمان تڑپ جاتا ہے اور اِسی تڑپ میں ہر بجن اِن کو گھیر کر اِسلام بچانے کے لئے واپس بھیج دیتا ہے۔

ڈریسنگ روم میں ماحول چینج ہو چکا ہے۔ کھلاڑی سر پر ٹوپیاں لئے ہاتھوں میں تسبیح رولتے نظر آئے' انضمام کا رعب اور دبدبہ کارگر رہا۔

آفریدی میدان میں جا کر انڈین کھلاڑیوں کے ساتھ قصائی بکرے والا سلوک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ باؤلر اتنے پست ہو جاتے ہیں کہ حوصلہ ہار جاتے ہیں۔ انڈین ڈریسنگ روم میں ہنگامی میٹنگ ہوتی ہے' سازش بنی جاتی ہے' فوراً رابطہ کیا جاتا ہے۔ دو کمپنیوں کے نمائندے پاکستان ڈریسنگ روم میں داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''آفریدی سے ہم نے فوراً ماڈلنگ کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایک کروڑ کا معاہدہ ہے' اگر ذرا دیر ہوئی تو یہ معاہدہ آسٹریلوی لے اُڑیں گے۔''

آفریدی تک خبر پہنچائی جاتی ہے اور وہ فوراً سارا کام کاج بھول بھلا کر واپسی کی راہ لیتے ہیں اور معاہدے کی شرط و شرائط پر بحث و

مباحثے میں گم ہو جاتے ہیں۔
شعیب اختر نے بھی میدان میں جا کر باؤلروں کو آڑے ہاتھوں لیا تو اُس کے ساتھ بھی ماڈلنگ کی آفر کرنے کچھ لوگ آئے اور انہوں یہ بھی آفر کی کہ ہم شعیب کا غیر ملکی ماہر سرجنوں سے علاج بھی کرائیں گے۔ یوں شعیب اختر کو رام کرلیا جاتا ہے۔
اِن مناظر اور واقعات سے میں جو کچھ ثابت کرنا چاہتا ہوں' وہ آپ بھی سمجھتے ہیں اور میں بھی اس لئے زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ "سمجھدار کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے"--- اب میرے پاس الفاظ ختم ہو رہے ہیں اس لئے کہ وقت ہو رہا ہے کہ میں یہ باتیں ختم کروں اور پڑھنے والوں کو بوریت کے چنگل سے آزادی بخشوں۔

☆☆

قرض، مرض اور پٹائی

سیدہ عابدہ ادریس، ملتان

آج کے دِن کا آغاز اتنا ہنگامہ خیز تھا کہ مجھے لگا جیسے میں صوبہ تورا بورا میں آ گرا ہوں۔ قسمت کے تابڑ توڑ حملوں نے میری ہونق شکل کو مزید مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ صبح ہی صبح میری سینڈو دودھ والے سے تلخ کلامی ہوئی' صرف اتنی سی بات پر کہ میں نے اُس کے تین مہینے کے دودھ کا بل دینا تھا حالانکہ وہ دودھ اتنا پتلا تھا کہ کئی مرتبہ میونسپل کے لگے نلکوں میں سے جب پانی نہیں آتا تھا تو مجھے اِس نام نہاد دودھ سے منہ دھو کر آفس جانا پڑتا تھا جبکہ سینڈو دودھ والا بضد تھا کہ وہ مجھے روزانہ اتنا خالص دودھ صرف 32 روپے کلو دے کر جاتا ہے لہٰذا اِس کا بل ادا کیا جائے---
بہر حال' دودھ والا اِس دھمکی کے ساتھ چلا گیا کہ اگر دو دن تک اُسے کے پیسے نہ دیئے گئے تو وہ اور اُس کی بھینسیں میرے خلاف ایک احتجاجی مہم کا آغاز کر دیں گے جس میں سینڈو دودھ والا نعرے لگائے گا اور بھینسیں میرے دروازے کے آگے گوبر کریں گی۔
اُس سے نمٹ کر میں نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور ناشتے کے لئے گلی کی نکڑ پر موجود مسکین خان کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مسکین خان کے چہرے پر مجھے دیکھ کر مزید مسکینی چھا گئی کیونکہ اُس کا بھی میں نے قرضہ دینا تھا۔ میں اُسے نظرانداز کرتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا اور سامنے ٹیبل پر پھرتے ہوئے مکوڑوں کو آرام سے پکڑ کر نیچے چھوڑا کیونکہ اگر میں اُنہیں بدتمیزی سے نیچے پھینکتا تو وہ میری پینٹ میں گھس کر قابل اعتراض جگہوں پر کاٹتے لہٰذا اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ مسکین خان مجھ سے لاتعلق بیٹھا اتنی اِنہماک سے اخبار پڑھ رہا تھا کہ جیسے حکومت نے تمام ہوٹلوں کو سبسڈی دینے کا فیصلہ کر دیا ہے اور اُن ہوٹلوں میں مسکین خان ولد یتیم خان کے ہوٹل "دارالامان" کا نام بھی جلی حروف میں لکھا ہے--- آخر میری تیسری آواز پر اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا اور غصے میں اپنے منہ سے نسوار نکال کر پھینکی جو کہ دائیں طرف پڑے ہوئے دو دِن کے باسی سالن کے دیگچے میں جا گری۔ مسکین خان نے جلدی جلدی چمچ چلایا۔ نسوار نکلنے کی بجائے اچھی طرح مکس ہو گئی اور اِس خوف کے پیش نظر کہ کہیں میں اُس کے گنتی کے چند گاہکوں کو یہ نسوار والی حرکت نہ بتا دوں' اُس نے مجھے جلدی سے ناشتہ پہنچایا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں نے میز پر پڑے اخبار کو اُٹھایا' اُس سے ہاتھ صاف کئے اور اُسی کو پڑے ہوئے باہر کی جانب روانہ ہو گیا۔
بس آنے میں ابھی تھوڑی دیر تھی۔ مجھے کھڑے ہوئے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک عدد برقع پوش خاتون اچانک ہی میرے ساتھ اتنا جڑ کر کھڑی ہو گئی کہ جیسے میں اور وہ جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ میں نے گھبرا کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس نے اچانک اپنا ہاتھ اِس طرح آگے کیا کہ میری پینٹ گیلی ہوتے ہوتے رہ گئی۔
"اے بابو! اللہ کے نام پر کچھ دے دے۔ دیکھ میں بیمار ہوں۔"
اُس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ایکسرے کو اِس طرح گھمایا جیسے میٹرکس فلم میں ولن ریوالور کو گھماتا ہے۔ میری سانس جو اوپر چڑھی ہوئی تھی' یکدم نیچے آ گئی۔
"معاف کرو مائی---!" میں نے کمال بے نیازی سے جواب دیا۔
"دے دے بابو! اللہ کے نام پر دے دے۔"
اُس نے ایسے چلانا شروع کیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ شاید میں نے اِس کا بھی اُدھار دینا ہے۔
"اچھا اچھا یہ ایکسرے دِکھاؤ۔"
میں نے ایکسرے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن ہائے ری قسمت! ایکسرے تو کیا ہاتھ آنا تھا' اُس فقیرنی کی کلائی ہاتھ میں آ گئی۔ چٹاخ کی بھرپور آواز میرے دماغ کو سنسناتی ہوئی کانوں سے باہر نکل گئی۔
"اے بابو! تینے شرم نہ آوے' مارے کو گندی عورت سمجھے ہے؟--- رے چھجو! بلا رے اپنے بابو کو۔"
اور اُس کے بعد وہ چھجو جو کسی کھمبے کے نیچے کھڑا تھا' کسی الہ دین

کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ اُس کے بعد چھجو' مجو' اجو اور نہ جانے کون کون سے ''بجو'' نے میری اس طرح دُھلائی کی کہ اگر دھوبی بھی دیکھ لیتے تو وہ اُن کی کارکردگی سے متاثر ہو کر اپنے ہاں ملازم رکھ لیتے---اوپر سے ستم ظریفی دیکھئے کہ میرے محلے دار اتنے انہماک سے میری پٹائی دیکھ رہے تھے کہ اگر اُنہوں نے یہ ''فری سٹائل پٹائی'' میچ نہ دیکھا تو اُن پر جنت حرام کی دی جائے گی۔

بہرحال' اچھی طرح مالش کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو مَیں نے خود کو وہیں پڑے پایا (آپ سمجھے ہوں گے کہ ہسپتال میں) اپنے ٹوٹے وجود کو گھسیٹتا ہوا مَیں گھر پہنچا تو دیکھا وہاں لوگوں کا رش لگا ہوا ہے۔ مَیں جلدی جلدی آگے پہنچا تو گھر کا سامان اِس طرح بکھرا ہوا تھا جیسے کسی بیوہ کے بال اپنے تیسرے شوہر کی وفات پر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

''دیکھا آج اِس نے ایک غریب عورت کی بددُعا لی اور آج ہی اِس کے گھر چوری ہو گئی۔ توبہ' توبہ! جیسی کرنی ویسی بھرنی---اللہ غریب کی بددُعا سے بچائے۔ چلو' چلو اپنے اپنے گھروں کو چلو' کہیں اِس کا عذاب ہمارے سر نہ پڑ جائے۔''

یہ کہتے ہوئے محلے والے اپنی اپنی راہ کو ہو لیئے اور مَیں گھر کی دہلیز پر ڈھے گیا۔

☆☆

نیکی کر جوتے کھا

ہارون حسرت جالندھری، سرگودھا

جی ہاں' اصل کہاوت تو یونہی ہے کہ نیکی کر دریا میں ڈال مگر میرے جاننے والے ایک بزرگ ہیں' کہتے ہیں کہ نیکی کر کے آخر دریا ہی میں کیوں ڈالی جائے' اگر کسی کے گھر کے قریب دریا نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ مَیں نے کہا۔

''بزرگو! ضروری نہیں کہ دریا میں ہی ڈالی جائے' آپ پانی کے کسی اور منبع مثلاً جھیل' سمندر' جوہڑ' تالاب اور گندے نالے وغیرہ میں بھی ڈال سکتے ہیں۔ ان میں سے جو چیز آپ کے گھر کے قریب پڑتی ہے' اسی میں آپ ڈال دیا کریں لیکن نیکی کیا ضرور کریں۔''

کہنے لگے۔ ''آخر پانی میں ہی کیوں ڈالیں' ردی کی ٹوکری میں بھی ڈالنے کی اجازت ہونی چاہئے' ہمسایوں کے مکان پر پھینکنے میں بھی کیا حرج ہے؟ مطلب تو نیکی کو ضائع کرنا ہے' کسی بھی طریقے سے ضائع ہو سکتی ہے۔''

مَیں نے کہا۔ ''ضائع کرنے کا سب سے آسان طریقہ وہی ہے جسے آج کل سو فیصد لوگ اپنائے ہوئے ہیں' یعنی کہ نیکی کی اور پھر ہر موڑ پر جتاتے رہے' نیکی خود بخود ضائع ہو جائے گی۔''

بزرگ بھی اپنی بات پر ڈٹے رہے اور بولے۔

''بیٹا! ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے' آج کل تو دور ہی ایسا آگیا ہے کہ نیکی کرو تو خود بخود ہی ضائع ہو جاتی ہے' ہندوؤں کی طرح گنگا میں ڈالنے کی ضرورت نہیں رہتی---اب میری مثال دیکھو' مَیں خاندان میں سب سے بڑا تھا۔ والد صاحب ہمارے بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ مَیں نے بڑا ہونے کے ناطے سے تعلیم کو خیرباد کہا اور پکوڑوں کی ریڑھی لگا کر اپنے چھوٹے بھائیوں کو تعلیم دلوائی۔ اب جبکہ سب اپنے پیروں پر کھڑے ہیں تو کہتے پھرتے ہیں کہ والد کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نے ہمارا حصہ بھی غصب کر لیا ہے---دراصل' بیٹا! آج کل یہ کہاوت اِس طرح ہونی چاہئے کہ ''نیکی کر جوتے کھا''۔

حقیقت تو حقیقت ہی رہتی ہے مگر بزرگ کی بات کو مَیں جھٹلا نہیں سکا کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایسی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

ہمارا مذہب ہمیں نیکی کی تعلیم دیتا ہے مگر ہمارے معاشرے میں لوٹنے کے کچھ ایسے طریقے فروغ پا گئے ہیں کہ ہر کوئی نیکی سے کنی کترانے لگا ہے۔ مثال کے طور پر سڑک پر خود کو بے ہوش ظاہر کر کے لیٹ جانا۔ کسی نیک شخص کا بے ہوش آدمی دیکھ کر نیچے اُترنا اور پھر اردگرد سے اِس کے ساتھیوں کا آ کر پستول تان کر گاڑی چھین لینا۔ ہم نے جتنی ترقی دھوکہ فراڈ اور لوٹ کھسوٹ میں کی ہے' اگر اتنی ترقی ٹیکنالوجی کے میدان میں کرتے تو آج ہم جرمنی' فرانس وغیرہ کے ہم پلہ ہوتے۔ وہ لوگ اور تھے جو جوتے کھا کر بھی نیکی کرتے تھے' اب تو ایسے فقیر کو خبطی اور پاگل ہی کہا جائے گا جو ڈوبتے ہوئے بچھو کو پکڑے اور بار بار ہاتھ پر ڈنگ کھائے اور تو اور ڈاکٹر قدیر نے یورپ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ نیکی کی لیکن اِن کی نیکی کا جو نتیجہ ہم نے دیا' وہ میرے آج کے موضوع کے بالکل عین مطابق ہے۔ کیا ایسی صورت میں کوئی اور ہمارے ساتھ نیکی کرنے کا سوچے گا؟

میرے ایک جاننے والے امجد علی کو نیکی کرنے کا بہت شوق تھا۔ کبھی کبھار تو مردوں اور ضعیف العمر افراد کے ساتھ بھی نیکی کر دیا کرتے تھے لیکن زیادہ تر نیکیاں عورتوں کے ساتھ ہی کرتے تھے۔ عورت کو مصیبت میں دیکھ کر تو وہ ایسے ہی کڑھتا تھا جیسے علامہ اقبالؒ اپنی قوم کو غلامی میں دیکھ کر کڑھتے تھے۔ جب کئی دِن تک انہیں کوئی عورت مصیبت میں نظر نہ آتی تو وہ پریشان ہو جاتے اور دُعائیں مانگنے لگتے---یا

رَب! کسی عورت کو تو مصیبت میں گرفتار کر دے---عورتوں کے ساتھ نیکی کرنے کا جذبہ اِس نے انڈین فلموں سے حاصل کیا تھا۔ انڈین فلموں میں عموماً پہلے ایک لڑکا' لڑکی سے شرارتیں کرتا ہے' لڑکی اِسے لفٹ نہیں کراتی۔ آخر کار لڑکی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے اور ایسے آڑے وقت میں وہی لڑکا اُس کے کام آتا ہے جس پر وہ لڑکی نادم ہوتی ہے اور اُس لڑکی سے سچے دِل سے محبت شروع کر دیتی ہے۔ جتنا سین میں نے بیان کیا ہے' یہ تو ہر فلم میں ہوتا ہے چاہے انڈین ہو یا پاکستانی---امجد میاں بھی ایسے ہی موقعوں کی تاڑ میں رہتے تھے۔ شریف کمہار کی نوجوان بیٹی عاشی اب تک کسی ایسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی کہ جہاں امجد اُس کے کام آکر ہیرو کا درجہ حاصل کرتے۔ عاشی ایک دِن صبح سویرے اپنی حویلی سے اپنی بھینسوں کا گوبر اُٹھا رہی تھی۔ امجد باہر موقع کی تلاش میں تھے۔ عاشی نے گوبر کی ٹوکری مکمل طور پر گوبر سے بھر لی۔ اب تن تنہا اِسے اُٹھانا عاشی کے بس سے باہر تھا۔ وہ حویلی کے گیٹ پر کھڑی ہو کر اِدھر اُدھر کسی عورت کا انتظار کر رہی تھی۔ امجد نے موقع غنیمت جانا اور خوشی سے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''چلو' عاشی! مَیں تمہیں ٹوکری اُٹھواتا ہوں۔''

اتنا کہتے ہوئے وہ عاشی کا رسپانس دیکھے بغیر حویلی میں داخل ہو گئے۔ عاشی بھی مجبوراً ٹوکری اُٹھوانے کے لئے تیار ہو گئی۔ ابھی ٹوکری سر تک نہیں پہنچی تھی کہ حویلی کے گیٹ سے شریف کمہار اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی امجد کی جان نکل گئی اور گھبراہٹ میں ٹوکری پر گرفت کمزور پڑ گئی۔ جس کے نتیجے میں سارا گوبر امجد پر گرا۔ گوبر سے شرابور امجد' شریف کمہار کے خطرناک تیور دیکھ کر ابھی بھاگنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ شریف کمہار نے اُنہیں پکڑ لیا اور پھر اِسی ہنٹر سے اُس کی پٹائی کی جس سے شریف کمہار سارا دِن اپنے گدھے اور خچروں کی کرتا تھا۔ شریف کمہار سے ہنٹر کھانے کے بعد نیکی کا جذبہ کچھ دن تک امجد کے اندر ہی گھوڑے بیچ کر سو گیا لیکن ''جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے'' کے مصداق کچھ ہی دِنوں بعد امجد کا جذبہ دوبارہ جاگ اُٹھا اور وہ پھر سے مصیبت میں گرفتار کسی عورت کی تلاش میں رہنے لگے۔

ایک دِن وہ سائیکل پر سوار شہر سے گاؤں آ رہے تھے۔ جب وہ گاؤں کے سٹاپ سے پکی سڑک چھوڑ کر پگڈنڈی پر آئے تو اِسے سامنے ایک نقاب پوش عورت دو بچوں سمیت گاؤں کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کے اندر پوشیدہ خدمتِ خلق بلکہ ''خدمتِ زن'' کے جراثیم چھلانگ لگا کر اُٹھے اور اُسے خدمتِ زن پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ وہ دوشیزاؤں سے نیکی کیا کرتے تھے مگر کئی دِنوں سے نیکی کرنے کے لئے کوئی دوشیزہ میسر نہ آئی تو اُنہوں نے دو بچوں کی ماں کے ساتھ ہی نیکی کرنے کا ارادہ کر لیا اور دِل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ ''دو بچے ہیں تو کیا ہوا' آخر کو ہے تو عورت ہی''---اُنہوں نے عورت کو اپنے پیچھے اور دونوں بچوں کو اپنے آگے سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا لیا اور ''بہارو پھول برساؤ' میرا محبوب آیا ہے'' گنگناتا ہوا دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد سائیکل ''کڑک'' کی آواز کے ساتھ رُک گئی اور آگے بیٹھے ہوئے ایک بچے کی چیخوں نے اُسے واپس اپنی دُنیا میں آنے پر مجبور کر دیا۔ بچے کا پیر خون سے رنگین دیکھ کر اُن کی جان نکل گئی۔ دراصل بچے کا پاؤں سائیکل کے فرنٹ وہیل میں آ کر زخمی ہو چکا تھا۔

''باجی! آپ نے کس کے گھر جانا تھا؟'' اُس نے جان چھڑانے کے لئے سوال کیا۔

''پہلے تو بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلو' اِس کے بعد آگے کی سوچیں گے۔ میرے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ بچے کا پاؤں تم نے زخمی کیا ہے' علاج بھی تم اپنے پیسوں سے کرواؤ گے' سمجھے!''

عورت نے تنک کر کہا تو امجد کا رنگ فق پڑ گیا۔

''دیکھئے' باجی---!'' امجد نیچے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مَیں نے تو آپ کو پیدل دیکھ کر سائیکل پر سوار کر لیا اور آپ میری اِس نیکی---''

''نیکی کے بچے! سیدھی طرح ڈاکٹر کے پاس بچے کو لے جاتے ہو یا ابھی شور مچاؤں؟''

عورت نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو وہ مجبوراً بچے کو لے کر ڈاکٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اِس کے بعد پانچ ہزار روپے دے کر اُن کی جان چھوٹی کیونکہ بچے کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ اب کے امجد نے نیکی کرنے سے سچے دِل سے توبہ کر لی ہے۔

رمضان سبزی والا بھی عورت سے نیکی کرنے کے ذِکر پر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ اِس کا قول ہے کہ ''بے شک عورت تمہارے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے پر اُس سے نیکی نہ کرو''---اصل میں رمضان سبزی والا بھی بے قصور ہے۔ ایک دِن وہ صبح سویرے سبزی منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ اپنے گاؤں کی حدود سے نکل کر وہ دو تین گاؤں کراس کر کے سرگودھا شہر کی حدود میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اُسے ایک ہینڈسم لڑکی بغل میں پرس دبائے' آنکھوں پر خوبصورت چشمہ لگائے سڑک پر جاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اِس وقت کنوارا ہی تھا اور صبح سویرے کا وقت ہونے کی وجہ سے سڑک بھی سنسان ہی تھی۔ اِس لڑکی کو

دیکھ کر رمضان کے دِل کی دھڑکن اتنی تیز ہوئی کہ ایک منٹ میں 72 دفعہ دھڑکنے کی بجائے 150 دفعہ دھڑکنا شروع ہو گئی۔ رمضان کو انگڑائیاں سی آنے لگی۔ دفعتاً اُس کے دِل میں یہ خواہش جاگی کہ کاش! لڑکی اِس سے لفٹ مانگ لے۔ زہے مقدر، وہ لمحہ قبولیت کا تھا۔ جونہی وہ لڑکی کے برابر میں پہنچا تو لڑکی نے کہا۔

''سنئے' مجھے بھی ذرا لاری اڈے تک ڈراپ کر دیجئے۔''

''اندھا کیا چاہے دو آنکھیں'' کے مصداق رمضان نے فوراً اُسے سائیکل پر سوار کر لیا۔ اِس کی سائیکل ٹوٹی پھوٹی تھی۔ رمضان لڑکی کو لفٹ دے کر خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ وہ اِردگرد کے ماحول سے بے نیاز مسعود رانا کا گیت ''جھوم اے دِل کہ تیرا جان بہار آئے گا'' گنگناتا ہوا لاری اڈے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ تصوّر ہی تصوّر میں خود کو کبھی اُس لڑکی کے ساتھ پھولوں میں' کبھی جھولے پر' کبھی پارک میں اور کبھی آئسکریم کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ خیالوں کی دُنیا سے حقیقت میں اِس وقت آیا جب دو موٹے تازے پہلوانوں نے اِسے گریبان سے آ بوچا اور فٹ بال کی طرح اِس سے کھیلنے لگے۔ وہ لڑکی کی نظروں میں ہیرو بننے کے لئے کبھی کبھار ایک آدھ تھپڑ کسی پہلوان کے مار دیتا اور پھر سکون سے مار کھاتا رہا اور چلاتا رہا کہ مجھے میرا جرم بتایا جائے۔ جب اِس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے اور وہ کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا تو پہلوانوں نے پٹائی کا سلسلہ بند کیا اور لڑکی کا لکھا ہوا رُقعہ جو وہ آتے وقت گھر والوں کے لئے چھوڑ آئی تھی' با آواز بلند پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔

''آداب کے بعد واضح ہو کہ مَیں اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ فرار ہو رہی ہوں' دوبارہ کبھی اِس گھر کی دہلیز پر نہ آؤں گی بلکہ کورٹ میرج کر لوں گی۔''

''یہ ہے تمہارا جرم۔'' ایک پہلوان نے غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''مگر' بھائی جان! میری بات تو سنیں---'' لڑکی نے پہلی دفعہ رمضان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے زبان کھولی۔ ''میرا آشنا تو لاری اڈے پر میرا انتظار کر رہا ہے' یہ تو بیچارا راہگیر تھا جس نے مجھے عورت ذات اور کمزور سمجھ کر لفٹ دی تھی اور آپ نے اِس کا یہ حال کر دیا ہے۔''

''چلو اِس کے ساتھ تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا' اب بتاؤ اصل آشنا کون ہے؟''

ایک پہلوان نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر لاری اڈے کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔ اِن کے جانے کے بعد کچھ رحم دِل افراد نے رمضان کو چارپائی پر ڈال کر گھر پہنچایا۔ اب آپ ہی بتائیے' بیچارے رمضان کا کیا قصور ہے؟

عارف بھائی میرے بہنوئی ہیں اور فیصل آباد میں سکونت پذیر ہیں۔ عارف بھائی کا شکار بھی ''رحم دِل'' لوگوں میں ہوتا ہے' وہ بھی کبھی کبھار نیکی کرنے کے موڈ میں آ جاتے ہیں۔ عارف بھائی اتنے سادہ بھی نہیں ہیں کیونکہ وہ مسقط میں روزگار کے سلسلے میں رہ چکے ہیں مگر جب تقدیر اپنے کھیل دِکھاتی ہے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔

ایک دِن عارف بھائی گھر سے سائیکل پر سوار ہو کر ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ جڑانوالہ روڈ پر دو آدمی نظر آئے۔ دونوں کے پاس ایک موٹر سائیکل تھی۔ جونہی دونوں آدمیوں نے عارف بھائی کے پاس نئی چمکتی ہوئی سائیکل دیکھی تو اِن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اُنہوں نے سائیکل حاصل کرنے کے متعلق پلاننگ کی اور پھر ایک آدمی نے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر عارف بھائی سے کہا۔

''پلیز' بھائی صاحب! تھوڑی سی مدد چاہئے۔''

''کیا---؟'' عارف بھائی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے رُک کر کہا۔

''دراصل اِن بھائی صاحب کا پاؤں زخمی ہے---'' اُس نے نیچے کھڑے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور موٹر سائیکل سٹارٹ نہیں ہو رہی۔ آپ کو تکلیف تو ہو گی مگر مَیں آپ کا شکرگزار ہوں گا اگر آپ ذرا موٹر سائیکل کو دھکا لگا دیں تو۔''

عارف بھائی کے اندر نیکی کے جراثیم غیرت میں آ گئے اور وہ سائیکل کو سڑک پر کھڑا کر کے دھکا لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دھکا لگاتے لگاتے موٹر سائیکل سوار اور عارف بھائی کوئی آدھا کلومیٹر دور چلے گئے جبکہ پاؤں زخمی والے صاحب عارف بھائی کے سائیکل کے پاس کھڑے رہے۔ جب موٹر سائیکل سٹارٹ ہوئی تو عارف بھائی اپنے سائیکل کی طرف لوٹے لیکن وہاں خالی سڑک اِن کا منہ چڑھا رہی تھی۔ زخمی پاؤں والے صاحب شاید پاؤں زخمی ہونے کے باوجود عارف بھائی کی سائیکل لے اُڑے تھے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اگر کوئی موٹر سائیکل کو دھکا لگانے کا کہے تو دھکا لگا دینا چاہئے یا نہیں؟

خاور علی ایک ماہر تیراک ہیں مگر نیکی کرنے کے نام پر وہ بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ ہوا یوں تھا کہ ایک دِن وہ اپنی بائیک پر سوار اپنے کسی عزیز کو ملنے جا رہے تھے۔ جب وہ رستے میں بڑی نہر کے پل پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ وہاں موجود ہیں اور شور مچا رہے ہیں کہ ''آنٹی نازیہ

نے نہر میں چھلانگ لگ دی ہے' بچاؤ بچاؤ''--- خاور علی پڑھے لکھے اور سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر جاب کرتے تھے اور تیراکی اِن کا شوق تھا۔ اگر عورت کی جگہ کوئی مرد بھی خودکشی کی غرض سے نہر میں کود جاتا تو بھی وہ اِسے بچانے کے لئے ضرور نہر میں کود جاتے۔ چونکہ وہ ماہر تیراک تھے لہٰذا کچھ ہی دیر میں اُس نے نازیہ کو پکڑ لیا اور بحفاظت کنارے تک لے آئے۔ اتنی دیر میں نازیہ کے سارے رشتہ دار اور گاؤں کے دوسرے لوگ بھی پل پر پہنچ چکے تھے۔ خاور علی نے نازیہ کو باہر نکال لیا لیکن وہ بے ہوش تھی۔ خاور علی نے اِس کے رشتے داروں کی اجازت سے اِسے زمین پر سیدھا لٹایا اور پیٹ پر مخصوص طریقے سے دباؤ ڈالنے لگے تاکہ پیٹ کے اندر جانے والا پانی باہر نکل آئے اور نازیہ کی جان بچ جائے۔ اُن کی اِس تدبیر سے نازیہ کے پیٹ کا کافی سارا پانی منہ کے راستے باہر آ گیا۔ اتنا کام کرنے کے بعد خاور علی کو خوش فہمی ہوگئی تھی کہ نازیہ کے سارے رشتہ دار' خصوصی طور پر والدین اِس کے بہت بہت شکر گزار ہوں گے اور اِسے جانے نہیں دیں گے بلکہ اِس کی خوب خدمت کریں گے لیکن سب کچھ اُلٹ ہوگیا۔ خاور علی بائیک پر چڑھنے لگے تو نازیہ کے والد نے اُن کو روک لیا اور کہا۔

''میاں! جاتے کہاں ہو؟ جس طرح تم نے میری بیٹی کو سینے سے لگا کر بازوؤں میں سمیٹ کر باہر نکالا ہے اور جس طرح اِس کے جسم پر دباؤ ڈال کر چسکے لیتے رہے ہو' کیا اب کوئی دوسرا نوجوان اِس سے شادی پر تیار ہوگا؟---میاں! تمہیں اِس سے شادی کرنا ہوگی۔''

خاور علی نے جب غور سے زمین پر لیٹی ہوئی نازیہ کو دیکھا تو اُنہیں چکر سے آنے لگے۔ کالی رنگت' ایک آنکھ سے کانی' موٹے موٹے ہونٹ اور باہر کو جھانکتے ہوئے دانت دیکھ کر خاور علی کو گھن آنے لگی۔ دراصل نازیہ کی خودکشی کی اصل وجہ بھی یہی تھی کہ اِسے نہ تو کوئی اِس کا کزن قبول کرتا تھا اور نہ ہی کوئی غیر' رشتے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بالوں میں سفیدی آنے لگی تھی اور اب اِس نے مایوس ہوکر خودکشی کا سوچا تھا۔ اِس کی جان بھی بچ گئی اور ایک اچھے گھر کے چشم و چراغ کا رشتہ بھی خود چل کر اِس کے پاس آ گیا تھا۔ خاور علی اِس رشتے سے صاف انکاری ہوگئے تو نازیہ کے رشتہ دار اِنہیں پکڑ کر گاؤں میں لے گئے اور نظر بند کر لیا۔ اِن کا مطالبہ تھا کہ نازیہ سے شادی کرو گے تو نجات ملے گی۔ آخر کار کافی دِنوں بعد پولیس نے اِسے بازیاب کرایا۔ اب اگر اُسے دریا میں لڑکی ڈوبتی نظر آئے تو اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ اُسے مزید گہرے پانی میں دھکا دے دیا جائے۔ کیا خاور علی کی سوچ ایسی ہونی چاہئے؟

ابھی کل کی بات ہے کہ مَیں اپنی سائیکل پر سوار 49 ٹیل سے کچھ آگے جا رہا تھا۔ سڑک کی سائیڈ پر کچھ مرغیاں دانہ دنکا چک رہی تھیں۔ ساتھ والے مکان سے ایک مرغا نکلا۔ مرغے کی نظروں سے مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ اِس کے دِل میں بُرائی کے جراثیم کلبلا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اِرادے کو عملی پاجامہ پہنانے کی غرض سے ایک مرغی کے پیچھے دوڑا۔ اب مرغی آگے آگے اور مرغا پیچھے پیچھے۔ قدرت بعض اوقات موقع پر جرم کی سزا دے دیتی ہے' مرغے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مرغی کے عشق میں اندھا ہو کر ایک موٹر سائیکل سے ٹکرایا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میرے اندر کے شاعر سے مرغے کا یوں تڑپنا دیکھا نہ گیا۔ موٹر سائیکل والا تو مرغے کو زخمی کرنے کے بعد رفو چکر ہوگیا مگر مَیں نے ترس کھا کر مرغے کو اُٹھایا اور قریبی گڑھے میں موجود پانی پلایا۔ اِسی اثنا میں ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی اور مرغے کو یوں دیکھنے لگی جیسے یہ مرغا اِس کا ہو۔ مَیں نے اُس کو مرغ پکڑانا چاہا اور دِل ہی دِل میں کچھ دُعاؤں کا طالب بھی ہوا مگر بڑھیا نے مرغی پکڑنے کے لئے اپنے ہاتھ آگے نہ بڑھائے اور مجھ پر برس پڑی۔

''اندھے ہو کیا' دیکھ کر سائیکل نہیں چلا سکتے؟ پورے دو سو کا مرغ تھا میرا' ایک روپیہ بھی کم نہ لوں گی۔''

بڑھیا نے بیچ بازار نیا ہنگامہ شروع کر دیا۔ خدا بھلا کرے اِن چند شریف آدمیوں کا جو موقع کے گواہ تھے' اُنہوں نے خلوص نیت سے میرے حق میں گواہی دی ورنہ تو آج کل کوئی آنکھوں دیکھی چیز کی بھی گواہی نہیں دیتا---بہر حال' گواہی کے بعد بڑھیا نے لٹکے ہوئے منہ سے مجھ سے اپنا مرغا لیا اور بغیر مجھے دُعا دیئے وہاں سے چل پڑی۔ موقع کے سارے گواہ کہنے لگے کہ مرغے کو ہم بھی اُٹھا سکتے تھے لیکن اِسی وجہ سے نہیں اُٹھایا کہ نیکی کر کے جوتے بھی کھانے پڑیں گے۔

مَیں جڑانوالہ روڈ فیصل آباد پر بس سے اُتر کر اپنی سسٹر کے گھر کی طرف پیدل رواں تھا۔ میرا گزر ایک تنگ گلی میں سے ہوا جس کے دونوں جانب رہائشی مکانات تھے۔ مَیں ایک گھر کے قریب سے گزرنے لگا تو دفعتاً کھڑکی کھلی اور اِس میں سے ایک ''چاند چہرہ'' برآمد ہوا۔ جی ہاں ''چاند چہرہ'' کیونکہ جس طرح چاند پر داغ ہوتے ہیں' اِسی طرح اُس کے چہرے پر بھی کیل مہاسوں کے لاتعداد داغ موجود تھے اِسی لیے مَیں اُسے چاند سے تشبیہ دے رہا ہوں ورنہ صاف چہرے والی حسینہ کو ریاضی کی نوٹ بک کے صفحے سے تشبیہ دیا کرتا ہوں۔ ''چاند چہرے'' نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر! ذرا اِس دروازے پر دستک تو دینا میری فرینڈ کا گھر ہے' مَیں نے بات کرنی ہے۔ اگر مَیں باہر سے آؤں تو مجھے لمبا چکر پڑتا ہے۔

پلیز' دستک دے دیجئے' نا!''

اُس کے لہجے میں دُنیا جہان کی شرافت دیکھ کر مَیں نے سوچا کہ چلو' دستک دینے میں میرا کون سا خرچہ ہوتا ہے۔ مَیں نے دستک دی تو بغیر ایک سیکنڈ کی تاخیر سے دروازہ کھل گیا اور جس طرح بھڑوں کے چھتے سے بھڑیں برآمد ہوتی ہیں' اسی طرح دروازے سے لڑکیاں ہی لڑکیاں نکلنا شروع ہوگئیں۔ ان کا سوال تھا کہ آپ نے دروازے پر دستک کیوں دی۔ مَیں نے جواب میں کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تو وہاں سے وہ ''چاند چہرہ'' بھی غائب تھا۔ مَیں سمجھ گیا کہ وہ ''چاند چہرہ'' بھی اِن کا ساتھی تھا--- مجھے اس کے داغدار چہرے پر بہت غصہ آیا۔ اگر مَیں بھاگنے کی کوشش کرتا تو اِن کا شور وغل مجھے محلے والوں سے پٹوانے کے لئے کافی تھا لہٰذا مجھے اِن کا مطالبہ مان کر جان چھڑانے پڑی۔ مطالبے کی تفصیل بیان کر کے مَیں صفحات ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال' آئندہ سے مَیں نے اِس نیکی سے بھی توبہ کرلی۔

''بھئی' میرا مضمون پڑھ کر نیکی کرنے سے توبہ ہرگز نہ کیجئے گا بلکہ نیکی کا سلسلہ جاری رکھئے گا البتہ احتیاط کا دامن تھام کر نیکی کیجئے گا۔ ایسا نہ ہو آپ کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہوجائیں۔ ☆☆

سجاد باجی

✿ وقار چاند

یقیناً عنوان پڑھ کر آپ چونکیں ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے یہ کیا عنوان ہوا؟ چلیں آپ ''سجاد باجی' نہ کہیں ''باجی سجاد'' کہہ لیں۔ یہ بھی اچھا نہ لگے تو آپی کہہ لیں۔ اگر کوئی چاند کی چکرم سیما جان ہوسکتا ہے تو ہماری ہیروئن بھی ساجد باجی ہوسکتی ہے۔

سجاد باجی کا نام تو اُن کے ماں باپ نے سجاد رکھا تھا مگر اُنہوں نے ساتھ باجی تخلص کا اضافہ کرلیا لیکن یہ نام وہ صرف بچوں اور لڑکیوں کو بتاتے ہیں ورنہ لڑکے تو اُنہیں تومی ڈارلنگ کہتے ہیں۔ ایک دفعہ ہم نے اُنہیں غلطی سے ''سجاد بھائی'' کہہ کر بلایا تو اُنہوں نے ہمارے پیر کو اپنی ہیل والی جوتی سے اس زور سے مسلا کہ ہماری چیخیں نکل گئیں۔ ہمیں زدوکوب کرنے کے بعد زور سے بولیں۔

''خبردار! جو آئندہ بھائی کہا' آپی کہا کرو۔''

مگر ہمیں آپی کچھ سوٹ نہ کیا اس لئے باجی کہنے لگے۔

محلے کے سارے لڑکے سجاد باجی سے ڈرتے ہیں۔ جہاں اُنہیں دیکھا' فوراً نیچے بیٹھ جاتے ہیں لیکن لڑکیاں اُن سے نہیں ڈرتیں۔ اُنہیں اُن کے موجود ہونے سے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ سجاد باجی عام لڑکوں کی طرح گلیوں' بازاروں یا سکولوں اور کالجوں کے اِردگرد نہیں پھرتے البتہ ایشیا جم کے باہر اکثر پائے جاتے ہیں۔ اُنہیں زندگی سے بہت پیار ہے' اِسے ہنس کھیل کر گزارنا چاہتے ہیں اِسی لئے شام کو ڈانس کی کلاسز لیتے ہیں' اس کے علاوہ تھوڑا بہت میک اپ بھی کرلیا کرتے ہیں۔

ایک دفعہ اُنہیں ہیجڑوں کی ایک ٹولی اُٹھا کر لے گئی مگر وہاں جا کر اُن کا مردانہ پن جاگ اُٹھا' دو چار بھڑکیں مار کر بھاگ آئے۔ اس واقعے کے بعد خوف سے اُنہوں نے دو ماہ تک اپنا پھولوں والا سوٹ نہ پہنا--- کبھی کبھی مجھے اُن کی ذات پر بہت رشک آتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر جب لڑکیاں ڈھولک بجا رہی ہوتی ہیں' وہ درمیان میں راجہ اندر بنے بیٹھے ہوتی ہیں اور اِن کی تال سے تال ملاتے ہیں۔

اُنہیں کھانے میں بھی ڈائیٹنگ اشیاء پسند ہیں۔ جیسے تڑکے والی دال' ٹاٹری والے گول گپے' املی اور کچی کیریوں کی چٹنی۔ اُن کی شکل تو عامر خان سے ملتی ہے مگر وہ خود کو مادھوری سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اُنہیں شاہد کپور جیسا کہے تو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں لیکن اگر کوئی کرینہ کپور کہہ دے تو شرم سے لال ٹماٹر ہوجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو دُہرے بلکہ تہرے بھی ہوجاتے ہیں--- محلے میں کسی کی شادی ہو تو اُن کی عید ہو جاتی ہے۔ لڑکیاں ڈانس سیکھنے اُن کے پاس آتی ہیں اور وہ دھائی میں چند روپے بھی دے جاتی ہیں لیکن وہ ڈھٹائی سے اِسے انعام کہتے ہیں۔ اُن کے ابا اُنہیں سلیقہ مند بچی جبکہ اماں شیر بیٹا کہتی ہیں۔ ابا اُس کے لئے کاجل جبکہ اماں سن گلاسز لاتی ہیں۔ اگر محلے کے کسی نوجوان کو کوئی مسئلہ ہو تو اُنہیں جا کر بتاتا ہے اور وہ چٹکیوں میں اس کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔

ایک دفعہ ہمارے پاؤں میں موچ آ گئی۔ اُنہوں نے ہمیں ''نچاں میں اوہدے نال'' پر رقص کروایا۔ قسم خدا کی' ہم بالکل ٹھیک ہوگئے۔ ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکیاں بھی اپنے مسائل اُن کے پاس لے کر آتی ہیں جیسے پنک اور اورنج کلر اس کیسا رہے گا یا دیکھو فیشل ٹھیک ہوا یا پھر کروالوں؟

سجاد باجی آواگون پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ اُن عاشقوں کا آٹھواں جنم ہیں جو سات جنموں میں نہ مل سکے لیکن خدا نے آٹھویں بار ایک ہی جسم دے دیا' ویسے مجھے اُن کی یہ بات تھوڑی تھوڑی سچ لگتی ہے--- کبھی کبھی تھوڑے عجیب عجیب لگتے ہیں۔ ایک بار خرم نے اُن سے کہا۔

''نومی یار! چھٹیوں میں کمپیوٹر سیکھ لیتے ہیں۔''

بولے۔ ''نہیں یار! میں روز بیوٹی پارلر میں داخلہ لے چکا ہوں۔''

ڈانس کرتے کبھی نہیں تھکتے لیکن بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے صرف پانچ منٹ میں تھک جاتے ہیں۔ اُنہیں شادی کا کوئی شوق نہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر میری شادی ہوگئی تو ناچے گا کون؟--- مستقبل میں ''ناچا گجر'' نام رکھنے کا ارادہ ہے۔ کبھی کسی سے نہیں لڑے۔ ہاں، کبھی پورے گروپ کی لڑائی ہو جائے تو ایک علیحدہ جگہ بیٹھ کر زور و شور سے گالیاں بکتے ہیں۔ کوئی اُنہیں ایک آدھ ہاتھ جڑ دے تو کہتے ہیں کہ ''جا تیری بہن کو بھی جوتے پڑیں' پرائی بہن کو مارتا ہے۔''

سجاد باجی کا بچوں کو بھی بہت فائدہ ہے۔ وہ ہم سب کو فری میں ٹافیاں کھلاتے ہیں اور اُن کی نیل پالش کی خالی شیشیاں ہمارے لئے دوات کا کام دیتی ہیں۔ اِس کے علاوہ وہ پنجہ لڑائی میں ہم سے ہار جاتے ہیں۔ وہ فطرتاً بہت وفادار ہیں' کبھی کسی سے بے وفائی نہیں کرتے البتہ چغلیوں والی خالص زنانہ عادت اِن کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ محلے کے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ جس شخص نے سجاد باجی کو گھٹی دی' وہ گھٹی دینے کے سات ماہ بعد اچانک عورت میں تبدیل ہو گیا--- ایک دفعہ لڑکوں کے ساتھ چور سپاہی کھیل رہے تھے کہ اُن کی اماں آگئیں' بولیں۔

''وے' سجاد! کئی وار کیا اے منڈیاں نال نہ کھیڈیا کر۔''

ہم سوچ میں پڑ گئے کہ اگر وہ لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلیں تو کن کے ساتھ کھیلیں؟

سجاد باجی کی چال بہت مستانی ہے۔ دُنیا کی کوئی عورت اُن جیسا نہیں چلتی اور مرد تو چل ہی نہیں سکتا۔ اِس کے علاوہ اُن کے اور بھی بہت سے فنکشن ہیں۔ اُنہیں عورت سے شدید نفرت ہے اور مردوں کو اُن سے--- آج کل اپنی بے کسی و بے بسی کا رونا روتے ہیں اِس لئے اُن کا ارادہ اگلے سال الیکشن لڑنے کا ہے۔ ہم نے پوچھا کس سیٹ سے لڑیں گے تو بولے کہ لیبر کونسلر سے--- ہم نے اُنہیں مشورہ دیا کہ لیبر کی سیٹ سے نہ لڑیں' جنرل تو آپ ہو سکتے ہیں لیکن لیبر نہیں۔ آپ سے ایک پانی سے بھرا جگ تو اُٹھایا نہیں جاتا۔ رعونیت سے بولے۔

''12 گھنٹے کوئی مسلسل ڈانس کر سکتا ہے؟''

ہم بولے۔ ''نہیں---''

تو نہایت عالمانہ طریقے سے فرمانے لگے۔ ''یہ مشقت نہیں تو اور کیا ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''حضور! یہ مشقت ذرا جذباتی قسم کی ہے۔''

کہنے لگے۔ ''اگر ووٹ دینا ہے تو دو۔''

ہم بولے۔ ''ہمارا تو تن من دھن آپ پر واری' بس احتیاط کی ضرورت ہے۔''

الیکشن تو وہ ہار گئے لیکن ہمیں ایک خبر دینے ضرور آئے' کہنے لگے۔

''ہم ''آپ نما'' کے صدر منتخب ہو گئے ہیں۔''

ہم حیرت سے بولے۔ ''اجی' یہ کس بلا کا نام ہے؟''

''آل پاکستان نیم مردانہ ایسوی ایشن'' اُنہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔

''اِس کے اغراض و مقاصد؟'' ہم نے اگلا سوال داغا۔

''یہ ہمیں تحفظ فراہم کرتی ہے۔''

''کس قسم کا تحفظ؟'' ہم چپ نہ رہ سکے۔

کہنے لگے۔ ''ہم مردوں میں جاتے ہیں تو وہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں' عورتیں بھی طنز کے تیرے برساتیں ہیں' اِسی لئے ہم ایک ایسی تنظیم لا رہے ہیں جو صرف ہماری ہو۔''

ہم نے اُنہیں مبارکباد دی اور ساتھ ساتھ ڈھیروں نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

اِسی واقعے کے تھوڑا عرصہ بعد میرے پاس آئے تو نہایت خوش تھے۔ میرے سامنے ایک فارم رکھ کر بولے۔

''اِسے پُر کرو۔''

ہم کہنے لگے۔ ''یہ کون سا فارم ہے؟''

''ممبر شپ کا---'' جواب دیا۔

''کس کی ممبر شپ کا؟'' سوال دوبارہ ہوا۔

''آپ نما کی۔''

''کیا---؟'' ہماری چیخ دور دور تک گونجی۔

''بس حوصلہ ہار گئے---؟'' اُن کی ٹوٹی ہوئی آواز آئی۔ ''تم لوگ صرف تبصرہ کر سکتے ہو لیکن ہمارے احساسات نہیں سمجھ سکتے۔''

ہمیں ایسے جذباتی وار کی توقع نہیں تھی اِس لئے تھوڑا سنبھل کر بولے۔

''ہم آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں اِسی لئے تو آپ کو فنکشن پر بلاتے ہیں۔''

''جھوٹ---وہ سب تم اپنے دِل کی خوشی کے لئے کرتے ہو اِسی لئے تو ہمارے ساتھ ہلہ گلہ کرتے ہو مگر جب ہم اکیلے ہوتے ہیں تو کوئی ہمارے غم میں شریک نہیں ہوتا۔'' اُنہوں نے دُکھ سے کہا۔

''تم لوگ کوئی عزت والا کام کرو۔'' ہم نے گھگھیا کر کہا۔
''عزت والا کام کون کرنے دیتا ہے؟ ایک کمی خدا دیتا ہے' اُسے دو آتشہ معاشرہ بنا دیتا ہے۔ مزاح میں بات کو ڈال کر تم صرف حقیقت سے نگاہ چراتے ہو--- چلو' ہم میں تو کوئی کمی ہوتی ہے اس لئے لڑ نہیں سکتے اور تم لوگ تو پورے مرد ہو' پھر بھی ظلم کے خلاف جہاد نہیں کرتے' کبھی کسی مظلوم کے حق میں آواز نہیں اُٹھاتے' کیسے مرد ہو؟'' وہ اپنی تقریر پوری کر کے چلے گئے۔
اُس ملاقات کے بعد ہم سجاد باجی سے کبھی نہیں ملے' خوامخواہ آئینہ دکھا دیتے ہیں۔

☆☆

زمانہ اقسام

☆ محمد محبوب ملک، اسلام آباد

مَیں تو سمجھا تھا کہ عورت صرف عورت ہوتی ہے لیکن اب پتہ چلا کہ عورت صرف عورت نہیں' بہت کچھ ہوتی ہے۔ جیسے کہ چند عورتیں میرے مشاہدے میں آئیں۔ تو لیجئے' مشاہدہ حاضر ہے۔
جادوگر عورتیں: یہ عورتوں کی نہایت ہی خطرناک قسم ہے۔ اِن کے نینوں میں جادو ہوتا ہے جو ہر عاشق ٹائپ بندے پر فوراً چل جاتا ہے اور پھر چند دنوں بعد اِن کا جادو سر چڑھ کر بولنا شروع کر دیتا ہے۔
راز داں عورتیں: یہ قسم وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔ یہ عورتیں کبھی بھی گھر کی بات باہر نہیں بتاتیں بلکہ ہمسائی کے گھر' اندر بیٹھ کر بتاتی ہیں اور ساتھ ہی راز کو راز میں رکھنے کی تاکید بھی کرتی ہیں۔ نتیجہ کے طور پر تھوڑی دیر بعد ہی سارے محلے کو ہی اِس ''راز'' کا پتہ چل جاتا ہے لیکن سب اپنے اپنے طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ یہ راز صرف اِسے ہی معلوم ہے۔
ایماندار عورتیں: عورتوں کی یہ قسم ہر شہر میں موجود ہے۔ یہ کسی بھی لڑکے کا دِل اپنا موبائل بھر جانے کے بعد ایمانداری سے واپس کر دیتی ہیں لیکن بیلنس اور گفٹس کے متعلق بھول جاتی ہیں۔
شریف عورتیں: جی ہاں' عورتیں شریف بھی ہوتی ہیں لیکن خبردار رہئے کہ اِن کی شرافت صرف والدین کے گھر چار دیواری کے اندر تک ہی محدود ہوتی ہے۔ بقول بدر سعید' اِن کے کرتوت باہر سرِ راہ دیکھ لیں تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔
موبائلی عورتیں: قبائلی عورتیں تو موجود تھیں ہی' موبائلی عورتیں حال ہی میں ایجاد ہوئی ہیں۔ انہیں موبائل استعمال کرنے کی اتنی پختہ عادت ہوتی ہے کہ دروازے پر گھنٹی بھی بجے' یہ موبائل اُٹھا کر کان سے لگا لیتی ہیں یا ٹی وی کا والیم اُونچا کرنا ہو تو موبائل سے ہی ٹرائی کر رہی ہوتی ہیں۔
چالباز عورتیں: یہ عورتیں کیبل کے مشہور چینل ''سٹار پلس'' پر وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اِن کی چالبازی سے ساس' سسر' نند' بھابی' دیور' بھائی' بہن' حتیٰ کہ ماں بھی محفوظ نہیں ہوتی البتہ اِنہیں چالبازی کرتے دیکھ کر ہم بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ قسم ایسی ایسی چال چلتی ہیں کہ ''جی ٹی روڈ پر بریکیں'' لگ جاتی ہیں اور ابرارالحق کو گانا گانے کا سبب مل جاتا ہے۔ دیکھا' عورت کی چال کا کمال!
سیدھی سادی عورتیں: یہ عورتیں اپنے فرینڈز کو مس کالیں دیتی رہتی ہیں اور بدلے میں بیلنس ملتا رہتا ہے۔ یہ اتنی رحم دِل ہوتی ہیں کہ اگر دکاندار والے کو رُقعہ بھی دیں تو وہ بدلے میں اُن کی من چاہی چیز انہیں دے دیتا ہے۔
لڑاکا عورتیں: یہ قسم عام پائی جاتی ہے اور زیادہ تر ساس بہو کے رشتے میں نظر آتی ہیں۔ ''شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔'' یہ جملہ کئی مواقع پہ سنا لیکن یہ آج تک نہیں سنا کہ ساس اور بہو نے ایک ہی پلیٹ میں چھیدا وہ--- سوری' کھانا کھایا ہو۔ جب تک شوہر گھر پہ ہو' یہ سر پر کپڑا باندھے بیڈ پر لیٹی ''ہائے ہائے'' کرتی رہتی ہیں اور جونہی شوہر گھر سے باہر نکلا' یہ بیڈ سے چھلانگ لگاتی ہیں اور پھر میدانِ عمل میں کمر باندھ کر کود پڑتی ہیں۔ اِن کی لڑائی ساس سے شروع ہوتی ہے اور سبزی والے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔

☆☆

اخلاقی صاحب

☆ محمد عباس

ہمارے محلے کی مشہور سماجی شخصیت ہیں۔ اپنے بقول' ذاتی تنظیم دارالاخلاق کے بانی ہیں جو عنقریب پاکستان پہ چھا جائے گی لیکن ابھی اِن کے مرید اور کارکن حضرات یورپی ممالک میں قیام پذیر ہیں۔
اِن کے ساتھ پہلا بالمشافہ تعارف تب ہوا جب مَیں دسویں کلاس کا سٹوڈنٹ تھا۔
اِس دِن ہوا ہوں کہ گیم پیریڈ میں سکول کے سامنے واقع چرچ گراؤنڈ میں بیٹھے تھے کہ اخلاقی صاحب وہاں نازل ہوئے۔ بالشت بھر باسنت داڑھی' تقریباً سفید رنگ' 5 فٹ 8 اِنچ قد' سفید کرتا' سرخ دھوتی'

پاؤں میں قینچی چپل اور سر پہ پگڑی نما کوئی شے۔ آتے ہی با آواز بلند سلام دے مارا اور پھر بن بلائے مہمان کی طرح اپنا تعارف خود کروانے لگے۔

"میں نے پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے لیکن صرف اور صرف جھنگ کی تقدیر سنوارنے کے لئے ہر قسم کی مراعات اور پُر آسائش زندگی چھوڑ کر دارالاخلاق کی بنیاد رکھی۔ میرا ظاہری حلیہ نہیں، باطنی کردار دیکھو جو شاید کسی کا اس جیسا اُجلا نہ ہو--- ابھی میں گورنر پنجاب سے مل کر آرہا ہوں۔ جھنگ کی ترقی کے پیشِ نظر دارالاخلاق کے پانچ نکات پیش کیے جو کہ درج ذیل ہیں۔

1- دریائے چناب پہ چنڈ پل بنوائی جائے (تخمینہ لاگت 1 ارب روپے)

2- گڑھ مہاراجہ پل بنوایا جائے، دریائے چناب اور جہلم ایک ہیں۔

3- ایک ایئرپورٹ ہونا چاہیے۔

4- میڈیکل کالج کا افتتاح کیا جائے۔

5- ایک بین الاقوامی یونیورسٹی جھنگ میں بنوائی جائے۔"

تقریر نما تعارف ختم ہوا ہی تھا کہ گراؤنڈ کا وہ حصہ تالیوں کے شور سے گونج اُٹھا۔ فرمانے لگے۔

"میرے پاس ترپ کا آخری پتا یہ ہے کہ مطالبات نہ مانے گئے تو خود سیاست میں عملی حصہ لوں گا۔"

بقول اخلاقی، گورنر صاحب نے کہا کہ قائداعظمؒ کے پاکستان کو صرف اور صرف آپ جیسے مخلص لوگ ہی بچا سکتے ہیں۔ گروہوں کے مطالبات تو روز سنتے آئے ہیں لیکن اِس فردِ واحد کے مطالبات نے چونکا دیا ہے۔ خود گورنر صاحب باہر تک چھوڑنے آئے، یہ مت سمجھئے گا کہ وہ اس لئے چھوڑنے آئے کہ یہ واپس نہ آجائے بلکہ اُنہوں نے آفر کی تھی کہ سرکاری گاڑی میں بمعہ پروٹوکول جھنگ تک واپس بھیجا جائے مگر "غیرتِ اخلاقی" نے یہ گوارا نہ کیا--- انہوں نے اپنی تنظیم دارالاخلاق کا تعارف کروایا تو مجھے تب پتہ چلا کہ تنظیم کا ہیڈ آفس شاداب کالونی میں ہے۔ مجھے اپنی کم علمی پر افسوس ہوا کہ ہر وقت محلے کی گلیوں میں پھرنے کے باوجود آج تک اتنی "مشہور" اور بین الاقوامی تنظیم کا "ہیڈ کوارٹر" نہ دیکھ پایا۔ محلے کے ہر گھر کے افراد جاننے کے باوجود اتنی عظیم شخصیت کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہ تھیں--- بعد از تقریر اُٹھ کر جانے لگے تو تمام لڑکے اُٹھ کر گراؤنڈ کے گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ سب سے معذرت کر کے مجھے علیحدہ بلایا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا کہ تمام احباب میں سے مجھے فوقیت ملی کہ اتنی "عظیم ہستی" مجھے مشورہ کے لئے علیحدہ بلا رہی ہے۔ بڑے مؤدب ہو کے میں نے کہا۔

"حکم فرمائیں---"

فرمانے لگے۔ "آپ بھی شاداب کالونی میں ہی رہتے ہیں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "گھر تو وہیں ہے مگر آج کل پیپرز کی تیاری کے لئے ہاسٹل میں رہتا ہوں۔"

کہنے لگے۔ "کسی سے سائیکل مانگ کر مجھے وہاں تک چھوڑ آؤ۔"

میں نے کسی سے سائیکل مانگی اور انہیں "ڈراپ" کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ سائیکل چلاتے چلاتے مجھے احساس ہوا کہ اتنی معتبر ہستی کو پیچھے بٹھایا ہوا ہے سو میں نے کہا۔

"محترم اخلاقی صاحب! میرا ضمیر گوارا نہیں کر رہا کہ آپ میری پیٹھ کی طرف بیٹھیں، بہتر ہے کہ سائیکل آپ ہی چلائیں؟"

مگر اجازت اخلاقی کے باعث چار و ناچار سائیکل مجھے ہی چلانا پڑی۔ محلے میں پہنچتے ہی فرمانے لگے کہ آؤ تمہیں ہیڈ آفس آف دارالاخلاق کا معائنہ کرواؤں--- میں زیارت کے شوق میں پرجوش ہو گیا۔ ہیڈ آفس دیکھتے ہی اندازہ ہوا کہ اِن کا خلوص وطن کے لئے 1947ء کے مسلمانوں جیسا تھا، بلڈنگ سے صاف یہی لگ رہا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ ہیڈ آفس صرف بیٹھک ہے، پچھلے حصے میں بمعہ اہل و عیال رہائش پذیر ہیں۔ خیر سطح زمین سے چار فٹ نیچے ہیڈ آفس میں داخل ہوتے ہی ایک بلند آواز اور چیخ سُنی۔ چیخ تو خیر میری اپنی تھی، ہوش میں آیا تو دیکھا کہ اخلاقی صاحب دروازے کا معائنہ کر رہے ہیں کہ میرے سر سے اس کو کوئی نقصان تو نہیں ہوا--- کمرے میں مسجد جیسا مقدس ماحول تھا، یعنی صفیں بچھی تھیں لیکن مسجدوں میں تو پنکھے بھی ہوتے ہیں۔ تکلف سے مبرا اخلاقی صاحب فرمانے لگے۔

"عنقریب اس تنظیم کو سٹوڈنٹس میں پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں تاکہ نوجوان سدھر جائیں اور ایک آئیڈیل ملک کی بنیاد رکھیں کیونکہ سٹوڈنٹ ہی ملک کا مستقبل ہیں۔ تم میں مجھے اچھائی نظر آرہی ہے اِس لئے پاکستان ونگ کا تمہیں صدر بناؤں گا۔"

یہ سننا تھا کہ میں اپنے آپ کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرنے لگا۔ پھر بولے کہ فارم اور جھنڈے لے جاؤ اور سٹوڈنٹس کو عظیم مقصد تنظیم میں کھینچ لاؤ۔ میں ثانی قائداعظم کو عقیدت سے دیکھنے لگا۔ واپس گھر گئے تو میں نے سمجھا کہ خاطر مدارت کے سلسلے میں گئے ہیں۔ عقیدت کے مارے منع بھی نہ کر پایا کہ کچھ کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن وہ بھی نفسیات دان تھے، کچھ نہیں لائے۔ واپس آئے تو فارم کی جگہ خالی

پیپر اور تین عدد جھنڈے تھے۔

دوسرے دِن اخلاقی صاحب خود ہاسٹل گئے۔ اپنے عطا کردہ فارم اور کارکنوں کے بارے میں پوچھا۔ مَیں نے دوسرے دِن کا ٹائم دیا کہ کل تک مکمل کرلوں گا۔ رات کو بیٹھے بٹھائے جو جو نام ذہن میں آئے' لکھ ڈالے۔ اِن میں وہ نام بھی شامل تھے جن کا کبھی ہاسٹل سے واسطہ بھی نہ تھا۔ جب لسٹیں مکمل ہوئیں تو لگ بھگ 200 نام تھے۔

اگلے دِن اخلاقی صاحب سکول آ گئے۔ کلاس میں تھا کہ پیغام ملا کہ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔ باہر نکلا تو چپڑاسی کی بنچ پر پی ایچ ڈی ڈگری ہولڈر اخلاقی صاحب براجمان تھے۔ میرے آتے ہی پوچھنے لگے کہ لسٹیں مکمل ہوئیں ہیں؟ میرے دِل میں اُن کی عقیدت بڑھی کہ اتنا مخلص آدمی ہے کہ تمام مصروفیات چھوڑ کر طالب علموں کی بہتری کے لئے کتنا فکرمند ہے--- مَیں نے لسٹیں اُن کے ہاتھ میں تھما دیں۔ اُلٹ پلٹ کے بغور اُن کا معائنہ کرنے لگے اور ساتھ ہی کہا کہ اب اُن کی تنظیم کے نام پہ چندہ وصول کرو--- خیر ''مشن اخلاقی'' کے لئے یہ کام بھی سرانجام دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ شام تک لگ بھگ بارہ سو روپے اکٹھے ہو چکے تھے۔ جب باقی لڑکوں کو پتا چلا کہ اتنے پیسے میرے پاس ہیں تو بہکانے لگے کہ آؤ کوئی ٹریٹ کریں۔ انکار تو بہت کیا لیکن وہ پندرہ تھے اور مَیں اکیلا تھا' چاروناچار مجھے ماننا پڑا۔ نادان دوستوں کے بہکاوے میں آ کے ہوٹل میں جا کے خوب مزے اُڑائے۔ پتہ نہیں کس طرح اخلاقی صاحب کو اِس رقم کی سن گن ہو گئی۔ اگلے دِن آ کے رقم کا پوچھا تو مَیں نے کہا۔

''کسی نے فنڈ کے لئے رقم دی ہی نہیں۔''

اُن کے پاس بھی کوئی پکی رپورٹ تھی' غصے میں آ گئے اور بولے۔

''میرے بارہ سو روپے مجھے دو۔''

جھگڑے نے طوالت پکڑی تو میرے اُستاد بھی آ گئے۔ اُنہوں نے معاملہ رفع دفع کروایا۔ اب ہمیں بُرا چسکا پڑ گیا۔ جب بھی پیسوں کی ضرورت محسوس ہوتی' اخلاقی صاحب کے عطا کردہ جھنڈے لے کر کلاسوں میں گھس جاتے اور فنڈ اکٹھا کر کے ٹریٹ کرتے۔ کسی چغل خور نے اِس کی اطلاع اخلاقی صاحب کو پہنچا دی۔ دوسرے دِن وہ نوٹس کے ساتھ سکول آ گئے اور کہا کہ میرے نام سے چندہ اکٹھا ہو رہا ہے اور مجھے وہ وصول نہیں ہو رہا۔ چونکہ میرا نام بدنام ہو رہا ہے اِسی لئے مَیں عدالت سے نوٹس لایا ہوں کہ مجھے دس لاکھ ادا کیے جائیں--- پھر ڈسکاؤنٹ کر کے خود ہی دو ہزار کا مطالبہ کیا۔ مَیں نے کون سا ادا کرنا تھا' پرنسپل صاحب موقع پر آئے اور معاملہ بڑی مشکل سے ختم کروایا اور سکول میں اعلان کروایا کہ آج کے بعد کوئی کسی نام پہ کوئی رقم ادا نہ کرے لیکن اِس کے بعد جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا' وہ بتانے کے قابل نہیں۔

اب جب بھی ملاقات ہوتی تو ہم سلام کرتے ہیں لیکن اخلاقی صاحب جواب دینا تو درکنار' ہماری طرف منہ کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

کاش، میں وِلن ہوتا

سید بدر سعید

بچپن سے ہی مجھے ''ہیرو'' کو دیکھنے کا بہت شوق تھا کیونکہ جب سے الفاظ کا مطلب سمجھنے لگا تھا' دِن میں تقریباً ڈیڑھ دو سو دفعہ اِسی لفظ ''ہیرو'' کی گردان سننے کو ملی۔ کبھی ماں صدقے واری جاتی اور نظر اُتارتے ہوئے کہتی کہ ''میرا بیٹا تو ہیرو ہے ہیرو''--- کبھی باپ کہتا کہ ''میرا بیٹا شیر ہے شیر' پورا ہیرو لگتا ہے''--- خالہ کو مجھ میں ہیرو کی جھلک نظر آتی اور پھوپھو بھی مجھ میں ہیرو تلاش کرتی پھرتیں--- کچھ بڑا ہوا تو سکول کی اُستانیوں کو بھی مجھے دیکھ کر ہیرو کی یاد آ جاتی۔ کلاس میں پہلی پوزیشن لی تو سکول کے لڑکوں کا ''ہیرو'' کہلایا' تقریری مقابلے میں فسٹ آیا تو پرنسپل نے بھی ہیرو کا خطاب دیا--- تھوڑا اور بڑا ہوا تو گلی میں کھیلتے ہوئے پہلی باری نہ ملنے پر مخالف ٹیم کے کپتان کا سر پھاڑ کر اپنی ٹیم کا ''ہیرو'' بنا مگر ابھی تک مجھے ''ہیرو'' دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ پھر اچانک ایک دِن مَیں نے وی سی آر پر ''ہیرو'' دیکھا مگر سمجھ نہ آیا کہ اِس میں ایسی کیا بات ہے کہ ہر طرف اِسی کا چرچا ہے اور اِسے ہیرو کیوں کہتے ہیں؟--- ہیرو کی دریافت کے چکر میں' مَیں مزید بڑا ہوتا چلا گیا۔ ہائی سکول میں داخلہ ملا تو خود کو واقعی ہیرو سمجھنے لگا مگر ابھی تک ہیرو کی اصل کوالٹی کا نہ پتا تھا۔ کالج میں داخلہ ملنے تک مَیں نے بے شمار فلمیں دیکھیں۔ جب کالج میں داخل ہوا تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ہیرو کی اصل تعریف کیا ہے۔ چنانچہ کالج میں' مَیں ہیرو بن کر رہنے لگا۔ لمبی لمبی زلفیں' گھسی ہوئی جینز' آنکھوں پر کالا چشمہ' گلے میں چین اور چہرے پر مختلف کریمیں لگا کر سگریٹ کے کش لگانا' میری عادت بن گئی کیونکہ ''ہیرو'' بننے کے لئے یہ سب بے حد ضروری تھا۔

یونیورسٹی میں گیا تو احساس ہوا کہ ہیرو بننے کے لئے ایک عدد ہیروئن بھی بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ایک عدد ہیروئن بھی دریافت کر لی تاکہ زندگی کی فلم میں مکمل ''ہیرو'' بن سکوں۔ ہیروئن ملتے ہی خدا نے دو چار وِلن بھی عنایت کر دیئے کیونکہ اِس طرف تو میرا دھیان ہی نہ گیا تھا۔ وِلن اور اُس کے دوستوں کی تعداد دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ ''اوپر والا جب

تین بندوں کی جتنی مرضی بے عزتی کرلو، کبھی نہیں ہوتی۔ بیمہ ایجنٹ، صحافی، عاشق ☺ خادم حسین مجاہد

بھی دیتا ہے، چھپر پھاڑ کر دیتا ہے"---یونیورسٹی کے باقی سال فلم کی سٹوری مکمل کرنے میں لگے۔ کبھی ہیروئن کو تحفے تحائف لے کر دیئے تو کبھی اُسے وِلن سے دور رکھنے کی تگ و دو میں رہنے لگا۔ فلمیں دیکھ کر اتنا تجربہ تو ہو چکا تھا کہ ساری فلم میں ہیروئن وِلن کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر وِلن سے نفرت بھی کرے تب بھی وِلن اِسے بار بار اُٹھا کر لے جاتا ہے اس لئے یونیورسٹی کا سارا عرصہ وِلن کے دوستوں سے لڑنے اور وِلن کا اصل چہرہ بے نقاب کرنے میں گزر گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ آخر میں مَیں ہی ہیرو کہلاؤں گا اور ہوا بھی یہی۔ میری کوششیں کامیاب ہوئیں، ہیروئن نے وِلن کو چھوڑ دیا، وِلن ناکام ٹھہرا اور مَیں ہیرو بن گیا۔

جس طرح فلم کے آخر میں ہوتا ہے، اِسی طرح میرے ساتھ ہوا۔ ہیروئن نے مجھے، یعنی اپنے ہیرو کو گلے لگالیا، ظالم سماج سے لڑ کر اور اپنوں کی مخالفت مول لے کر مَیں نے ہیروئن سے شادی کرلی اور مَیں ہواؤں میں اُڑنے لگا کیونکہ اِس بار بھی مَیں ہی ہیرو کہلایا مگر اتنے عرصے بعد آج صبح بیگم کے لئے ناشتہ بناتے وقت نہ جانے کیوں میرے دِل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! مَیں وِلن ہوتا!

☆☆

ہوم سوئیٹ ہوم

حکیم عنایت اللہ شاہد، حافظ آباد

گھر کہنے اور لکھنے کو ایک معمولی لفظ ہے مگر گھریلو خاتون کے لئے یہ ایک مکمل کارخانہ ہوتا ہے۔ جس کی دِن رات ڈینٹنگ پینٹنگ کرتی رہتی ہیں۔ دوشیزاؤں کے لئے گھر ایک قید خانہ، نوجوانوں کے لئے آفس روم جس میں خاصی شام یا رات کو وہ اپنے سے بڑوں اور چھوٹوں کی کلاس لیتے رہتے ہیں۔ خاوند کے لئے گھر ایک مکمل جدید فائیو اسٹار ریسٹورنٹ ہوتا ہے جہاں سے اِسے دو تین وقت کا تازہ بہ تازہ کھانا اور دیگر سہولیات معمولی خرچہ دینے پر بھی میسر رہتی ہیں اور ہمسایوں کے لئے گھر ایک لنگر خانہ ہوتا ہے جو اپنے گھر میں نہیں پکتا، وہ ہمسائے سے مفت مل جاتا ہے، بس چند گھروں کی خفیہ باتیں مہیا کرنی پڑتی ہیں۔

ہمارا "چاند" خود ایک مکمل گھرانے پر مشتمل ہے۔ سنتے آئے ہیں کہ عورتوں کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا مگر یہاں تو سربراہ "پیر جنگلی" کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا---یہاں تمام چکور اور چکورنیاں آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں کیونکہ سنا ہے کہ جس گھر میں لڑائی جھگڑا نہ ہو، وہاں مزا ہی نہیں آتا۔ کئی دفعہ نازیہ ناز نازی تمام چکوروں اور چکورنیوں کو ایک بڑی سی کڑاہی میں ڈال کر نیچے اپنی تحریروں پر مشتمل دس پندرہ کلوردی رکھ کر ماچس ڈھونڈنے خالد بن حامد کے پاس پہنچ جاتی ہیں مگر وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ "ماچس کا اِس سال کا سٹاک بھی ختم ہو چکا ہے، نیا سال جون، جولائی سے شروع ہوگا تو کچھ سوچیں گے"---پھر وہ جنگل کی طرف نکل پڑی ہیں کہ پیر جنگلی نہ سہی، کچھ جانوروں سے تو آگ اُدھار لے آئیں گی مگر پانچ چھ جنگل کے جانور خود سوکھی لکڑیاں اکٹھی کر کے پتھروں کو آپس میں رگڑ کر آگ لگانے کی کوششوں میں نظر آئے، تھک ہار کر گھر واپس آگئی ہیں تو لوڈشیڈنگ کی وجہ سے گیس کا چولہا بھی نہیں جل سکتا---کبھی کبھار نازیہ ناز نازی کی حمایت میں کوئی ایک آدھ چکور میدان میں نکل پڑتا ہے مگر دوسرے ہی شمارے سے غائب ہو جاتا ہے۔

ویسے حقیقتاً گھر دلوں کی محبت سے ہی بستے ہیں جس طرح فلم انڈسٹری میں بشریٰ انصاری، مصطفےٰ قریشی اور دوسرے اداکاروں میں ذات پات کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اِسی طرح چاند کے چکوروں اور چکورنیاں چاہے کسی بھی شہر سے تعلق رکھتے ہوں، یہاں سب ایک ہیں۔ ویسے بھی پچاس دوستوں میں دو دُشمن نہ ہوں تو دوست کی پہچان مشکل وقت میں کیسے ہو مگر میرا تو ایمان ہے کہ جو بھی چکور یا چکورنی کسی کی دُشمن ہے تو اوپر اوپر سے ہی ہے، دِل میں محبت اور چاہت کا جذبہ ضرور موجود ہوتا ہے۔ اگر آپ اِس بات پر اتفاق نہیں کرتے تو نازیہ ناز نازی کا دِل کھول کر دیکھ لیں۔

☆☆

ٹارزن کی شوخیاں

✿ ایسے لڑکوں کی کمی نہیں جو بازار میں صرف لڑکیوں کے دیدار کی خاطر گھومتے ہیں---نایاب رضوی
☆ "دیدار" کروانے والیوں کو چاہئے کہ نقاب اوڑھ کر نکلیں۔
✿ اب تو مردوں میں شرم آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں رہی---مس حنا
☆ اور عورتوں کے تن پہ لباس آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔
✿ آج ہر لڑکی کا روگ اِس کا خوبصورت ہونا ہے---نایاب رضوی
☆ حیرت تو مجھے یہ ہے کہ پھر بھی ہر لڑکی اِس روگ (بیوٹی پارلر) کو گلے کیوں لگاتی ہے؟
✿ یہ صرف عورت ہی جانتی ہے کہ شوہر کا دِل جیتنے کے لئے اِسے کتنی قربانیاں دینی پڑتی ہیں---نایاب رضوی
☆ یعنی صرف اِک مسکراہٹ---!
✿ کوئی لڑکی نہیں جانتی کہ اِک لڑکے کے سینے میں کتنے دِل ہوتے ہیں---نایاب رضوی
☆ ہوتا تو ایک ہی ہے البتہ اِس سے کھیلنے والیاں بہت ہوتی ہیں۔

ٹارزن 421

سندیسے

''چاند'' کے شوخ وشریر ساتھیوں کی آپس میں ہنستی مسکراتی سرگوشیوں کے علاوہ چھیڑ خانی والی ''تو تو' میں میں'' کے لئے یہ کالم مخصوص ہے۔ آپ بھی کسی کے نام اپنے دِل کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں تو ہم بلامعاوضہ آپ کا یہ پیغام پہنچادیں گے لیکن ذرا حدادب کا خیال رہے اور طوالت کا بھی۔۔۔سندیسے اِس پتہ پر ارسال فرمائیے۔

انچارج سندیسے تیس روزہ ''چاند'' 31-F 'شمع پلازہ' فیروز پور روڈ' لاہور 54600

شاہ جی! اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی آنکھیں روشن ہوئیں جس کے ساتھ ہی تین ماہ بعد ''چاند'' بھی اپنی تابناکیاں بکھیرنے لگا۔ میں گزشتہ ایک ماہ سے شدید علیل اور صاحب فراش ہوں۔ میرے منہ کے سرطان کا آپریشن ہوا ہے۔ اب بولنا اور لکھنا پڑھنا دونوں ہی دشوار ترین امور ہیں۔ چکوروں سے درخواست ہے کہ وہ میری شفایابی کے لئے دعا فرمائیں۔ جن دوستوں اور بہی خواہوں نے میری والدہ ماجدہ کی رحلت پر مجھ سے اظہار تعزیت کیا، میں ان سب کا ممنون ہوں۔ میں ابھی کم وبیش مزید ایک ماہ تک بات کرنے یا زیادہ لکھنے کے قابل نہیں۔ انشاء اللہ، شفایاب ہو کر ایک بار پھر ''چاند'' کا قلمی خدمت گار بن جاؤں گا۔

✿ پروفیسر محمد ظریف خان، کراچی
موبائل نمبر: 0321-2125603

☆☆

میرے سب پیارے پیارے دوستوں کو سلام! مسٹر ڈبکلاں جی! آپ کے کیا حال ہیں اور آج کل کیا کررہے ہیں؟ آپ جب بھی ایم حنیف گجر کے پاس جاتے ہیں، ہمیں پتہ ہے کہ وہ آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اب آپ پوچھیں کے کہ ہمیں کیسے پتہ؟ تو میں آپ کو بتا ہی دیتا ہوں کہ آپ جب بھی گجر صاحب کے پاس جاتے ہیں تو گجر صاحب کے طرح طرح کے SMS آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سر میں درد آگیا، تنگ کرنے آگیا''۔۔۔مائی کا لعل، عرف محمد عرفان! آپ نے ہمیں سندیسے میں یاد کیا، بہت شکریہ۔ اللہ کا شکر، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سے موبائل پر بات کی، بہت اچھا لگا۔۔۔وسیم شہزاد صاحب! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میری اللہ سے دُعا ہے کہ اللہ آپ کو شفاء عطا فرمائے اور آپ کو اپنے امان میں رکھے۔۔۔ٹارزن 421! کہاں گم ہو؟ آؤ کبھی ہمارے شہر، ہزانہ آیا تو پھر کہنا۔

✿ ثاقب ساحل صدیقی، کوٹ چھٹہ
موبائل نمبر: 0313-6678000

☆☆

چاند کے تمام لکھاریوں اور قارئین کو سلام! چاند میں میری پہلی انٹری ہے۔ چاند میگزین سے میرا تعارف ثاقب ساحل صدیقی کی وجہ سے ہوا۔ ساحل میرا ایک بہت اچھا دوست ہے۔ ساحل صدیقی جب بھی چاند لاتا تھا، میں پڑھتا ضرور تھا پر چاند میں لکھ پہلی بار رہا ہوں۔ چاند ایک چٹخارے دار میگزین ہے۔ چاند میں مجھے لکھاریوں کی نوک جھوک بہت پیاری لگتی ہے۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ لانا بہت بڑی نیکی ہے اور چاند میگزین اداس چہروں پر مسکراہٹ لاکر بہت بڑی نیکی کمارہا ہے۔۔۔سر خالد بن حامد صاحب کو اللہ ہمیشہ خوش رکھے۔۔۔ابھی صرف میں نے اپنا تعارف کرایا ہے۔ انشاء اللہ، اگلے سندیسہ میں بہت باتیں ہوں گی۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ان دونوں جرائد سے وابستہ لکھاریوں اور قارئین کو ہر دکھ مصیبت، تکلیف اور غم سے محفوظ رکھے، آمین!۔۔۔مسٹر ڈبکلاں جی، پروفیسر محمد ظریف خان، ایم حنیف گجر صاحب! آپ کو بہت سلام!

✿ محمد ایوب گاڈر، کوٹ چھٹہ
موبائل نمبر: 0334-6704921

☆☆

ماہنامہ ''چاند'' سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات و خواتین کو سیّد ابرار الحسن گیلانی کا محبتوں، چاہتوں، عنایتوں، رفاقتوں بھرا اسلام! طویل عرصے کے بعد ''چاند'' کو ہاتھ میں پکڑا، چودھویں رات کی طرح خوبصورت روشنیاں بکھیرتا نظر آیا تو قلم اٹھائے بنا رہ نہ سکا۔۔۔جناب خالد بن حامد صاحب! اسلام قبول فرمائیں۔۔۔جناب حنیف گجر صاحب! کس مقام پر بندہ ناچیز سے غلطی ہوئی، کچھ یاد نہیں؟۔۔۔ یہی شکوہ وسوال ممتاز بخاری سے ہوا۔۔۔مسٹر ڈبکلاں! آپ کا سندیسہ پڑھا، دلی دکھ ہوا۔۔۔ٹارزن 421، ثاقب ساحل صدیقی! آپ کو بھی بہت بہت سلام ہو۔۔۔شعبان گیلانی، محمود گیلانی، ستیانہ گیلانی کو بہت بہت سلام۔۔۔ نازیہ ناز نازی، اکبر بخاری اور عاکف کو سلام۔۔۔آخر میں تمام دوستوں کو سلام ودعا!

✿ سیّد ابرار الحسن گیلانی، اسلام آباد
موبائل نمبر: 0306-5042603

☆☆

چاند کے بھی قارئین کرام کو چاند کے نئے چکور کی طرف سے عقیدت بھرا اسلام اور لاتعداد نیک دعائیں۔ سب سے پہلے انکل خالد بن حامد صاحب اور عصمت ضیاء آپی کی خدمت میں ایک مرتبہ پھر ڈھیروں دعائیں اور خلوص دل سے سلام! اب آتا ہوں اپنے خط کی طرف۔ یہ میرا کسی بھی ماہنامہ میں پہلا خط ہے۔ میں نے یوں تو لاتعداد ادبی وغیر نصابی رسائل وجرائد پڑھے ہیں مگر حسن اتفاق دیکھئے کہ چاند جیسا دلفریب سدا بہار وشاندار رسالہ میں نے آج تک نہیں پڑھا چونکہ ہمارے شہر میں چاند کا کوئی ڈسٹری بیوٹر ہے ہی نہیں۔ یہ بھی آپ کو بتانا لازم سمجھتا ہوں کہ چاند کس طرح میرے ہاتھ لگا۔ میں ۲۵ نومبر ۲۰۰۹ء کو کراچی جارہا تھا تو فیصل آباد ریلوے اسٹیشن پر بک سٹال پر دیگر رسائل میں اکتوبر ۲۰۰۹ء کا ''چاند'' بھی قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے یونہی وقت گزاری کے لئے جلدی سے چاند خرید لیا (کیونکہ ٹرین فوراً چل پڑی تھی) آدھے راستے تو میں نے پڑھا بھی نہیں رات ۱۲ بجے جب میں نے بوریت سے اکتا کر سونے کی کوشش کی تو نیند بھی ناراض۔ پھر اچانک چاند کی طرف نگاہ وخیال گیا تو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ یقین کیجئے کہ کراچی کینٹ آنے تک مجھے نہ تو راستہ کٹنے کا پتہ چلا' نہ ہی ادھر ادھر کا۔ چاند کے علاوہ کسی کا خیال نہ رہا۔ یوں میں نے نیت کرلی چاند کو ہمیشہ پڑھنے کی مگر جناب قبل احترام خالد بن حامد صاحب! میں نے آپ کو پہلی بھی ابتدائی سطور میں بتایا کہ میرے سوہنے شہر میں چاند نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی دوکان یا ڈسٹری بیوٹر ہے کہ جس سے ہر ماہ چاند خرید سکوں۔ اگر آپ کا (میرا مطلب ہے کہ چاند کا) سالانہ زرخرید ممبر بننا چاہوں (کیونکہ جب تک سانس ہے انشاء اللہ' چاند سے وابستگی رہے گی) تو اس کے لئے کیا کرنا ہوگا؟ برائے مہربانی مجھے اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر راہنمائی ضرور فراہم کیجئے گا۔۔۔اب آتا ہوں محترم ومکرم قارئین چاند کی طرف۔ سب سے پہلے تو آپ تمام قارئین کرام عزت' خلوص' احترام اور محبت سے میرے استقبال کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ (ارے' ابھی سے نہیں) کیونکہ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ سلطنت فرنیچرز چاند کی سلطنت پر اپنے پرائیویٹ راکٹ کی بجائے امریکہ سے ادھار مانگ کر لائے گئے راکٹ سے لینڈ کر چکا

ہے---صابر مغل صاحب! شغل مغل میں کیا ہم جیسے ''شان وشوکت'' والے شہنشاہ کو بھی آنے کی اجازت ہے یا؟--- ویسے گیلانی فیملی ہر طرف ہی چھائی ہوئی ہے۔ عزت سے چاند کی وزارتوں سے استعفیٰ دے دو اور غریب عوام کو (میرے جیسے) آگے اگر چاند میں پلاٹ خریدنے دو--- نازیہ ناز نازی (3N)! آپ کے کاٹ دار جملے وہ بھی معصوم لڑکوں اور مردوں کے خلاف مجھے پسند نہیں ہیں۔ میں آپ کو مردوں اور لڑکوں (مجھ جیسوں) کے خلاف زبان بندی کا حکم صادر فرماتا ہوں۔ (پلیز! 3N میری ''عزت'' کی ''لاج'' رکھ لینا--- چاند کے قابل فخر چکورو! اب آپ کو کس آفت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں' کیوں کہ میں آ گیا ہوں اور جہاں میں ہوتا ہوں' وہاں آفت یوں غائب ہوتی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ--- میں انشاء اللہ چاند سے وابستگی رکھوں گا' ہو سکا تو کچھ نہ کچھ تجاویز بھی بھیجتا رہوں گا۔

✿ چوہدری امن قیصر' چنیوٹ

☆

چاند کے دوستوں کو میرا اسلام اور اہل چاند کے ساتھ ساتھ پورے پاکستان کو دل کی گہرائیوں سے عید مبارک--- اس ماہ جب میرے گھر چاند کی تشریف آوری ہوئی تو میں نے چاند سے پوچھا' کیوں بھئی اتنی دیر کہاں لگائی؟ اس محترم ہستی نے جواب دیا۔ راستے میں آتے ہوئے میرا--- اوہ' سوری مطلب میری موٹر سائیکل کا پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ کہیں سے بھی نہیں ملا۔ جیسے آج کل بجلی' گیس نہیں ملتی اور اگر ملتی ہی ہے تو مشکل سے' بس میں یہی سوچتے سوچتے پیدل چل کر آیا ہوں آپ کے پاس۔ جو سزا آپ دو گے میں قبول کر لوں گا۔ میں نے کہا' نہیں یار! کوئی بات نہیں۔ آپ آ گئے' یہی بہت ہے--- اب آتے ہی چاند کی اسٹوریز کی طرف۔ ہنس بیتیاں اچھی لگیں۔ ظفر ندیم دہرہ اور ایم خالد کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ چاند نگر کی تحریروں نے مزہ دیا۔ کے ایم بھائی! آپ نے تو ایسے کردار کا انتخاب کیا ہے جو خود بھی ہنسی کا ہی گول گپا ہے اور سونے پہ سہاگہ آپ کے قلم سے نکلنے والے تند و تیز الفاظ چھوٹے چھوٹے لطائف کا اندراج اور آپ کا انداز تحریر سب مل کر ایک ایسے مضمون کو جنم دیتے ہیں جس کی صرف مثال دی جا سکتی ہے جیسے چاند ایک ہے' دوسرا اپنانا ناممکن ہے۔ آپ کی قلم سوائے ہمیشہ لاجواب ہوتی ہے--- این۔ فیضان! آپ کا بازو اب کیسا ہے؟ اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ آمین--- فیروز نے مجھے ایس ایم ایس کر کے بتایا تھا کہ میں چھٹیوں میں لاہور آ رہا ہوں اور آپ سے بھی ملنے آؤں گا' انشاء اللہ--- مجاہد رؤف صاحب! آپ نے جو مجھ سے سندیسہ لکھنے کے لئے پوچھا تھا' اس کا بہت بہت شکرگزار ہوں۔ آپ جیسے دوست کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں--- فراز اینڈ سلیم بھائی! آپ کو میں اکثر ایس ایم ایس کرتا رہتا ہوں مگر آپ شاید اس دوست کو بھول گئے ہیں۔ میں نہیں بھولا آپکو اور جب آپ مجھے ایس ایم ایس نہیں کرتے تو میں یہ سوچتا ہوں کہ میرا کسی کے نصیب میں چاہت کہاں ہے' مجھ جیسے دوست پیدا ہی ہوتے ہیں فقط تنہائیوں کے لئے--- فیصل کامران! آپ کے والد صاحب کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے' آمین--- میرے کزن کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا' ان کی مغفرت کے لئے دعا کیجئے گا--- ابرار بھائی! آپ چاند میں کم کم نظر آ رہے ہیں' جلدی سے ایک اچھی سی کہانی کے ساتھ آپ چاند میں آئیں' نا--- مس ج! آپ کہاں ہیں' کیا ہم چکوروں سے ڈر کر چپ ہو گئی ہیں؟--- این 3 صاحبہ! آپ کبھی کبھی اپنے اس بھائی کا حال چال پوچھ لیا کریں ایس ایم ایس کے ذریعے اور آپ خیریت سے تو ہیں' نا؟--- آپ سب دوست مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

✿ علوی حسین' لاہور

☆

حاضر خدمت ہیں ساتھو! کچھ مصروفیات کی وجہ سے سندیسے میں حاضری نہ دے سکے البتہ چاند کا مطالعہ ہر ماہ باقاعدگی سے ہم کرتے رہے ہیں۔ جب ہم نے دیکھا کہ آپ احباب گلہ پھاڑ پھاڑ کر ہمیں آوازیں دے رہے ہو تو سوچا کہ آپ سے دو دو ہاتھ کر لوں۔ آپ ہماری غیر حاضری سے پریشان نہ ہوا کریں' ہم خوشبو کی طرح ہر ماہ چاند میں ہوتے ہیں جسے محسوس کیا جا سکتا ہے مگر دیکھا نہیں جا سکتا۔ اک اور بات بھی ہم نے نوٹ کی ہے کہ کاکے ہماری غیر موجودگی میں بہت ہی زیادہ منہ زور ہو گئے ہیں مگر کاکیو! فکر کی ضرورت نہیں' اب ہم نے حاضری پکی لگوانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ دیکھنا' اب ہمارا نام دیکھتے ہی کاکوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور کہیں کاکے تو چاند سے بھاگنے لگیں گے لیکن کسی کاکے کو راہ فرار حاصل نہیں کرنے دی جائے گی' سب کا پورا پورا حساب ہو گا--- شوکت علی مظفر! کس مائی کے لال کی جرات ہے کہ ہمیں کچھ کہے۔ چاند کی رونق ہی تو ہمارے دم سے ہے۔ ویسے اب ہم غیر حاضر نہیں ہوں گے--- خادم حسین مجاہد! آپ لڑکیوں سے بھی زیادہ باتونی ہو۔ کمال ہے' کاکیوں کو تو ایسے ہی آپ لوگوں نے باتونی قرار دے رکھا ہے' یہ بات آپ کے خاکے سے ہمیں معلوم ہوئی ہو یسے محمد صابر مغل عبدو پوری ''خاکوں'' میں کاکوں کے ایسے ایسے رازوں سے پردہ اٹھا رہے ہیں کہ پڑھ کر سواد آ جاتا ہے۔ یہی کام ہم سرخیوں میں کرتے ہیں۔ اب میری اس بات سے کاکے یہ مت سمجھیں کہ ہم کسی بھی کاکے کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں بلکہ ہم تو دشمن کو بھی اس کی اعلیٰ کارگردگی پر مبارک دیتے ہیں جو کہ ہمارے اعلیٰ ظرف کی نشانی ہے--- محمد عادل گلزار! ہم نے تو کوئی بھی ایسی بات نہیں دیکھی جس میں آپ نے ادب کی ''خدمت'' کی ہو--- محمد شعیب صابر مغل! ہم نے چاند سے ریٹائرڈمنٹ کیوں لینی ہے؟ پتہ نہیں ہماری غیر موجودگی میں کاکے کیسے کیسے خواب دیکھتے ہیں مگر ہم آپ کے سینوں پر مونگ کے علاوہ بھی کہیں دالیں دلنے کے لئے حاضر ہیں--- مس ایم! ویلکم ان چاند۔ اب تم بھی ہمارے ساتھ مل کر کاکوں کا خانہ خراب کرنا شروع کر دو--- علینہ علی! اگست میں ہماری سالگرہ ہے۔ ہم سے ملنے کا پورگرام بنالو' مزا آئے گا۔ آپ کے ساتھ ملاقات بھی ہو جائے گی--- محمد محبوب (پتہ نہیں کس کے)! ہم خیریت سے ہیں اور حاضر ہیں۔ اب کاکے خیریت سے نہیں رہیں گے--- ثاقب ساحل! آپ کو نازیہ ناز نازی کیسے نظر آئے؟ آپ نے نظر والی عینک جو نہیں لگائی ہوئی--- ایس ایچ ساگر! ہم کوئی بجلی تو نہیں جو گم رہیں؟ ہم حاضر ہیں اور کاکوں کی مت مارنے کے لئے بے چین ہیں--- مبشر حسین شاہ! مصروفیت آڑے آ گئی تھی۔ اب سندیسے میں حاضر پکی ہو گی اور سرخیوں کے خونی وار سے بھی کاکوں کو نگاہ عبرت بنایا جائے گا--- محمود گیلانی! دیکھتے ہیں کون بھاگتا ہے۔ کاکوں کے بڑے بڑے پھنے خان ہمارا نام سنتے ہی ایسے گھبرا جاتے ہیں جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو یا پھر بجٹ سن لیا ہو۔ ہم آپ کی دھمکیوں سے مرغوب ہونے والوں میں سے نہیں' تاریخ گواہ ہے نازیہ ناز نازی نے ہمیشہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ہے--- عدنان جاذب! ہم کاکوں کے کان کھینچنے کے لئے حاضر ہیں۔ اب کاکوں کی ساری خوش فہمیاں رفو چکر ہو جائیں گی--- محمد فیضان! ہم نے غائب کیوں ہونا ہے' ہم نازیہ ہیں' چینی نہیں جو غائب ہو جائیں۔ ہم اب آئے ہیں تو کاکوں کو وخت پا دیں گے' جی--- محمد منور شاہین! ہم یہاں ہی ہیں' ہم نے خود کچھ عرصہ کاکوں کو ڈھیل دی تھی۔ بے چارے ہم سے ڈر کر ڈیپریشن کے مریض بن رہے تھے' ہم نے سوچا کچھ دن خوش ہو لیں--- مائی کا لعل! ہم سے مقابلہ کاکوں کے بس کی بات نہیں۔ ہم نے سوچا کچھ دن خوش ہو لیں--- ساحل ہو تو ساحل ہی رہو ورنہ ریگستان بن جاؤ گے--- کاکو! تم نے بہت دن عیش کر لئے۔ اب ہم آ گے ہیں تو آپ کو پتہ ہے کہ اب آپ کی ایک نہیں چلنے والی۔ اب ہم چاند پر کاکیوں کی حکومت قائم کر دیں گے' شرافت اسی میں ہے کہ کسی کونے کھدرے میں چپ کی رضائی اوڑھ کر دبک جاؤ۔

✿ کاکوں کی مت مارنے والی' نازیہ ناز نازی'

میر پور